DUE DATE

Late Fine Ordinary books **25 p.** per day, Text Book **Re. 1/-** per day, Over night book **Re. 1/-** per day.

باسمہٖ سبحانہٗ

سیاسیات

از

محمد اجمل خان۔ بی۔ اے۔ (علیگ)

مصنفِ مقدمۂ فلسفہ۔ ارسطاطالیس وغیرہ

۱۹۲۴ء

تانی دواخانہ پریس الہ آباد مین باہتمام منشی حامد حسین صاحب چھپا

اور

محمد اجمل خانصاحب نے چھپوا کر شائع کیا

التماس

یہ کتاب سلسلۂ علوم
وفنون کا پہلا نمبر ہے - مؤلف ہذا کی دوسری کتابیں
جنمیں فلسفہ کی مکمل تاریخ ہوگی انشاء اللہ چند جلدوں میں آیندہ شائع ہونگی - انمیں سے
دو کتابیں یعنی "مقدمۂ فلسفہ" اور "ارسطاطالیس" زیر طبع ہیں اسکے علاوہ دوسری
علمی و ادبی کتابوں کی ترقی کی کوشش کیجا رہی ہے - چونکہ مصنفین ومترجمین بجائے
انفرادی کوششوں کے ایک دوسرے کے مشورہ اور رائے سے زیادہ فایدہ
اٹھا سکتے ہیں اور انکی ذاتی قابلیت اس "حلقہ مصنفین" سے ملکر کام کرنے میں
علم وادب کے لئے زیادہ کارآمد ہوسکتی ہے - اس لئے امید ہے کہ صاحبان
ذوق ذیل کے پتے سے مفصل معلومات کے لئے خط وکتابت فرمائیں گے -

ناظم قومی دارالاشاعت سرائے گڈھا
الہ آباد

اس کتاب کو مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرمائیے -

ناظم - قومی دارالاشاعت - سرائے گڈھا - الہ آباد - قیمت فی جلد عہ

(بلا اجازت مؤلف کوئی صاحب قصد طبع نہ فرمائیں -)

(۶۸۶)

دیباچہ

الحمد للہ کہ ملک میں روز بروز علمی و ادبی کتابوں کی طرف رغبت اور محض افسانوں اور بے سود مضامین سے نفرت شروع ہو گئی ہے۔ ملک و ملت کو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد اور جامعۂ ملیہ علیگڈھ کا ممنون ہونا چاہئے۔ کہ ان دونوں یونیورسٹیوں نے حقیقی معنوں میں علم و فن کی ترویج کا بہترین طریقہ اختیار کیا ہے یعنی ہندوستانیوں کو انکی مادری زبان میں تعلیم دینے کی کوشش مسعود شروع کر دی ہے۔

ہندوستان میں گو سیاسی دلچسپی حیرت انگیز ترقی پر ہے لیکن علمی اعتبار سے سیاسیات پر ہماری زبان میں موجودہ زمانہ کے لحاظ سے کوئی علمی تصنیف تالیف یا ترجمہ نہ پاکر اور زیادہ تعجب ہوتا ہے۔ مختلف اخبار اور رسالے اگرچہ سیاسی مباحث کو روزانہ ملک کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں لیکن سیاسیات پر بحیثیت علم کے کوئی جامع کتاب موجود نہیں ہے۔ اس امر کا لحاظ کر کے یہ کتاب لکھی گئی ہے جو غالباً کسی حد تک اس کمی کو پورا کر دیگی۔

اس کتاب کا یہ دعوی نہیں ہے کہ دنیا میں کسی نئے سیاسی نظریہ کو پیش کرے۔ یا ہر ایک سیاسی موضوع پر مفصل بحث کرے۔ بلکہ یہ کوشش کی گئی

ہے کہ اسمین بہترین مدبّرین اور ماہرین سیاست کے خیالات کو باقاعدہ مسلسل اور
علمی طریقہ سے جمع کیا جائے - البتہ نہ تو یہ کسی کتاب کا ترجمہ ہے اور نہ کسی ایک
مدبر کے اصول کو مان کر سلسلۂ مضامین قائم کیا گیا ہے - بلکہ بجائے مذہب اور
ملک کے عالمگیر اخوت انسانی کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور جن کتابون سے امداد لیگئی
ہے انکی مجمل فہرست اس کتاب کے آخر مین درج کر دی گئی ہے - اسکے علاوہ ایک
اور فہرست مشرقی تصانیف کی بھی دی گئی ہے - جن سے مشرقی دنیا کے سیاسی
تخیل کے سمجھنے مین آسانی ہو گی -

بلا شبہ سیاسیات مین کمال حاصل کرنے کے لئے فلسفہ - تاریخ اور معاشیات
کا مطالعہ نہایت ضروری ہے جو اصحاب ان علوم سے دلچسپی نہین رکھتے اُن کو اس
کتاب کے مطالعہ مین ضرور دقت ہو گی - اس کے علاوہ اس قسم کے علمی مضامین
اُس رنگینی اور چاشنئ سخن سے محروم ہین جو ادبی مضامین کا حصہ ہے - لیکن
حتی الامکان تسلسل کلام - اور لطف زبان - کو قایم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے
مشکل یہ ہے کہ سیاسیات مین انسانون کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ طبعی
اثرات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے - ظاہر ہے کہ جب صرف انفرادی طور پر
فطرت انسانی کا مطالعہ پیچیدہ ہے تو بحیثیت مجموعی کسی گروہ - جماعت -
یا قوم کی نفسی اور طبعی کیفیتون کا مطالعہ اور اُن سے نتائج اخذ کرنا کتنا پیچیدہ
اور دشوار ہو گا - وضع اصطلاحات جدیدہ کا ان مشکلات پر مزید اضافہ ہے -

اور یہ ایسی دقت ہے جسکا اندازہ وہی کرسکتے ہین جو اس کوچہ مین قدم رکھ چکے ہین۔

بہرحال اس کتاب میں جامعیت اور اختصار کے ساتھ سلطنت کے نظریۂ عمومی کو پیش کیا گیا ہے۔کتاب کو آسان بنانے کے لئے کثرت سے عنوانات قائم کئے گئے ہین اور انگریزی دان اصحاب کے لئے چند خاص سیاسی اصطلاحات کا ترجمہ کتاب کے خاتمہ پر درج کردیا ہے۔

امید ہے۔کہ ارباب علم اس علمی کوشش کو فیاضانہ زاویۂ نگاہ سے ملاحظہ فرماکر اپنے مفید مشورون سے مستفیض فرمائینگے۔تاکہ آیندہ اشاعت مین جو سقم رہ گئے ہون۔اُن کی اصلاح کردیجائے۔اگر یہ ناچیز کتاب کسی حد تک علم سیاسیات پر روشنی ڈالنے۔اور راہنمائے ملت کے سیاسی سطح نظر کو وسیع ورفیع کرنے مین معین ہوئی۔تو اسے مین اپنے اس خوشگوار فرض کی ادائیگی اور اپنی محنت وجانکاہی کا خاطر خواہ معاوضہ سمجھونگا۔

محمد اجمل خان

الہ آباد

نومبر ۱۹۲۳ء

فہرست مضامین

بابِ اول

سیاسیات کی توضیح اور وسعت

۷۸۶

تمہید

انسان فطرۃً مدنی الطبع ہے

کسی امر مسلمہ کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو نہایت ہی کم۔ صرف چند بدیہی باتوں کا بتا دینا کافی ہوتا ہے۔ بسا اوقات زیادہ دلائل و براہین کے پیش کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ مسئلہ بجائے آسان ہو جانے کے زیادہ پیچیدہ اور دشوار ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار موضوع کو چھوڑ کر فروع پر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ مقالات برکلے پڑھنے کے بعد یہ امر زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اُسنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ دونون جہان مین کوئی ایسی چیز موجود نہین ہے جو دائرۂ خیال کے باہر ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ ایک لمبی چوڑی کتاب لکھ ماری ہے کہ یہ مسئلہ ثابت ہو جائے مگر اصول کو چھوڑ فروع مین آ جاتے ہین پیچیدگیان پڑین اور ایسی کہ اب تک لوگ سُلجھاتے ہین۔

لفظ انسان ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بغیر سوسائٹی کے انسان انسان نہین ہو سکتا۔ انسان کے لئے عقل (بہا ... ہی) جو انسان کے خیالات کو ظاہر کرتی ہین دوسرے مخلوق سے مابہ الامتیاز مین بغیر مدنی زندگی کے انسان مین زبان کا استعمال شروع نہین ہو سکتا اور نہ وہ کوئی ترقی کر سکتا ہے۔ قوت گویائی کے کام مین لانے کے لئے

اجتماعی زندگی لابدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس قوم کی زبان زیادہ فصیح و بلیغ ہوتی ہے اُس قوم کو
ماننا پڑتا ہے کہ کسی نہ کسی زمانہ مین یہ ترقی کے عروج پر رہ چکی ہوگی۔ جو زبان اعلیٰ جذبات
و خیالات کا بہتر و آسان طریقہ سے اظہار کر سکے اُسکے بولنے والے ضرور اچھی تہذیب کے بانی
ہوتے ہین۔ اور تہذیب ایک فرد کی تہذیب کو نہین کہتے بلکہ یہ متفقہ قومی جدوجہد کا نتیجہ ہوتی
ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک فرد دُنیا مین بغیر [illegible] نی زندگی بسر کیلئے اپنی دماغی و جسمانی ترقی کرنا چاہتا ہے
وہ سوائے جنگلی جانورون کی طرح شکار اور پھلون پر گذارہ کرنے کے اور کوئی خیال ہی نہین کر سکتا۔
سب سے پہلا سوال انسان کے لئے اپنی حفاظت کا پیدا ہوتا ہے۔ جو بغیر گروہ بندی کے ناممکن ہے۔
اور جون ہی انسانی گروہ بندی قائم ہوئی وہ ترقی کی منزلین طے کرنی شروع کر دیتا ہے۔

نہ صرف انسان بلکہ نظام عالم مین شاید بہت کم ایسی مخلوق ہیں جو اپنی جنس کے
ساتھ رہ کر زندگی نہ بسر کرتی ہون چیونٹی سے لیکر ہاتھی تک خاص طور پر اپنی جنس کے ساتھ
متحدہ طور سے زندگی بسر کرتی ہون۔ انسان جو آجکل اتنا متمدن و مہذب بننے کا دعویدار
ہے۔ کیا یہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا یا تمدن و تہذیب مین ترقی و تنزل بھی ہوتا رہتا ہے اس
سوال کا جواب بعد مین دیا جائیگا۔ فی الحال ہمین یہ دیکھنا ہے کہ انسان ابتدائے عالم سے
اس وقت تک کن کن منازل کو طے کرنے کے بعد حقیقی معنون مین انسان کہلانے کا مستحق
ہوا ہے۔

مقالہ اوّل - سیاسی زندگی کا تاریخی ارتقا

(۱) وحشی فرقہ بندی | فی زمانہ تہذیب و شایستگی مین دُنیا نے بہت ترقی کر لی ہے - تاہم دُنیا کے دور دراز ممالک مین بہت سی وحشی اقوام موجود ہین جو نہایت ہی قدیم طرز زندگی بسر کرتی ہین - اڑیسہ - تبت - برما - افریقہ کے صحراؤن اور امریکہ کے بعض ممالک مین اب تک بہت سی اقوام وحشی حالت مین ملینگی - اُن مین سے بعض اب تک قدیم طریقہ پر غارون مین رہتی ہین - اور جنگلی جانورون اور صحرائی پھلون پر گذارہ کرتی ہین - بعض اب تک دھاتون کا استعمال نہین جانتین اور سوا ایک گروہ بندی کے جو محض شکار کی غرض سے متفق ہو کر کام کرتا ہے اور کوئی خاص بنیاد اتفاق نہین ہے - ایسے گروہ کو اپنی حفاظت اور بقا کے لئے دوسرون سے جنگ بھی کرنی پڑتی ہے - اور چونکہ ایسی حالت مین گزارہ صرف شکار پر ہوتا ہے اِس لئے اگر شکارگاہ کی وسعت کم ہوئی اور اپنے گروہ زیادہ ہوئے تو خوراک حاصل کرنے کے لئے ایک فرقہ دوسرے سے جنگ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے -

وحشی قانون - | شکار کو تقسیم کرنے کے لئے کسی قانون کا ہونا ضروری ہے - بعض انسان زیادہ پھرتیلے ہوتے ہین بعض زیادہ قوی - اور ہر انسان کی جسمانی قوتون کے لحاظ سے یہ تقسیم ہوتی ہے - غرضکہ اس ابتدائی حالت مین قانون کی ابتدا محض مسئلہ خوراک سے شروع ہوتی ہے جو انسانی زندگی کے لئے پہلا سوال ہے - قانون کی پابندی نہایت سختی سے کی جاتی ہے - اور قانون شکنی پر معمولاً سزائے موت یا کوئی اور سخت سزا دی جاتی ہے - وحشی اقوام مین

قانون صرف ممنوعات کی شکل مین ہوتا ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ اُنکا تجربہ نا مکمل ہوتا ہے۔
غیر مرئی قوتوں کا خیال توہم پرستی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اُنپر اگر کوئی مصیبت یا تکلیف
آپڑتی ہے۔ تو اُسے کسی نہ کسی لامعلوم ہستی کی طرف منسوب کرکے اُسکی پرستش شروع
کر دی جاتی ہے۔ یا اُسکے خوش کرنے کو نذر و قربانی کی جاتی ہے۔ مثلاً

(الف) دریائے نیل کی طغیانی پر اُن لوگون کی کاشتکاری کا دارومدار تھا جو اُسکے
کنارے آباد تھے۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ دریا مین طغیانی نہ آئی۔ کسی شخص نے یہ تجویز پیش
کی۔ دریائے نیل کی حکمران قوت انسانی قربانی چاہتی ہے اور جب تک ایسا نہ ہوگا دریا مین
سیلاب نہ آئیگا۔ توہم پرستی نے مجبور کیا اور ہر سال ایک دوشیزہ لڑکی دریا کے نذر چڑھائی جانے
لگی۔ ساتوین صدی عیسوی مین حضرت عمر فاروق نے اس رسم جہالت کو ممنوع قرار دیا۔

(ب) ایک بلند اور پرانے درخت کے نیچے سے ایک راستہ ہے۔ اتفاق سے جبکہ ایک
شخص اُسکے نیچے سے گزر رہا تھا اُس پر ایک موٹی شاخ گر پڑی جس سے وہ سخت زخمی ہوگیا
آئندہ سے وہ راستہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ اُس درخت کی محافظ روح نہین چاہتی کہ
لوگ اُس کے نیچے سے گزرین۔

(ج) کسی مکان کی چھت گر کر اُس کے باشندون کو زخمی کر دیتی ہے۔ وہ مکان کسی
جن یا آسیب کا مامن سمجھا جاتا ہے اور آئندہ اُس مکان مین رہنا ممنوع قرار دیدیا جاتا ہے
غرضکہ اسی قسم کی بہت سی ممنوعات جاہل قومون مین غیر مکمل تجربہ کی بنا پر رائج ہو کر
قانون بنجاتی ہین۔ اب تک ہندوستان مین خاص خاص دن سفر کے لئے ممنوع ہین

خاص جانورون کے طرز عمل سے اور ایسے ہی توہم آمیز باتون سے شگون لیکر احکام نافذ کئے جاتے ہین۔

مذہب۔ مذہب اور قانون اُسی وقت رائج ہوتا ہے جب چند افراد کسی نہ کسی طرح اجتماعی زندگی بسر کرنے لگتے ہین۔علاوہ ایسے قوانین کے جس مین بہت سی باتین ممنوع ہوتی ہین وحشی اقوام مین کسی نہ کسی طرح کا مذہب ضرور پایا جاتا ہے۔موجودہ مذاہب کی بُنیاد وحشی لوگون مین پڑی اور اگر مذہب کے ارتقائی درجون کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔کہ ارتقائے مذہب کے تین بڑے بڑے درجے ہین۔

(الف) انسان سب سے پہلے کسی بیرونی چیز کی پرستش شروع کرتا ہے۔زیادہ تر وہی چیزین قابل پرستش قرار دیجاتی ہین جو اُسکے لئے فائدہ مند ہون یا اُس سے زیادہ قوی اور ہیبت ناک ہون۔اول الذکر کی مثال ہندوستان مین گائے اور دریا سے آسانی سے سمجھ مین آسکتی ہے۔گائے زراعتی امداد کے علاوہ دودھ جیسی ضروری شے کثرت سے مہیا کرتی ہے۔دریا ملکون کو سیراب کرتا ہے اور زراعت مین امداد دیتا ہے۔غرضکہ یہ دونون چیزین قابل پرستش سمجھی جانے لگتی ہین مگر وہ لوگ جو زراعتی درجہ پر نہین پہنچے اور صرف شکار پر گزارہ کرتے ہین اُنکے لئے مہیب بیرونی قوتین بہ نسبت جانورون اور دریاؤن کے زیادہ قابل تعظیم معلوم ہوتی ہین۔اُنکے قبیلہ مین جو زیادہ قوی شخص ہوتا ہے وہ دیوتا سمجھا جاتا ہے مثلاً یونانیون مین ہرکولیز بین مثال ہے۔ہندوستان مین تو ایسے انسانون کی جو قابل پرستش ہین ابتدائے زمانہ کے علاوہ اب تک کمی نہین ہے

علاوہ اسکے ناگ دیوتا اور اگنی دیعنی آگ ہکو انکی ہیبت ناک صورتون کی وجہ سے ہندوٴن کے بعض فرقے اب تک قابل پرستش سمجھے جاتے ہین۔ عیسائیون نے حضرت عیسیٰؑ مین الوہیت کی شان دیکھی چونکہ اُن سے کئی باتین ایسی ظاہر ہوئین جو عوام کے لئے مافوق الفطرت تھین۔ یہ چند مثالین بتاتی ہین کہ موجودہ زمانہ مین بھی وہی پرانی کیفیت قلب انسانی باقی ہے۔ مگر زیادہ تر شکار پر گزارہ کرنے والا جنگلی انسان طوفان۔ بجلی۔ گرج۔ چاند۔ سورج۔ آگ وغیرہ کی پرستش کرنے لگتا تھا اور بہت سی لامعلوم قوتون کو ہر وقت حاضر و ناظر سمجھتا تھا۔

(ب) ان بیرونی قوتون مین سے ایک قوت کو سب سے قوی سمجھکر انسانی تخئیل اُسے اِن سب کا فرمانروا بناتی ہے اور بہت سے دیوتاؤن پر ایک بڑا دیوتا بڑی قوت حکمران ہوتی ہے۔ یہ سب دیوتا آپس مین لڑتے جھگڑتے بھی رہتے ہین اوران سب کی حالت انسانی زندگی کی حالت سے قطعی ملتی جلتی ہوتی ہے۔ جس طرح انسانون کا ایک بادشاہ ہوتا ہے اسی طرح ان دیوتاؤن کا بھی خدا ہوتا ہے۔ اور معمولی انسانون کی طرح یہ دیوتا بھی بغض وحسد محبت ومسرت سے اثر پذیر ہوتے ہین۔

(ج) تیسرا درجہ اس تخئیل سے گزرکر ایک حاضر وناظر مکمل وقادر قوت کا قائل بنا دیتا ہے جسمین اگرچہ بہت سی انسانی صفات ہوتی ہین مگر وہ ان سب صفات سے بالاتر ہوتا ہے[ل]۔ یہ تخئیل وحشی اقوام کے بعد کا ہے۔ وہ قومین خدا کو ایک تکلیف پہنچانیوالی۔

[ل] موجودہ زمانہ مین مذہب کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے اور ترقی پر ہے یعنی فطرت پرستی۔ لوگ خدا کے قائل نہین رہے اور سائنس کی ترقی اور مشاہدات کی وجہ سے دُنیا کو مجموعۂ اسباب وعلل سمجھ کر خدا کو بھول گئے ہین۔ اور بعض خدا کے وجود کو روح فطرت سے تعبیر کرکے اپنے تئین بھی خدا کا جزو سمجھنے لگے ہین غرضکہ اس دَور مین نئی مذہبی ریشہ دوانیان ہو رہی ہین۔

ظالم و جابر خون آشام ہستی سمجھتی ہو - وجہ یہ ہے کہ وحشی انسان خدا کو نہایت ہی قوی اور تیز دست مسلح انسان کے مانند ہی سمجھتا ہے - اور وہ قوت جو اُسے زیر کر لے اور اُس پر غالب ہو کر اُسکے شکار کو یا اُسکے ہتھیارون کو اُس سے چھین سکے وہی خدا ہو سکتی ہے - لہذا جب ایک غیر مرئی خدا کے وجود کا خیال آتا ہے تو وہ بھی انہی جذبات سے پُر ہوتا ہے -

(۲) خاندان - وحشی فرقہ بندی سے گزر کر تمدنی ترقی مین دوسرا درجہ خاندان کا ہے - تاریخ شاہد ہے کہ طوفان نوح سے پہلے ہی خاندانون کی بُنیاد پڑ چکی تھی اور اُسکے بعد بھی بہت سی شاخین خاندانی طرز زندگی پر قائم رہین اور اب تک ہین - خاندان درمیانی درجہ ہے - اسکے پہلے وحشی حالت تھی اور اسکے بعد موجودہ تمدن کی بُنیاد پڑی لہذا ضروری ہے کہ خاندانی خصوصیات کا مختصراً بیان کر دیا جاوے -

(الف) بُنیاد رشتہ داری یہ مذکو - کسی خاندان سے تعلق رکھنے کے یہ معنی ہین کہ وہ شخص اُس خاندان کے مورث اعلیٰ کی اولاد ہے - مثلاً عرب مین ہاشم کی اولاد بنی ہاشم اور امیہ کی اولاد بنی امیہ کہلائی - مگر وحشی حالت مین رشتہ داری کا مرکز عورت تھی - جو حالت قائم نہ رہی اور رفتہ رفتہ عورت کی بجائے مرد مرکز بنگیا اور ایک خاندان کے کل افراد اپنا سلسلہ قرابت کسی خاص مرد سے ملانے لگے -

(ب) مستقل شادی - وحشی حالت مین شادی کا رواج نہ تھا - عموماً ہر جوان مرد ہر جوان عورت کا شوہر سمجھا جاتا تھا - سن مود عورت باپ اور ماں کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے -

بہت سے فرقون مین توان رشتہ داریون کے علاوہ اور کوئی نام مثلاً بھائی یا چچا یا خالہ وغیرہ موجود نہ تھے۔ مگر خاندانی حالت مین شادی اسوجہ سے لازمی قرار دی گئی کہ غیر مشتقل شادی کے کوئی مرد یا عورت اپنے آپ کو کسی خاص مرد کی اولاد نہین بتا سکتا تھا۔ جو خاندانی سوسائٹی کے لئے ضروری تھا۔

(ج، پدری اقتدار) باپ کو اپنی اولاد پر ہر طرح کا اختیار رہتا تھا۔ وہ اُن کے جان و مال کا مالک ہوتا تھا۔ اور اُن کو بطور غلامون کے فروخت کر سکتا تھا۔ عورت کا درجہ بہت ہی معمولی سمجھا جاتا تھا۔ یہانتک کہ اس طرز عمل نے ہندوؤن مین عورتون کو ابتک کسی مرد کی ماتحتی مین رہنا ضروری قرار دیا ہے خواہ وہ اسکا بیٹا ہی کیون نہ ہو۔ (مردون کے جسمانی تفوق نے ابتک عورتون کو عام طور پر مردون سے کمتر درجہ پر رہنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ یورپ مین بخلاف طالیفیلہ عورتون کی نام نہاد آزادی اُنکے لئے زیادہ تکلیف دہ اور ذلت آمیز ہے) مورث اعلےٰ اپنے خاندان کے مذہب۔ قانون۔ تجارت کا اپنے قبیلہ مین ذمہ دار ہوتا تھا۔ اور اگر کسی غیر قبیلہ کا شخص ان سب احکام کو ماننے کے لئے تیار ہوتا تھا تو وہ اُس خاندان کا فرد سمجھا جانے لگتا تھا۔ مگر کسی خاندان مین نئے آدمی کو داخل ہونے کے لئے نہایت دشواری ہوتی تھی۔

مندرجہ بالا تین خاندانی خصوصیات ہین۔ جو افغانون کے ملک ہی۔ عربون کے شیخ۔ یہودی۔ رومن۔ کلٹک۔ اور اسکاٹلینڈ کی فرقون کے مورثان اعلیٰ مین پورے طور پر پائی جاتی ہین۔ موجودہ سوسائٹی کی بنیاد کسی سلطنت سے جنگی اتحاد رکھنے اور اُس حکومت کے

قوانین کو جس سے ایسا اتحاد پیدا کیا گیا ہو پورے طور پر ماننے پر مبنی ہے - مگر خاندانی حالت مین جب تک کہ خون کا تعلق نہ ہو کسی طرح بھی ایک شخص اُس خاندان کا فرد نہین ہو سکتا - اگر کوئی غیر شخص کسی خاندان مین چلا جائے تو اول تو وہ داخل ہی نہ کیا جائے گا اور اگر ایسا کیا بھی گیا تو وہ بحیثیت ایک غلام یا خادم کے رکھا جائیگا - بخلاف موجودہ سوسائٹی کے جو عموماً اپنی مالی اور فوجی قوت کے بڑھانے کے لئے دوسرے لوگون کو اپنی قوم مین شامل کر لینے مین زیادہ عذر نہین کرتے -

خاندانی حالت مین ہر شخص اپنے گھر کے بڑے بوڑھے کے علاوہ کسی سے تعلق نہین رکھتا اور نہ کوئی دوسرا خاندان اُس شخص سے کسی امر کے متعلق جواب طلب کر سکتا ہے کیونکہ کسی خاندان کا فرد اپنے مورث یا بزرگ کے علاوہ کسی اور شخص کے زیر حکم نہین ہوتا - یہ بزرگ اپنے خاندان کے سردار اور وہ سردار اپنے قبیلہ کے شیخ یا سردار اعظم سے اپنے ماتحت متعلقین کا سردار اور اُن کے طرز عمل کا ضامن ہوتا ہے - اس سوسائٹی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر شخص کو اپنے خاندانی رسم ورواج کا پابند ہونا پڑتا ہے - جسکے خلاف کرنا سخت جرم سمجھا جاتا ہے -

اسی سلسلہ مین ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی لازمی ہے - عام طور سے یہ بات مانی جاتی ہے کہ سوسائٹی کی ابتدا ایک گھر سے ہوئی جو بڑھتے بڑھتے ایک خاندان ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس خاندان سے بہت سے خاندان نمودار ہوئے جنکے اتحاد سے ایک قبیلہ ہو گیا - مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے ایک قبیلہ[1] تھا - جسمین مختلف انسان جو ایک دوسرے سے کوئی خاص تعلق

[1] دیکھو کتاب موسومہ کلٹک سکاٹلینڈ مصنفہ مسٹر ایف - ڈبلیو - اسکین -

نہین رکھتے تھے۔ اپنی خاص ضروریات کی وجہ سے مجبور ہوکر اجتماعی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ جو رفتہ رفتہ فرقون مین تقسیم ہوگیا۔ فرقون سے چھوٹے گھرانے قائم ہوئے جو سوسائٹی کے فرد مانے گئے۔ موجودہ زمانہ مین بجائے خاندان کے ہر شخص بذات خود سوسائٹی کا فرد سمجھا جاتا ہے۔ یعنی خاندان بھی اب باقی نہین ہے اور ہر شخص براہ راست حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔

مسٹر اسکین کا قول ہے کہ وحشی انسان جانورون کے پالنے کی وجہ سے خاندانی حالت مین تبدیل ہوگیا۔ اور زراعت سیکھتے ہی یہ قبیلہ چھوٹے چھوٹے فرقون مین تقسیم ہوگیا۔

اس چھوٹی سی کتاب مین مفصل طریقہ سے خاندانی سوسائٹی کا موجودہ سیاسی سوسائٹی مین تبدیل ہونے کی داستان کی گنجایش نہین ہے۔ صرف اشارے اور خاص ارتقائی درجون کا بتادینا ہی کافی ہے۔

انسانی تمدن کو دو چیزون نے نہایت سُرعت کے ساتھ ترقی دی۔ ان ہی دو باتون کی بدولت وحشیانہ اور غیر مستقل زندگی کو چھوڑکر کسی قدر مہذب اور مستقل مدنیت شروع ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ تمدن و تہذیب۔ تجارت و صنعت۔ غرضکہ کُل انسانی سلسلے مندرجہ ذیل اصول کی فروع ہین۔

(الف) جانورون کا سدھانا اور پالنا۔

(ب) زراعت۔

---

[1] لفظ خاندان یا خاندانی اس سلسلہ مضمون مین خاص معنون مین استعمال کیا گیا ہے۔ اِس کی خصوصیات بتائی جاچکی ہین۔

جانورونکا پالنا

(الف) مسئلہ خوراک ابتدائے عالم سے اب تک ضروری رہا ہے اور آئندہ بھی رہیگا۔ یہ معمولی اور کھلی ہوئی بات ہے کہ غور فکر سے کام لیا جاوے۔ تو کل دنیاوی پیچیدگیون کی گتھی اُسی وقت سلجھ سکتی ہے اور انسان فرشتہ بن سکتا ہے جب اس مسئلہ کا حل ہو جائے زندگی کی جدوجہد۔ تجارت و زراعت۔ جنگ و صلح کی وجہ یہی مسئلہ ہے۔ وحشی انسان کو یا تو جنگلون سے پھل وغیرہ دستیاب ہو سکتے تھے۔ یا جانورون کا گوشت۔ پھلون کا زیادہ بھروسہ نہین ہو سکتا تھا۔ چونکہ بعض فصلون مین لازمی طور پر پھل نہین مل سکتے تھے۔ یا بعض ممالک خشک اور بنجر ہونے کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک انسانی آبادی کو پھل مہیا نہ کر سکتے تھے۔ خوراک کا ذخیرہ مہیا کرنے کے لئے وحشی انسان کو ایسی چیز کی ضرورت ہوئی جو ضرورت کے وقت کام دے سکے اور خراب بھی نہ ہو۔ اسکا سب سے آسان طریقہ یہ ہو سکتا تھا۔ کہ جانورون کو سدھا کر پالنے کی کوشش کی جاوے۔ تاکہ خوراک کے زندہ گودام (جانور) حسب ضرورت استعمال کئے جا سکین۔ پالتو جانورون کی کثرت سے وحشی انسان کو محنت کی قدر معلوم ہوئی اور دُنیا کے سب سے بڑے اور غیر فطرتی اصول یعنی غلامی کی بنا اسی وقت سے پڑی۔ جانور تو غلام بنائے ہی گئے اور غالباً آئندہ بھی بنے رہین گے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انسان انسان کا غلام بنایا جانے لگا۔ جس شخص کے قبضہ مین زیادہ عورتین بچے اور مرد ہوتے تھے وہی زیادہ کثرت سے جانور پال سکتا تھا۔ عورت کی حیثیت وحشی حالت مین اگرچہ اتنی کم نہ تھی مگر جانور پالنا اور عورت کا درجہ کم ہونا ایک ہی وقت مین شروع ہوا۔ ہر شخص اپنے بچون کو اپنی ملک سمجھنے اور عورتون کو اس لئے کہ کثرت سے اولاد کا مالک ہو حاصل کرنے کی کوشش

کرنے لگا۔ موجودہ مزدوری پیشہ و سرمایہ داروں کے تفضیہ کی بُنیاد بھی اُسی زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ جانوروں کے پالنے کی وجہ سے معاشیات کا اصول راس المال اور منافع اُن کے ذہن نشین ہوگیا۔ اور سوسائٹی میں امیر غریب۔ مزدوری پیشہ جماعتیں بن گئیں۔

زراعت۔ (ب) زراعت کی ابتدا لا معلوم ہے۔ مگر اتنا کہا جا سکتا ہے۔ کہ جانوروں کے سدھانے کے بعد اس کی بنیاد پڑی۔ ابتدا میں شکار اور پھلوں کے علاوہ وحشی انسان کا گزارہ کسی اور چیز پر نہ تھا اور جب تک مستقل طور سے کسی آبادی کو قائم کر کے زندگی بسر نہ کی جاوے زراعت کا وجود ہی ناممکن ہے۔ زراعت کی وجہ سے انسانی مستقل آبادی قصبوں اور گاؤں کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اور جب معدنیات کا وجود انسانی کاروبار میں مدد دینے لگا۔ اور اصول مبادلہ پر تجارت کی بُنیاد پڑی۔ اور حرفتیں اور صنعتیں خاص خاص فرقوں کے ہاتھ میں خصوصیت سے آگئیں تو بازار بنا اور مستقل قصبہ اور شہر پیدا ہوگئے۔

فٹ نوٹ [1] ہر عنوان پر مفصل مضامین کی ضرورت ہے۔ جو فی الحال قلم انداز کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کی سوسائٹی کے قانون اور مذہب کا نشو و نما بھی اسی ضمن میں آجاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ایسی سوسائٹی میں مذہب عموماً بزرگوں کی پرستش پر مبنی ہوتا ہے ہر قبیلہ و فرقہ۔ حتیٰ کہ ہر گھر کا دیوتا یا بت الگ ہوتا ہے۔ دوسرے قبیلہ والے اسے نہیں پوج سکتے۔ علاوہ ازیں مذہبی پرستش نہایت خفیہ اور راز میں رکھی جاتی ہے دوسروں کو اس پرستش میں شاذ و نادر داخل کیا جاتا ہے۔

ایسے قبیلوں میں عام طور سے خاص قانونی اصول نہیں ہوتے۔ مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سردار اعلیٰ سردار کے احکام کی پابندی اور رسم و رواج جو رائج ہوتے تھے نہایت سختی سے مانے جاتے تھے۔ اور رسم عملی [illegible] تھے۔

مقالہ دوم - سیاسیات علم ہے یا فن

علم - علوم متعدد ہین مثلاً علم کیمیا - علم طبیعات - علم نجوم - علم ریاضی وغیرہ ہر علم کا ایک خاص حلقہ ہوتا ہے اور اُس حلقہ کی حد سے باہر اُسکا عمل نہین ہوتا - باقی چیزین دوسرے علوم سے متعلق ہوتی ہین - مثلاً علم نجوم صرف اجرام فلکی سے تعلق رکھتا ہے اور علم الابدان کا حلقہ جسمون کی حالت و کیفیت تک محدود ہے - قس علی ہذا -

لہذا ہر ایک علم[1] اشیائے عالم کی کسی خاص قسم یا جماعت سے متعلق ہوتا ہے اور اُن اشیا کے حالات اور طرز عمل کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے - بالفاظ دیگر ہر ایک علم اپنے دائرۂ اثر مین اُن اشیا کے متعلق ایسے قوانین عامہ کی تحقیق کرتا ہے جن کے مطابق وہ اشیا جو اُس علم سے تعلق رکھتی ہین ہمیشہ عمل کرتی ہین - یعنی علم کے وجود مین آنے کے لئے اس امر کی نہایت ضرورت ہے کہ اشیاء زیر تحقیق ہمیشہ ایک ہی طرح عمل کرین - تاکہ کلیات عامہ بنائے جا سکین اور تسلسل قائم رہے -

علوم کی دو قسمین ہین - (۱) باقاعدہ مسلسل اور حقیقی - (۲) بے قاعدہ و غیر مسلسل اور غیر حقیقی - علم کو علم جب ہی کہا جائیگا جب یہ علم - باقاعدہ اور حقیقی ہو اور اسکے متعلق جو قوانین عامہ

---

[1] سائنس یا ہنر اور آرٹ کے لئے ہم نے اس کتاب مین علم اور فن کے الفاظ استعمال کئے ہین - اگرچہ ان الفاظ کا مفہوم اِن الفاظ سے مختلف ہوتا مگر ان الفاظ پر کافی بحث ہو چکی ہے - یہان طول کی گنجایش نہین -

بتائے جائیں اُن کا فرداً فرداً ہر چیز پر (جو اُس علم کے زیرِ تحقیق ہو) صحیح اطلاق ہو سکے[1]۔

فن ۔ کسی مقصد کے حصول کے قواعد بتانا فن سے متعلق ہے۔ فن کہتا ہے کہ "یہ کرو" "وہ نہ کرو" مگر چونکہ غور و فکر، تحقیق و تنقید کرنے سے پہلے عمل کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ لہذا علم سے فن کو سبقت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں انسان سے متعدد افعال ایسے ظہور میں آتے ہیں جو نہ خاص قواعد کی پابندی میں کئے جاتے ہیں، اور نہ ایسا کرنے سے فعل مقصود ظاہر ہو کر علم کی سی یکسانیت اور تسلسل پیدا کر سکتا ہے۔ مثلاً شاعری کو لیجئے۔ یہ ایک فطرتی چیز ہے۔ کسی شخص کو سیکھنے سے نہیں آ سکتی اور نہ ایسے قواعد ہیں جنکی پیروی کرنے سے کوئی شخص شاعر بن جائے لہذا شاعری علم نہیں ہو سکتی یہ محض فن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علم و فن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر فن کے لئے ضروری ہے کہ اُسکی بنا علم پر ہو۔ ورنہ یقیناً خطرناک اور بے معنی نتائج کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص جراحی کرے اور علم الابدان سے واقف نہ ہو تو یہی نتیجہ ہوگا کہ بے فائدہ لوگوں کی جان لے۔ اسی طرح خواص الادویہ کو نہ جانتے ہوئے طبیب بن بیٹھنا خطرۂ جان ہو جاتا ہے جس سے مہلک نتائج پیدا ہونے ضروری ہیں۔

علمی تحقیقات کا مقصد اولیٰ یہ ہے کہ اُس پر کسی فن کی بنیاد رکھی جائے۔ اگر

[1] علم کے مسلسل ہونے سے ہمارا منشا یہی ہے جو بیان کیا گیا یعنی ہر فرد پر اُس علم کے مسائل کا اطلاق ہو سکنا ضروری ہے۔

کوئی علم ایسا ہے کہ اُس پر کوئی فن قائم نہین ہو سکتا یا کسی فن کو فائدہ نہین پہنچ سکتا تو وہ علم بھی اُس فن کی طرح بے کار ہے جسکی بُنیاد کسی علم پر نہین ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے علم و فن کا فرق ظاہر ہوگیا اب دیکھنا ہے کہ سیاسیات علم بھی ہے اور فن بھی۔ لہذا

(۱) سیاسیات علم اس وجہ سے ہے کہ یہ سلطنت کے متعلق جملہ قوانین کی تحقیق و تنقید کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ خاص حالتون مین سلطنت کی کیاکیا حالتین ہوتی ہین۔

(۲) جس طرح علم الحکومت کو علم سیاسیات کہتے ہین۔ اسی طرح فنِ سیاست اُس علم کے استعمال کا نام ہے۔ جو خاص خاص صورتون مین خاص سلطنتون کے اندر کیا جائے۔ لہذا سیاسیات فن بھی ہے۔

تقویم احوال البلدان اس زمانہ مین سیاسیات بحیثیت علم کے بہت زیادہ ترقی کررہا ہے۔ اگرچہ زمانۂ گذشتہ مین یہ علم موجود تھا مگر چونکہ موجودہ زمانہ کی طرح باقاعدہ اور مسلسل نہ تھا لہذا اس سے بہت کم منطقی نتائج اخذ کئے جاسکتے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ مین اُن واقعات کی تدوین اور صحیح اعداد و شمار جمع کرنے کی کافی کوشش کی جاتی ہے جو قومی زندگی سے تعلق رکھتے ہین۔ اور ایسی تقویمون سے سیاسیات مین باقاعدہ علمی امداد ملی ہے مثلاً موت۔ پیدائش۔ اور شادی کے متعلق صحیح اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہین۔ یا جرائم و امراض کے صحیح اوقات اور اعداد و شائع کئے جاتے ہین۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی

باقاعدہ ترقی وتنزل کی فہرستین اور اسی قسم کے اعداد وشمار سیاسیات مین صحیح نتائج پر پہنچنے مین کافی امداد دیتے ہین۔

نفسیات ومعاشیات نفسیات یا علم النفس بالکل جدید علم ہے۔ یہ علم نفسِ انسانی اور فطرت داخلی کا مطالعہ کرتا ہے۔ چونکہ بغیر فطرت انسانی کو پورے طور پر سمجھے ہوئے انسانی افعال اور اعمال کے متعلق کوئی صحیح راے قائم نہین ہوسکتی لہذا یہ علم جدید سیاسیات کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جسم کے لئے روح کی ضرورت ہے۔ جتنا یہ علم ترقی کرتا جائیگا اور انسانی جذبات ومحسوسات کی پیچیدگیان سلجھتی جائینگی اتنا ہی سیاسیات مین باقاعدگی اور عمومیت پیدا ہوگی اور یہ علم مکمل ہوتا جائیگا۔

اسی طرح معاشیات (علم الاقتصاد یا علم المعیشت) بھی نیا علم ہے اور انسان کی مادی ضروریات کی پیداوار اور استعمال کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے اور معاشی معاملات کے متعلق (جو سیاسیات سے بہت زیادہ وابستہ ہین) صحیح معلومات بہم پہنچا کر علم سیاسیات کو مکمل کرتا ہے۔

مجلس ماہرین مذکرہ باتون کے علاوہ موجودہ زمانہ مین کوئی نئی بات یا نیا سیاسی تغیر وتبدل اُسوقت تک نہین کیا جاتا جب تک ماہرین فن کی مجلس کافی غور وتحقیق کے بعد اپنی راے نہ پیش کرے۔ ایسی مجالس کو نہ صرف مسئلہ کی موجودہ حالت پر تحقیقات کرنیکی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ اُنکو اس مسئلہ کی پوری تاریخ اور دوسرے ممالک مین اس کی کیفیت معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ صحیح راے قائم کرکے مُلک وملت کے سامنے پیش

کرے۔ لیکن ایسی تحقیقاتوں کا اکثر یہ خراب نتیجہ ہوتا ہے کہ اگر تحقیقاتی کمیشن عرصہ دراز کے بعد اپنی روئداد پیش کرے تو یا تو عوام کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ یا انکی طبیعت کسی دوسری طرف رجوع ہو جاتی ہے۔ اور اس روئداد کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت کے کاروبار میں بدانتظامی۔ خرابی۔ اور تاخیر ہو۔ تاہم مسئلہ زیر بحث و سیاسات علم ہے اس امر سے یہ روشنی پڑتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں انسانی طبیعت کا اقتضا زیادہ تر اسوجہ سے علمی ہوتا جاتا ہے (اور اسوجہ سے سیاسیات کو علم کہہ سکتے ہیں) کہ کوئی ملت اسوقت تک ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھاتی جب تک کہ موجودہ و گذشتہ کے تعلق۔ اور گرد و پیش کی اقوام و ملل کے حالات پر غور نہیں کر لیا جاتا۔

سیاسیات کا علمی مطالعہ اس تحقیق کے بعد ہمیں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ سیاسیات کا علمی مطالعہ کس طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ اسکے دو صحیح طریقہ ہیں اور ان صحیح طریقون کے یکطرفہ استعمال سے دو غلط طریقہ پیدا ہو جاتے ہیں اور اکثر مدبرین اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے ان طریقون میں پڑکر غلط نتائج پیدا کرتے ہیں۔ لہذا علم سیاسیات کے مطالعہ کے چار طریقہ ہوئے۔

صحیح طریقہ دو ہیں (۱) تاریخی۔ (۲) فلسفی۔ اور ان دونون طریقون کے یکطرفہ اور انتہائی استعمال سے دو غلط طریقہ بہ تسلسل پیدا ہوتے ہیں یعنی (۱) محض تاریخ اور تجربہ سے سیاسی مسلمات عامہ اور نتائج کو اخذ کیا جاتا ہے (۲) صرف خیالی فیلسوفی اور وہمی باتون سے مدد لیکر نتائج بنائے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ اس طرح حقیقی طریقہ فلسفی کا صرف خاکہ ہوتا ہے۔

طریقۂ تاریخی۔ | جب تاریخی نقطۂ نظر سے سیاسیات پر نظر کی جاتی ہے تو بجائے الفاظ قانون کے منشاء قانون پر زیادہ نظر رہتی ہے اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زمانہ ٹھہرا ہوا یا قائم نہیں ہے بلکہ روزانہ نئے حالات و واقعات پیش آتے رہتے ہین اس طرح زمانہ کی ترقی کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ بات جو آج خاص حالات مین ایک خاص نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ کل واقعات کے بدلتے ہی دوسرا نتیجہ پیدا کرسکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ماحول کے تغیرات روزانہ نئے مناظر پیش کرتے رہتے ہین۔ اگر موجودہ زمانہ کے مسائل کو صرف تاریخ قدیم کے نتائج کو مدنظر رکھکر حل کیا جائے تو یقیناً انصاف کا خون ہوگا۔ امن عامہ مین کمی پیدا ہوگی اور سلطنت کی اخلاقی حالت اتنی خراب ہوجائیگی کہ بسا اوقات صحت ناممکن ہوگی۔ یہ غلطی اکثر تاریخ کے یکطرفہ مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے بخلاف اسکے صحیح طریقۂ تاریخی گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے اندرونی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ زمانۂ قدیم سے اب تک کس طرح سلطنت نے ترقی کی ہے اور یہ ترقی اب کس طرح جاری ہے

طریقۂ فلسفی۔ | حکما (فلسفیون) نے زمانہ قدیم سے اب تک اپنے تخئیل اور قوت واہمہ سے وہ وہ خیالی جمہوریتین اور سلطنتین قائم کی ہین جو اگر عالم مثال مین آجائین تو واقعی یہ دُنیا نمونۂ بہشت برین بن جائے۔ مگر وہ اکثر حقیقی زندگی اور واقعات موجودہ کو چھوڑ کر صرف خیال آرائیون مین رہ گئے۔ اسلئے اونکے خیالی نظامہائے عمل معمولی انسان کی طاقت سے باہر تھے۔ اس مین شک نہین کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو حیات ملی اور سلطنت نہایت بلند اور مستحکم معیار پر قائم ہوجائین۔ چونکہ قانون اور سیاسیات مین ہر دو حاکمیت اور قوت خیال

کا زبردست عنصر ہوتا ہے۔ یہ دونوں علم حقیقی بنیاد پر جب ہی قائم ہو سکتے ہیں جب فطرت انسانی اور روز مرہ کی زندگی کے واقعات کو نظر انداز نہ کریں۔ لہٰذا محض خیالی غور و فکر کو طریقۂ فلسفی سمجھنا غلطی ہے۔ حقیقی طریقۂ فلسفی وہ ہے جسمیں عالم خیال اور عالم مثال کے واقعات و حالات کو ملایا گیا ہو۔ اور زمانہ کے واقعات کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ مختصر یہ کہ اس طریقہ کی بنیاد نفسیات پر ہوتی ہے جو تاریخ کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔

طریقہ ہائے بالا ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں مورخ کو فلسفہ کی مدد اس لیے ضروری ہے کہ بغیر اس کے فطرت انسانی کے متعدد اعمال کا سمجھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح حقیقی [illegible] واقعات و حالات اور مثالوں کے لئے فلسفی کو تاریخ کے مطالعہ کی سخت ضرورت ہے۔

طریقہ ہائے بالا کا حسن و قبح۔

مندرجہ بالا طریقوں میں اچھائی اور برائی دونوں ہیں۔ تاریخ گوناگوں نتائج ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور زندگی کے نمونہ کثرت کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں فلاسفر کا تخیل انسانی تاریخ کے لا انتہا تخیلات کے سامنے ایک ذرہ بے مقدار ہے۔ اور وہ بھی حقیقی نہیں بلکہ موہوم۔ مگر تاریخی نتائج کے تجربات میں یہ خرابی ہے کہ ممکن ہے کہ ہم ان کے دھوکے میں آ کر زمانہ گزشتہ کے کارناموں میں اتنے محو ہو جائیں کہ زمانہ موجودہ اور آئندہ کی ارتقائی کیفیتوں کو نہ دیکھ سکیں اور وحدت انسانی کو کثرت تجربات کی بنا پر بھول جائیں۔

بخلاف اسکے طریقۂ فلسفی زیادہ واضح، مسلسل اور مکمل ہوتا ہے۔ اسکے نتائج فطرت انسانی پر مبنی ہوتے ہیں اور قوت خیال کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ مگر اس میں بھی یہ خرابی ہے کہ فلسفی اکثر وحدت انسانی پر زور دیتے ہیں اور اس یکرنگی پر زیادہ زور دینے کا اکثر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ فطرت انسانی کی اندرونی کثرت کو بھول کر بجائے اسکے کہ حقیقی قوانین معلوم کریں وہ خشک و بے معنی نظریات پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ اور ان بحثوں میں ایسا پڑتے ہیں کہ اپنی کمزوری کو گرمی تخیل کی وجہ سے محسوس نہیں کرتے اور وہی دنیا کے بے معنی دلائل کی پرپیچ و خم گھاٹیوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان غلطیوں میں نہ پڑنا بہت کم فلسفیوں کا حصہ ہوا ہے اور صحیح طریقہ فلسفی ابتداہی سے ان باتوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

مقالہ سوم۔ سیاسیات کی وسعت اور تعریف

سیاسیات۔ زمانہ قدیم مین سیاسیات درحقیقت علم اخلاق کی وہ شاخ مانی جاتی تھی جسکا مقصد یہ ہے کہ کسی سلطنت مین اس طرح سے حکومت کی جائے کہ اسکی دولت سلامتی اور امن مین ترقی ہو۔ اور ملت کے مقاصد کو جہانتک ممکن ہو حاصل کرے موجودہ زمانہ مین سیاسیات کو علم اخلاق کی شاخ نہیین مانا جاتا حالانکہ اسکا تعلق زیادہ تر علم اخلاق فلسفہ و تاریخ سے ہے۔ یہ علم اب بذات خود ایک علیحدہ علم ہے اور تقسیم علوم کے اعتبار سے اجتماعیات کا جزو سمجھا جاتا ہے۔

سیاسیات مین جن مضامین سے عموماً بحث کی جاتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہین

(۱) وہ اصول جن پر حکومت کی بنیاد ہوتی ہے۔

(۲) وہ افراد جن کے ہاتھون مین حکومت اسطرح سے دی جائے کہ نہایت ہی مفید ثابت ہو۔

(۳) حاکم و محکوم کے فرائض اور حقوق۔

(۴) سلطنت کی ترقی و تنزل کے وجوہ اور ترقی کے ذرائع کی خواہی۔

(۵) افراد ملت کی آزادی انکے حقوق اور انکے اخلاق کی حفاظت۔

(۶) بیرونی حملہ یا اثر سے ملک یا قلمرو کی آزادی کی حفاظت۔

تعریف ۔ اگر ہم سیاسیات کی منطقی تعریف مندرجہ بالا تفصیل سے اخذ کریں تو یہ ہوگی

(سیاسیات وہ علم ہے جو سلطنت سے تعلق رکھتا ہے اور اسکی (سلطنت کی) مختلف حالتوں اور انکی حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہے ۔ اور سلطنت کے اقسام اور اسکے عروج و زوال اور اسکی کیفیتوں کو معلوم کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔)

لہٰذا وہ علوم جو سیاست کے دراصل معاون و مددگار ہیں۔ درحقیقت علم سیاسیات میں شامل نہیں ہیں ۔مثلاً

(۱) **تاریخ** ۔ کسی ملت کی تاریخ علم سیاسیات کا جزو اسوقت تک نہیں ہوسکتی جب تک بالکل سیاسی یا آئینی تاریخ نہ ہو۔ مثلاً کسی قوم کے زندگی کے عام حالات ۔ افراد کے افعال ۔ علم و ہنر اور اخلاق کی تعریف جنگی اور سیاسی جھگڑے علم سیاسیات کا جزو نہیں ہیں۔ تاہم دوسرے معنوں میں تاریخ بالکل سیاسیات ہے ۔۔ اسلئے اسوجہ سے ضروری ہے کہ انسان کی سیاسی زندگی کے ارتقا کے مختلف مدارج کو بتاتی ہے ۔ اسی علمی حیثیت سے تاریخ کا مطالعہ جب ہی صحیح ہوسکتا ہے جب انسان کی معمولی جھگڑوں۔ لڑائیوں اور انفرادی افعال کو چھوڑکر اسکا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ انسانی سیاسی ترقی پر بحیثیت مجموعی روشنی پڑے ۔اگر تاریخ[1] سے ہم کو سیاسیات کا علم حاصل نہ ہو تو

---

[1] نوٹ ۔ اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ تاریخ ایسا علم نہیں جو بالکل یقینی نتائج پیدا کر سکے ۔اگر ایسا ہوتا تو مختلف سلطنتوں کا مستقبل صاف صاف ظاہر ہو جاتا۔ لیکن یہ ناممکن ہے ۔ جیسا کہ انسان کی شخصیت کو گورکھ دھندا کبھی سلجھ نہیں سکتا۔ تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ تاریخ کی نقالی کرنے والے اکثر غلط نتائج پر پہنچتے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ مسئلہ ہر زمانہ میں صادق آتا رہا ہے اور آئیگا۔ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ٹھیک اور موزوں آدمی کس وقت نکالا جا سکے ممکن ہے کہ زمانہ کے اثر سے انسانی دماغ خاص سانچے میں ڈھل جائے مگر زمانہ میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ مرضی پر ایک عالی دماغ انسان پیدا کر سکے ۔ جیسے مصطفیٰ کمال۔ نپولین ۔ یا گاندھی۔

وہ تاریخ نہیں بلکہ ایک افسانہ ہے اور وہ بھی ایسا کہ جسکا علم سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) تقویم احوال البلدان۔ اسی طرح تقویم احوال البلدان اگر صرف اجتماعی اور ذاتی معاملات سے متعلق ہو تو سیاسیات میں شامل نہیں کی جا سکتی۔ بے شک اسکا وہ حصہ جو محض سیاسی اعداد وشمار مہیا کرتا ہے سیاسیات میں شامل ہے۔

(ج) معاشیات۔ علم معاشیات دولت کے پیدا کرنے اسکے استعمال اور تقسیم سے متعلق ہے لہذا اسکا وہ حصہ جو صرف سلطنت سے متعلق ہے اور حکومت کی دست اندازی یا عدم اس کے اثر سے بحث کرتا ہے سیاسیات میں شامل ہے اور باقی تحقیقات جو عامۃ الناس کی معاشی حالت سے متعلق ہے سیاسیات کا جزو نہیں ہے۔

(د) اجتماعیات۔ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کی زندگی کا مطالعہ سیاسیات نہیں کہا جا سکتا۔ تقسیم علوم کے اعتبار سے سیاسیات اجتماعیات کا ایک خاص جزو ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا مطالعہ کرتا ہے جہانتک اسکی مدنی اور اجتماعی زندگی کا تعلق ہے۔

سیاسیات اور اخلاقیات۔ سیاسیات اور اخلاقیات کا تعلق نہایت واضح ہے۔ دونوں علوم انسانی طرز عمل کی تحقیقات کرتے ہیں۔ اور دونوں علوم انسانی طرز عمل کا مطالعہ اس غرض سے کرتے ہیں کہ اسکا تعلق انسانی خیر و فلاح کے نصب العین سے معلوم کریں۔ یہ دونوں اجتماعی تعلقات پر اپنا اثر ڈالتے ہیں اور خود بھی ان تعلقات سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ انکا فرق صرف اتنا ہی ہے جتنا کہ قانون اور اخلاق میں فرق ہے۔ قانون کا تعلق اس طرز عمل سے ہوتا ہے جسکا تعلق خارجی ہو۔ یعنی چوری نہ کرو یا قتل نہ کرو وغیرہ احکام ان چیزوں کے متعلق ہیں جو انسان

عمل سے متعلق ہیں۔ اخلاق نہ صرف بیرونی اثرات و نتائج سے تعلق رکھتا ہے بلکہ انسان
کی نیت بھی اخلاق کے دائرہ میں ہے لہذا اخلاقی احکام بخلاف قانونی احکام کے۔
(علاوہ چوری نہ کرو" اور قتل نہ کرو" کے) انسانی قوت ارادی پر بھی نافذ ہو سکتے ہیں۔
اخلاق کہتا ہے کہ برائی کا خیال بھی نہ کرو" بیہودہ خیالات میں نہ پڑو" وغیرہ

قانون مجبوراً انسان کو شراب نوشی سے باز رکھ سکتا ہے جیساکہ امریکہ میں جبریہ شراب نوشی بند کر دی گئی ہے۔ مگر اہل امریکہ کو اس برائی کے خیال سے باز نہیں رکھ سکتا ہے۔ جو نہایت سرگرمی سے شراب سازی خفیہ طور پر کرتے ہیں۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیاسیات انسان کے افعال ظاہری سے شروع ہوتا ہے اور سیاسی۔ قانونی اور مدنی تنظیم پر غور کرتا ہے تاکہ ہر شخص کی حالت بہتر ہو اور وہ اس خیر و فلاح کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ اخلاقیات انسان کے اندرونی یا نفسی پہلو سے شروع ہوتا ہے اور اُس صورت کو پیش نظر رکھتا ہے جس سے کہ انسانی خیر و فلاح اُسکی ضروریات اور فطرت انسانی کے حقوق حاصل ہوں۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیاسیات سے پہلے اخلاقیات کا ہونا ضروری ہے۔ جمہوریہ افلاطون کو دیکھتے تو معلوم ہوگا کہ وہ کتاب جتنی سیاسی ہے اتنی ہی اخلاقی بھی ہے۔ اسی طرح ارسطو بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ میری کتاب اخلاقیات صرف تمہید ہے علم سیاسیات کی جو اُس نے بعد میں تحریر کی گئی ہے۔

اجمال۔ | لہذا علم سیاسیات میں جن مسئلوں سے عموماً بحث کی جاتی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔ سلطنت کا تخیل اُسکی بنیاد اُسکے خاص عناصر (ملک و ملت) اُسکی ترقی اور نصب العین

Stat defined

نظام حکومت کے اقسام حاکم و محکوم کے فرائض اور حقوق ممالک غیر کے اثرات اور اُن ممالک کی قوتوں سے توازن وغیرہ اور اس علم کے ماتحت دو خاص علوم یعنی قانون عام اور سیاست ہیں جنکا ذکر بعد میں کیا جائیگا۔

سیاسیات کی تقسیم (سیاسیات خصوصی۔ سیاسیات عمومی)

سیاسیات بلحاظ اپنے دائرہ تحقیق کے دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسکا حلقہ تحقیق وسیع کر دیا جائے تو سلطنت کے عالمگیر تخئیل پر سیاسیات کی بنا ہوگی اور اسکا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوگا جتنا کہ انسانیت کا ہے اس حصّہ کو ہم سیاسیات عمومی کہینگے۔ لیکن اگر سیاسیات کا حلقہ تحقیق صرف ایک ملّت یا ایک ہی سلطنت تک محدود رہے تو اُسے ہم سیاسیات خصوصی کہینگے۔ مثلاً اگر صرف سلطنت برطانیہ۔ یا جمہوریہ فرانس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ مخصوص علم ہوگا۔ (یعنی سیاسیات خصوصی)۔

سیاسیات عمومی کی بنیاد تاریخ عالم پر ہے

سیاسیات عمومی کے متعلق اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ محض خیالی ڈھانچہ ہے لیکن یہ خیال اُس وقت غلط ہو جاتا ہے۔ جب عام نتائج اسطرح اخذ کئے جاتے ہیں کہ خیال (یعنی فلسفہ) کے ساتھ ساتھ تاریخ عالم سے حقیقی نتائج اخذ ہوں یعنی سلطنت کا مطالعہ تاریخی اور فلسفی (دونوں) طریقوں سے متفقہ طور پر کیا جانا ضروری ہے۔ نہ فلسفہ تاریخ کو چھوڑ سکتا ہے نہ تاریخ فلسفہ سے دست بردار ہو سکتی ہے

سیاسیات خصوصی سے پہلے سیاسیات عمومی کا ہونا نہایت ضروری ہے جسطرح کسی قوم کے خاص طرز عمل کے متعلق اسکا مان لینا ضروری ہے کہ انسانی فطرت بحیثیت مجموعی ہر جگہ یکساں ہے۔ لہذا سیاسیات خصوصی کسی خاص قوم کی تاریخ پر زور نہیں دیتا بلکہ تمام سلطنتوں اور ملتوں کے مختلف اور ضروری عناصر پر نظر ڈالتا ہے۔ عالمگیر

تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ کس طرح انسان نے ابتدائے عالم سے اب تک سیاسی ترقی کی ہے جس طرح انسان اور اُس کی تاریخ حقیقی ہے اُسی طرح سیاسیات عمومی بھی حقیقت سے قریب ہے اور صرف خیالی اور فلسفی نظریات کا مجموعہ نہیں ہے۔

کون سی نسلیں اور زمانے اس علم کیلئے ضروری ہیں۔

اس علم کے لئے نہ تو کل نسلیں ضروری ہیں (جیسے حبشی یا امریکن یا سُرخ نسل) نہ ہر زمانہ کی تاریخ فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ چونکہ ہمیں موجودہ نظام سلطنت کے ارتقا کا بیان کرنا ہے لہذا اُن اقوام و ملل کی تاریخ سود مند ہو سکتی ہے جو آزاد و مہذب سیاسی زندگی بسر کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں۔ لہذا سیاسیات عمومی کے لئے زمانہ قدیم اور زمانہ وسطےٰ کی تاریخ صرف مقابلہ کے لئے مطالعہ کی جائیگی تاکہ موجودہ سلطنتوں کے ارتقا کو صاف صاف سمجھا جا سکے۔ اور اُن اصولی تخیلات اور مشترکہ نظامہائے سلطنت پر جو اس زمانہ میں موجود ہیں روشنی پڑیگی

Ther are two kinds of

باب ثانی

سلطنت کا تخیّل

مقالہ اوّل۔ سلطنت کا تخیّل

ہم گذشتہ فصل میں دیکھ چکے ہیں کہ فلسفہ اور تاریخ کے ذریعہ سے سیاسیات کا مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔ تاریخ سے سلطنت کا حقیقی تصور ہوتا ہے۔ فلسفہ سے سلطنت اپنی عظمت اور کمال ترقی کی حالت میں خیال کے سامنے آتی ہے۔ سلطنت کا وسیع تخیل اسوقت ہوتا ہے جب کئی سلطنتوں کے تاریخی عروج و زوال پر غور کیا جائے اور انکی حالت کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جائے۔ اسی طرح سلطنت کا بلند ترین تخیل انسانی فطرت کی سیاسی بلند آہنگی اور طاقت نشو نما کو ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ نے لاتعداد سلطنتوں کو صفحۂ دنیا پر بنایا اور مٹایا ہے لہذا تاریخ کے جمع کردہ سامان کو نظر غور سے دیکھا جائے تو سلطنت کی وہ حالتیں جو ضروری ہیں اور کم و بیش ایک دوسرے میں موجود ہیں ظاہر ہو جائینگی

سلطنتوں کی خصوصیات از روے تاریخ

(۱) ملت۔ سلطنت کے لئے ایسی انسانی سوسائٹی کا ہونا ضروری ہے جو بحیثیت ملت کے ہو ۔۔ کسی مجمع یا گروہ کو سوسائٹی نہیں کہہ سکتے جب تک اُن افراد کا اخلاقی و مادی نصب العین متحد نہ ہو اور وہ متحدہ خاندانوں اور افراد پر مشتمل نہوں۔ لیکن سلطنت میں انسانی آبادی کی تعداد مقرر کرنا سخت غلطی ہے۔ یونان میں چھوٹے چھوٹے متعدد شہر تھے جو موجودہ زمانہ کے اعتبار سے معمولی قصبوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں مگر وہ مدنی (یا شہری) سلطنتوں کے نام سے موسوم تھے اس لحاظ سے موجودہ مذہبی

بلاشبہ سلطنت کے لئے آبادی کی کثرت کی ضرورت ہے۔

(۲) وطن | سلطنتوں کی زندگی کا دوسرا ضروری عنصر وطن ہے چونکہ بغیر مقبوضہ ملک اور ملت کے سلطنت کا ظہور نہیں ہوتا۔ خانہ بدوش اقوام میں حالانکہ سخت قوانین مرائج ہیں اور انکی وہ پابندی کرتے ہیں۔ انکی خاص تہذیب اور خاص روایات ہوتی ہیں۔ مگر وہ سلطنت اس وجہ سے نہیں کہلا سکتیں کہ انکی زندگی اکثر اشیاء ترقی و تہذیب مثلاً فنون لطیفہ و ادب۔ تجارت و زراعت کرنے سے مانع ہوتی ہے۔

(۳) اتحاد عمل | تیسری خصوصیت اتحاد عمل ہے۔ اندرونی طور پر سلطنت کے کئی حصے ہونا ممکن ہیں جو بذات خود سلطنت کہے جا سکتے ہیں (مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ریاستیں) مگر اندرونی نظام میں اتحاد عمل اور اتحاد مقصد اور بیرونی قوتوں کے سامنے اظہار یکجہتی جب تک نہ ہوگا سلطنت قائم نہ ہوگی۔

(۴) حاکم و محکوم کا فرق | تمام سلطنتوں میں حاکم و محکوم کا فرق ہے خواہ وہ انتہائی جمہوریت ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً فرانس کی مجلس ملیہ بحیثیت مجموعی حاکم کے ہے اور افراد قوم محکوم ہیں۔ یہ امتیاز نہایت ضروری ہے۔ جہاں یہ فرق باقی نہیں رہتا اور ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے لگتا ہے۔ وہاں بغاوت کا رونما ہونا ضروری ہے اور سلطنت کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اشتراکیین اس نقطہ کے منکر ہیں مگر اسکا انکار گویا سلطنت کے قیام سے انکار کرنا ہے۔ موجودہ روس میں جو حالت ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ صرف اجتماعی اتحاد ہی نہیں ہے بلکہ حاکم محکوم کا فرق صاف ظاہر ہے۔

(ھ) سلطنت ذی حیات ہستی ہے

جرمن مقننوں کو اس کا فخر حاصل ہے کہ انھوں نے سلطنت کو مردہ مشین نہیں سمجھا بلکہ اس کو زندہ نظام سمجھا۔ تصویر محض سیاہی اور سفیدی کی یکجا ہونے کو نہیں کہتے نہ اینٹ اور چونے کا مجموعہ عمارت کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ملت انسانی گروہ کو نہیں کہتے نہ سلطنت بیرونی قواعد کا مجموعہ ہو سکتی ہے۔

سلطنت قدرتی جاندار ہستیوں کی مانند ایک ذی حیات ہستی ہے۔ یاد رکھئے کہ لفظ "مانند" استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ قدرت نے جسطرح اور جاندار مخلوق پیدا کی ہیں اسطرح سلطنت ظہور میں نہیں آئی بلکہ سلطنت انسانی محنت و مشقت کا ثمرہ ہے۔ سیاسی زندگی کی ابتدا انسانی فطرت میں مضمر ہے اور اسکی ہستی قدرتی زندہ ہستیوں کا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیوانات و نباتات کی سی زندگی (خوراک تلاش کرنا۔ استعمال کرنا بڑھنا بچے پیدا کرنا) کے تصور کے بجائے مندرجہ ذیل خصوصیات زندگی ہماری مد نظر ہیں۔

(ا) ہر جاندار روح اور جسم کے مجموعہ کا نام ہے یعنی مادی اجزا اور زندہ روح۔

(ب) اگرچہ ہر جاندار مکمل ہستی ہے تاہم اسکے متفرق اجزا خاص خاص اغراض و مقاصد کو پورا کرنے اور متضاد افعال کے سرانجام دینے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور یہ افعال نفس جاندار کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

(ج) ہر جاندار اندرونی ترقی کے ساتھ ساتھ بیرونی ترقی بھی کرتا ہے لہٰذا مندرجہ بالا خصوصیات سلطنت میں مندرجہ ذیل طریقہ سے پوری پوری موجود ہیں۔

(ا) سلطنت میں روح و جسم۔ قوت ارادی و قوت عمل متحد و متفق ہیں مربوط ہو کر

اگر افرادِ قوم کی مجموعی قوت ارادی قوتِ عمل کی وسطی لی جاوے تو وہی سلطنت کی سطح کہی جاسکتی ہے۔ جماعت حکمران سر ہے۔ نظام حکومت سلطنت کا جسم ہے۔ اور جس طرح ہر شخص کی افتادِ طبع دوسرے شخص سے کسی قدر الگ ہوتی ہے یہی حال مختلف سلطنت کے الگ الگ طرزِ عمل کا ہے۔

(ب) یہ ظاہر ہے کہ سلطنت کے متفرق حصے الگ الگ کام سرانجام دیتے ہیں۔ یہ محض بے جان مشینوں کی طرح اپنے افعال سرانجام نہیں دیتے بلکہ حیات عامہ کی ضروریات کے لحاظ سے اپنے افعال میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں۔ وہ زندہ ہستی کی طرح زندہ ہستیوں کی خدمت کرتے ہیں۔ شعبۂ سلطنت محض مشین کی طرح کام کرنا شروع کرتا ہے تو محض جسم بے جان کی طرح صرف ایک ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ تباہی و بدنظمی رونما ہوتی ہے۔

(ج) ملت اور سلطنت کی ترقی بالکل دیگر جانداروں کی طرح تو نہیں ہوتی مگر ان سے کسی قدر ملتی جلتی ہوتی ہے۔ بعض مدبرین نے یہ سخت غلطی کی ہے کہ ملتوں کے بچپن۔ جوانی اور اور زوال کو بالکل جانداروں کے بڑھنے اور فنا ہو جانے سے تشبیہ دی ہے۔ اور دوسری ذی حیات ہستیوں کی طرح خاص وقت اور درجے سلطنت کی ترقی وزوال کے لئے بھی مقرر کئے ہیں۔ مگر وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ افرادِ ملت کی طبائع اکثر اس امر کا باعث ہوسکتی ہیں کہ سلطنت کی معمولی رفتارِ ترقی میں غیر معمولی ترقی یا رکاوٹ پیدا کر دیں۔

روحانی و اخلاقی ہستی تاریخ سے سلطنت کا ذی حیات ہستی ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلطنت ایک روحانی و اخلاقی جاندار ہستی ہے جو ادنیٰ نباتات و حیوانات سے بالاتر ہے۔ یہ ایک زبردست جسم ہے جسکی روح قومی جذبات و محسوسات کو جذب کرنے کے بعد انھیں قوانین کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ سلطنت کی ہستی اپنی ذاتی قوت ارادی کا اظہار مختلف صورتوں سے کرتی ہے۔

سلطنت کے عزت و وقار کو قائم رکھنے آزادی اور دوسرے قومی حقوق کے واسطے ہمیشہ ہر زمانہ کے بہترین افراد نے اپنا جان و مال قربان کیا ہے۔ ہر فرد قوم قومی فتح و شکست غم و مسرت سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر روحانی شخصیت کا سلطنت میں وجود نہ ہوتا تو ملک و ملت کی محبت ناقابل قیاس ہو جاتی۔

مختصر یہ کہ تاریخی حیثیت سے سلطنت کا تصور مندرجہ ذیل ہے:۔ "سلطنت انسانوں کے اجتماع کا نام ہے جو کسی خاص حصہ ملک میں متحدہ اخلاقی و روحانی شخصیت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے" یا زیادہ اختصار سے "کسی خاص ملک کی ملی شخصیت کو جو سیاسی نظام کے ساتھ ہو سلطنت کہتے ہیں"

سلطنت کا تخیل از روئے فلسفہ

تاریخ صرف حقیقی سلطنتوں کے مطالعہ پر قناعت کرتی ہے۔ مگر فلسفہ اپنی عمیق نظری سے سیاسی ضروریات پر غور کرتا ہے۔ ارسطو کا قول ہے کہ انسان ایک سیاسی

حیوان ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قومی خصوصیت کی وجہ سے نہیں بلکہ فطرۃ انسان
سیاسی زندگی بسر کرنے اور سلطنت قائم کرنے کے لئے مجبور ہے۔ ہر جگہ فطرت انسانی
تقریباً یکساں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو قوم ملک و رنگ کے حدود سے
گزر کر بلند تر قومیت کا معیار بنانے کی خواہش ہے جس میں کل بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی
ملت اور واحد سلطنت کے شامل ہوں انسان بحیثیت قوم۔ اور کل دنیا کے انسان مجموعی
طور پر بحیثیت ملت سمجھے ہوں اگرچہ ابتک فلسفی کے اس سیاسی نصب العین کے حصول
میں صدیوں کی ضرورت ہے۔ تاہم گذشتہ تاریخ نے اس تخیل کو وقتاً فوقتاً ظاہر کیا ہے۔
لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایسی تمام کوششیں ابتک ناکامیاب رہیں۔ مگر اس سے یہ
نتیجہ نہیں نکلتا کہ مقصود ناقابل حصول ہے مذاہب عالم نے اس بات کی ہمیشہ کوشش
جاری رکھی کہ کل دنیا متحدہ طور پر ایک ہی سلطنت بن جائے۔ سکندر اعظم نے سب
سے پہلے اس کوشش میں سرگرمی دکھائی۔ مگر اسکی بے وقت موت نے ایسی بین الاقوامی
سلطنت کے قیام کو روک دیا۔ رومیوں کی کوشش کسی قدر زیادہ مستحکم و کارگر ثابت ہوئی
سکندر اعظم نے مختلف اقوام کو مخلوط کر کے سلطنت قائم کرنی چاہی تھی مگر رومیوں
نے بخلاف اسکے اپنی اعلیٰ تربیت و تہذیب کو دنیا بھر کی مفتوح قوموں میں رائج کرنا
شروع کیا بالفاظ دیگر رومیوں کی یہ غلطی تھی کہ سب کو رومی بنانا چاہا۔ چونکہ کوئی
قوم اتنی وسیع نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی دیگر اقوام کو اپنے اندر جذب کر سکے اسلئے آخرکار
ٹیوٹن اور جرمن نسل کے لوگوں نے صدیوں لڑنے جھگڑنے کے بعد رومیوں کی

سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ اسکے بعد مسلمانون نے اپنی آزادو فطری سے ایسی ہی سلطنت قائم کرنی
چاہی مگر مرکزی حکومت کو ترک کرکے الگ الگ سلطنتون کے قیام نے اس تخیل کو اصلی صورت
مین ظاہر ہونے دیا۔ نپولین نے کل یورپ کو ایک متحدہ سلطنت کی صورت مین اسطرح قائم
کرنا چاہا کہ چھوٹی چھوٹی سلطنتون کی ہستی قائم رہے۔ اور کل یورپ بحیثیت ایک متحدہ
بین الاقوام سلطنت کے ہو جائے جسکا سردار فرانس ہو۔ اس کا نتیجہ بھی حسب خواہش نہ
نکلا اور انگریزی قوم نے مخالفت کرکے اس خیال کو شکست دے دی اکبر اعظم نے ہندوستانکی
کل نسلون اور قومون کو مذہبی رنگ مین اپنی فراخدلی سے ملاکر قومی برادری پیدا کرلی تھی۔ مگر
اس خیال کی ترقی اسکے جانشین نہ کرسکے اور شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ کے بعد یورپین اقوام کی ریشہ
دوانیون اور مرہٹون و دیگر اقوام کی سرگرمیون نے اسکا بھی خاتمہ کردیا بہرحال زمانہ خود
رفتہ رفتہ انسان کو ایسی سلطنت بنانے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ مغرب مین تمام یورپ متحد
ہوکر مجلس بین الاقوام کی صورت مین ظاہر ہوا ہے لکاش یہ حقیقت مین مجلس بین الاقوام
ثابت ہو۔ مشرق مین کل ایشیائی اقوام یکجہتی و اتحاد عمل کی روز افزون ضرورت محسوس
کر رہی ہین جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مستقبل قریب مین جلد وہ مبارک دن آنے والا ہے
جب دنیا کی کل اقوام واحد سلطنت کی صورت مین ظاہر ہونگی اور نسلی و قومی امتیازات
انسانی اور فطرتی اصولون کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑیگا ـلہ

ـلہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہر زمانہ کے شاعر اور مذہبی پیشوا اس انسانی یکجہتی پر ہی زور دیتے چلے آرہے ہین
غالب بھی کہتا تھا پیشگوئی چاہتا ہے۔ موجودہ زمانہ مین بابی تحریک کا بھی نصب العین ہے اور ہندوستانکی
کانفرنس کی تمدنی جذبات سے مملو ہے۔

یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایسی حکومت چھوٹی ریاستون کے حقوق اور انفرادی آزادی کو پامال کر دیگی۔ مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی حالت مین سلطنت کا قیام ممکن ہو جائیگا۔ امن اور انفرادی آزادی اور اخلاقی و روحانی ترقی کے بغیر فلسفہ کا یہ مطمح نظر ناممکن الحصول ہے۔

انجام کار ہم اس نتیجہ پر پہنچے مین کہ سلطنت بنی نوع انسان کے باقاعدہ و منتظم اتحاد کا نام ہے۔

مقالہ دوم۔ تخیل سلطنت کا ارتقا

گذشتہ فصل مین سلطنت کو دو طرح سے دیکھا گیا ہے یعنی اول تو تاریخ سے سلطنت کا تخیل اخذ کیا گیا۔ اُسکے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ فلسفہ اس تخیل کے متعلق کیا معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت مین کیا خصوصیات ہوتی ہین۔ اور صرف اُن باتون کو بتاتی ہین جو مختلف سلطنتون مین موجود ہین اور جنکا ہونا سلطنت کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ فلسفہ نے فطرت انسانی کی اُس خواہش کو بتایا ہے جو انسان کے سیاسی تخیل کی بلند ترین حد ہو سکتی ہے۔ اب فلسفہ اور تاریخ کی شہادت اس طرح تمہید کی جاتی ہے کہ زمانۂ قدیم۔ زمانۂ وسطی اور زمانۂ موجودہ کی تاریخ کو دیکھین اور اس تخیل کی درجہ بدرجہ ترقی کو دیکھ کر موجودہ حالت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(۱) زمانۂ قدیم

تان | زمانۂ قدیم کی اُن سلطنتون کا حال تقریباً پردۂ اخفا مین ہے جو یونان سے ل صفحۂ تاریخ پر ترقی پانے کے بعد فنا ہوگئین۔ لہٰذا ہم یونان سے ابتدا کرتے ہین نان قدرتی طور پر مختلف حصون مین تقسیم تھا۔ اور اُن مین چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہر ایک شہر بجائے خود ایک سلطنت تھا اور وہ بڑے شہرون کے اثر سے

قطعی آزاد تھا۔ ان مین اکثر سلطنتین اتنی چھوٹی تھین کہ موجودہ زمانہ کے قصبہ اُس سے زیادہ آبادی رکھتے ہین۔

افلاطون | افلاطون نے اپنی کتاب "جمہوریہ" مین عدل کی تشریح کی ہے۔ یونان کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس مین سیاسیات کی بحث کی گئی ہے۔ مگر یہ کتاب اُتنی ہی اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہے جتنی کہ سیاسیات کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ یونانیون نے اخلاقیات کو سیاسیات کی تمہید سمجھ کر ان دونون کو قطعی ملا دیا تھا۔ اور دونون مین بہت کم فرق رکھا تھا۔

ارسطو | ارسطو نے اپنے اُستاد کی بہت کچھ تقلید کی اور صاف صاف بتا دیا کہ اخلاقیات صرف سیاسیات کا مقدمہ ہے۔ اور انسان کی یہ تعریف بتائی کہ یہ "سیاسی" حیوان ہے۔

چونکہ یونانیون کے شہرون ہی تک اُن کی سلطنت محدود تھی اس وجہ سے اُنکا تخیل سلطنت نہایت محدود تھا۔ اور وہ سلطنت کی حدود اتنی ہی وسیع سمجھتے تھے جتنی کہ موجودہ کسی انجمن کی ہوتی ہین۔ اُن کی مجلس ملیہ مین ہر شخص شریک ہو سکتا تھا۔ اور انسانون کی کثیر تعداد سلطنت مین اس وجہ سے شامل ہو سکتی تھی کہ ایسا کرنے سے اُن سب کا وقتاً فوقتاً (ہر ماہ مین ایک یا ایک سے زیادہ دفعہ) جمع ہونا ممکن تھا یہ مختلف شہر دو دفعہ بیرونی حملہ کے خوف سے آپس مین متحد ہوئے۔ مگر یہ اتحاد حقیقی نہ تھا اور بہت جلد اُنکا اتحاد ختم ہوگیا۔ سکندر اعظم نے جب عالمگیر فتوحات شروع کین تو یونانیون کا تخیل مدنی سلطنت سے ترقی کر کے کسی قدر وسیع ہوگیا تھا مگر یہ

یاد رکھنا چاہئے کہ یونانیون نے بجائے اسکے کہ اپنی طاقت اور تلوار سے وسیع ملکون پر قبضہ کیا ہو اپنے تمدن اور تہذیب۔ علم و فلسفہ سے دنیا پر فتح پائی اور سلطنت کے وسیع تخیل اور شہنشاہیت کے شروع ہوتے ہی سکندر اعظم نوعمری کی حالت مین مر گیا تعمیری کام شروع ہونے سے پہلے سکندر کا مرجانا بہت مضرت رسان ثابت ہوا اور اُس نے جو فتوحات کی تھین وہ بہت جلد مرکزی سلطنت سے علیحدہ ہو کر آزاد ہو گئین

روما | زمانہ قدیم کی دوسری سلطنت روما ہے۔ اس سلطنت نے ایک شہر سے شروع ہو کر اطالیہ پر اور پھر یورپ افریقہ کے وسیع ممالک پر اپنی شہنشاہیت پھیلا دی۔ رومیون نے سلطنت کے حقیقی تخیل کی بنا ڈالی سب سے پہلے جس قوم نے قانون اور اخلاق کو الگ الگ درجہ دیا وہ رومی ہی تھے۔ اس سلطنت نے قانون کو رفتہ رفتہ ترقی دی اور ملت کے اصلی معنون کو سمجھ کر اپنے ملی حقوق کی نگہداشت کی۔ بخلاف اسکے یونانیون مین ملی احساس کبھی اس ترقی اور وضاحت کے ساتھ نہین پیدا ہوا۔ نہ یونانیون نے قانون و اخلاق مین صریح امتیاز ظاہر کیا۔ رومیون نے دنیا مین عالمگیر شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی اور سلطنت کے تخیل کو روما یا اطالیہ تک محدود نہین رکھا بلکہ اسکی بنیاد عالمگیر سلطنت کے تخیل پر رکھی۔ لہذا مجملاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ رومیون نے مندرجہ ذیل طریقہ سے سلطنت کے تخیل کو سمجھا۔

(۱) قانون اور اخلاق مین امتیاز کیا۔

(۲) ملی تخیل کی بنا ڈالی۔ اور

(۴) عالمگیر سلطنت کی ابتدا کی۔

ہندوستان | آریوں نے ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد یہاں جو سلطنت قائم کی تھی ابتدا ہی سے مذہبی تھی رعایا اور بادشاہ میں جو تعلق تھا وہ الٰہی احکام کی پابندی میں سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے نہ تو بادشاہ نہ رعایا کو کوئی حق حاصل تھا کہ وہ کوئی قانون بنا کر جاری کر سکے۔ قوانین جاری ہوتے تھے مگر سب بیرونی طاقت (خدا کے یا دیوتاؤں) کے احکام کی پابندی میں ہوتے تھے قانون۔ اخلاق اور مذہب ایک دوسرے سے الگ نہ تھے اور مذہبی فرقہ کے اثر میں رہ کر راجہ کو ہر ایک کام کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح یہ ایک قسم کی آئینی حکومت تھی جس میں راجہ صدر اور برہمن مجلس علیہ کے رکن ہوتے تھے۔ ایران میں بھی قریب قریب یہی حالت تھی اور وہاں کے مذہبی طبقہ سے بادشاہ کے اختیارات محدود ہوتے تھے۔ لہٰذا ایسا کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ قدیم آریوں نے آئینی حکومت کی بنا ڈالی۔

ذاتوں کے موروثی ہونے کا اثر | اگر ہندوستان میں ذاتوں کی تفریق رفتہ رفتہ زیادہ ہوتی گئی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ پیدائشی ہوگئیں۔ اس تفریق نے سلطنت پر بہت بڑا اثر ڈالا اور اگرچہ سلطنت کی بنیاد مضبوط ہوگئی مگر اس کے لئے ترقی کرنا ناممکن ہوگیا۔ وہ اپنی قدیم حالت سے آگے قدم نہ بڑھا سکی۔ اور ملی یکجہتی کو سخت صدمہ پہنچا۔

(ب) زمانہ وسطیٰ

سلطنت مذہبی | زمانہ وسطیٰ میں تقریباً کل دنیا کی سلطنتیں تاریک زمانے کے [illegible]

کی طرف آرہی تھیں۔ ایشیا اور تقریباً پورے یورپ میں عیسائی مذہب پھیل چکا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ پادری اپنا اثر بادشاہوں کے خلاف الگ قائم کرنا چاہتے تھے اور بادشاہ اور امیر اپنی حکومت واقتدار الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح دوگونہ سلطنت کی کشمکش جاری تھی دوسری طرف کچھ زمانہ سے مذہب عیسوی میں تجدید شروع ہوئی اور پراٹسٹنٹ فرقہ نے رومن کیتھولک (یا قدیم مذہب عیسوی) کے خلاف تبلیغ و اشاعت شروع کی۔ اسی زمانہ میں کچھ تحریکیں پہلو بہ پہلو پورے یورپ میں موجود تھیں۔ اور ان تحریکوں ہی کی وجہ سے انقلاب فرانس نے یورپ کی حالت کو قطعی تبدیل کر دیا۔

انقلاب کی وجوہ — ساتویں صدی مسیحی میں اسلام کی تعلیم ایشیائی ممالک سے شروع ہوئی

(۱) اسلام — اور مسلمانوں کی فتوحات کے ہمراہ ممالک یورپ اور افریقہ تک اسلام کے اصول عیسائیوں کے کانوں تک پہنچنے شروع ہوئے۔ اسلامی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ عیسائیوں کے مذہبی اور سیاسی تخیلات میں انتشار اور ہیجان عظیم پیدا ہوگیا۔ اور اکثر سمجھدار نصرانی (خصوصاً لوتھر) اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اپنے مذہب کے بعض بیہودہ اثرات سے اسے قطعی پاک کردیں۔

یونانی فلسفہ — فلسفہ یونان کو مسلمانوں نے دوبارہ زندہ کیا۔ اور اُس کے ترجمے نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی جاری ہونے شروع ہوئے اور مذہبی انقلاب کے علاوہ اخلاقی تجدید بھی شروع ہوئی۔

رومی قانون — اسلامی تعلیم۔ یونانی فلسفہ کے ساتھ قدیم قانون روما سے زمانہ وسطیٰ کے

یورپ کو بہت زیادہ مدودی۔ اور ملّت و سلطنت کا نیا احساس شروع ہوا۔ مذہب کا درجہ سب سے افضل مانا جاتا تھا مگر تجدید کے بعد مذہب کو سیاسیات سے قطعی الگ کر دیا گیا اور مذہب و قانون کی دو عملی ختم ہو گئی اور زمانہ جدید کی ابتدا ہوئی۔

(ج) زمانہ جدید

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے بعد دُنیا میں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ اور توہم پرستی اور جاہلیت سے دُنیا نے نجات پائی۔ غلامی اور سرمایہ داروں کے خلاف اس مذہب نے سخت جدوجہد کی اور حقیقی معنوں نے موجودہ اشتراکی تحریک کو مضبوط بنیاد پر قائم کیا۔ ہر شخص کی آمدنی میں سے خاص رقم بیت المال ملّیہ کی ملک مقرر کی گئی اور سود خوری قطعی حرام کر دی گئی۔ مساوات بین الملل اور غیر متعصبانہ علوم کی تعلیم عام ہو گئی۔ عورتوں کو معزز و ممتاز درجہ دیا گیا اور سیاسیات کے حقیقی نظام جمہوری کو قائم کر کے تمام عالم کو ایک برادرانہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا۔ ایشیا سے یورپ تک علمی انقلاب پیدا کر دیا اس انقلاب عظیم نے حریت اور مساوات کے صحیح معنی ملل عالم کے ذہن نشین کر دئیے جس سے یورپ میں انقلاب فرانس اور انقلاب انگلستان ہوا۔ اور جدید [illegible] میں آئینی جمہوریتوں کی مستقل بنیاد پڑی۔

انقلاب فرانس شاہی سلطنت کے خلاف سب سے پہلے فرانس نے صدائے احتجاج بلند کی اور کل یورپ کی آنکھیں کھل دیں۔ یہ زمانہ نہایت سخت تھا اور ملل یورپ کی زندگی کا

سوال درپیش تھا۔ اس سخت تجربہ سے گزرنے کے بعد فرانس نے جمہوریت قائم کرلی اور اس کی پیروی میں انگلستان ۔ جرمنی ۔ سوئٹزرلینڈ اور دیگر ممالک نے آئینی اور جمہوری نظام سلطنت بنالیا۔ اور ممالک متحدہ امریکہ نے بھی پرچم آزادی و جمہوریت کو بلند کیا۔

سلطنت کا روحانی تخیل

جنگ عظیم کے بعد "زمانۂ حال" شروع ہوتا ہے۔ اور ملل عالم کے سامنے ہندوستان نے سلطنت کا روحانی تخیل پیش کیا ہے۔ یہ فلسفہ کے تخیل سلطنت کا بہترین نمونہ ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ بغیر ذی حیات ملت کے سلطنت کا قیام ناممکن ہے۔ فلسفہ کہتا ہے کہ فطرت انسانی عالمگیر شاہنشاہیت چاہتی ہے مگر فلسفہ کا اعلیٰ ترین نصب العین وہ ہے جو آجکل ہندوستان کل دنیا کے سامنے پیش کررہا ہے یعنی ہر ملت و قوم کو دوسری سلطنتوں کے اثرات سے قطعی آزاد ہونا چاہئے اور آزاد ملل عالم کا اس طرح سے اتحاد قائم ہو جس میں ہر ملت و قوم پورے طور پر ترقی کرسکے اور کمزور اقوام کو انسانی ترقی کا پورا موقع ملے۔ اس انقلاب کا مغربی شہنشاہیت پر بہت اثر پڑا ہے اور جنگ کے بعد سے ایشیا اور مصر کی محکوم اور نیم آزاد قوموں میں آزادی اور زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

باب ثالث

منطق اور اخلاقیاتِ سیاست

مقالہ اوّل۔ سیاسی اصطلاحات

زبان اُردو ہر ایک زبان عالم ارتقا میں ہے۔ اور کوئی زبان ایسی نہین جسمین انسانی جذبات و خیالات مکمل طریقہ سے ظاہر کئے جاسکین۔ اکثر تشبیہ، استعارہ، رمز و کنایہ سے خیالات کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ اُردو زبان اِس لحاظ سے دُنیا کی دوسری زبانون پر فوقیت نہین رکھتی۔ تاہم اس زبان کے ماخذ اتنے وسیع اور گوناگون ہین کہ نئے الفاظ بنالینا اِسکے لئے بہت آسان ہے۔ اس وسعت نے جو خرابی پیدا کردی ہے وہ بھی اتنی ہی وسیع ہے۔ اور موجودہ علمی مباحث مین خصوصاً کسی نئی اصطلاح کو مخصوص معنون مین استعمال کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا ابتدا ہی مین ہمارا فرض ہے کہ علمی اصطلاحات و تعریفات کو صاف اور واضح کردین۔ جب تک یہ نہ ہو جائے کہ ہم کسی علم کو علم نہین کہہ سکتے چونکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی لفظ مختلف معنون مین استعمال ہوتا ہے۔ عوام مین کچھ معنی ہوتے ہین خواص مین کچھ۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اصطلاحات کے صحیح اور جامع معنی بیان کردینے کے بعد آئندہ اُن کے استعمال مین احتیاط کی جائے۔

اصطلاحات کا غلط استعمال۔ عوام کی مہربانی خطیبون کی گرمیٔ سخن۔ اخبارات و تراجم کی خامیون کی وجہ سے سیاسی اصطلاحات عجیب اور بسا اوقات غلط معنون مین استعمال ہونے لگے ہین۔ حق۔ سوراج۔ حکومت۔ قوم۔ جرم۔ آزادی۔ اور اسی قسم کی بہت سی سیاسی اصطلاحات مقرر و محرر کے ذاتی نقطۂ خیال کی وجہ سے نئے رنگون مین

ظاہر ہوتی ہین - دوسری وجہ یہ ہے کہ بہت سی اصطلاحات کسی خاص زمانہ یا خاص نظام حکومت مین نئے معنی حاصل کر لیتی ہین - مگر وہی اصطلاحات دوسرے زمانہ یا نئے دور حکومت مین دوسرے معنون مین استعمال ہونے لگتی ہین - سیاسیات و اخلاقیات کی اصطلاحین بہ نسبت دیگر علوم کے زیادہ مستعمل ہوتی ہین چونکہ ہماری زندگی سے یہ علوم بہ نسبت دیگر علوم کے قریب تر ہین - اسی وجہ سے ان علوم کی اصطلاحات اکثر مختلف معنون مین استعمال ہونے لگتی ہین - تیسری زبردست خرابی اسوقت پیدا ہوتی ہے جب ایک قوم دوسری قوم یا ایک سلطنت دوسری سلطنت کی اصطلاحات کو جاننا چاہتی ہے - اور نئے خیالات کے لئے الفاظ جدیدہ کا اختراع شروع ہوتا ہے - موجودہ زمانہ مین مغربی اقوام کے بعض ایسے تخیلات مشرق مین رائج ہو چلے ہین جنکا مشرقی زبانون مین مشکل سے مترادف مل سکتا ہے -

سیاسی اصطلاحات کی دو بڑی قسمین کی جاسکتی ہین - اول وہ جو سب سے زیادہ عام اور ضروری ہین - دوسرے وہ جو اتنی ضروری نہین اور جنمین کثرت سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے - ان اصطلاحات کے لئے صرف چند اشارات بنائے جاسکتے ہین چونکہ انکی نہ مکمل فہرست لکھی جاسکتی ہے اور نہ ہر ایک کا الگ الگ استعمال لکھا جاسکتا ہے - البتہ اول الذکر اصطلاحات کا بیان کسی قدر تفصیل سے کیا جانا ضروری ہے -

۱ - سلطنت یا دولت

سیاسیات کا مرکزی تخیل سلطنت ہے - اور اگر ایک دفعہ اسکے صحیح معنی سمجھ لئے جائین

تو نہایت خطرناک غلطیون سے حفاظت ہوسکتی ہے - یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سلطنت (یا دولت) کا موجودہ تخیل اُسوقت تک پیدا نہین ہوا جب تک کئی سلطنتین پہلو بہ پہلو قائم نہین ہوئین - اور اُن مین سے ہر ایک نے اپنی ہستی - آزادی اور اتحاد کو دُنیا کے سامنے پیش نہین کیا - ان معنون مین کوئی سلطنت اُسوقت تک قائم نہین ہوتی جبتک کہ ایک سے زیادہ سلطنتین پہلو بہ پہلو قائم نہ ہوگئی ہون - مگر قیام سلطنت کے لئے ملت و ملک کا ہونا ضروری ہے - بغیر ان دو چیزون کے سلطنت قائم نہین ہوتی - اس کا مفصل بیان آئندہ باب مین کیا گیا ہے - مختصراً یہ کہ کسی ملک مین ایک یا ایک سے زیادہ اقوام کا ملت کے درجہ پر پہونچ جانے اور قانونی نظام حکومت قائم کرنے کو سلطنت کہتے ہین -

لفظ سلطنت کا عوام اکثر غلط استعمال کرتے ہین ایک حد تک قابل معافی ہے - مگر ماہرین سیاست اور مدبرین ملک اگر اسکا غلط استعمال کرین تو قابل افسوس ہے - بعض اوقات سلطنت کے یہ معنی لئے جاتے ہین کہ یہ حاکمون کی جماعت کا نام ہے - بسا اوقات سلطنت سے ملت مراد لی جاتی ہے - قانون بین الملل سلطنت کے اور کچھے معنی ہین یعنی یہ ایک چیز سمجھی جاتی ہے - جو چند خاص حقوق (یعنی اپنی مانند دوسری چیزون سے آزاد ہوتی ہے اور اسمین حکومت خود امتیازی قائم ہوتی ہے) رکھتی ہے -

۲ - حکومت

جب کوئی جنگجو قبیلہ کسی مُلک پر حملہ کرتا ہے تو وہ بذات خود ایک خاص تعلقات کا پابند ہوتا ہے - اگر یہ حملہ آور گروہ فطرتاً بغاوت پسند ہو اور حملہ کرنے سے اُسکی غرض

صرف لوٹ مار اور بدامنی پھیلانا ہو تو ایسی صورت مین کوئی سلطنت قائم نہیں ہوسکتی اور نہ ملی بیداری ہی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ مفتوح اقوام مین حکومت کی عادت پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ اِس لئے حملہ ہونے کے بعد حملہ آور اور مفتوح اقوام مین یہ عادات ترقی پا جاتی ہین۔

حکومت کی عادت سے ہمارا یہ مطلب نہین ہے کہ انسان کی تعداد کسی ایک شخص (یا چند افراد) کے تابع فرمان یا مطیع ہونے کی عادت رکھتی ہو۔ اس قسم کی اطاعت کی عادت اس صورت مین بھی موجود ہوسکتی ہے۔ جبکہ محکوم ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہون اور کوئی اندرونی اتحاد نہ ہو۔ ہمارا منشا یہ ہے کہ کسی ملت مین قانون کی پابندی کی عادت کا پیدا ہونا نہایت مشکل ہوتا ہے یہ عادت نئی ملت مین جلد پیدا نہین ہوتی۔ نظام ملت کے قیام مین خاص وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور فطرتاً کسی ملت کو پابند آئین وقانون بنانے مین سخت دشواریان پیش آتی ہین۔ یہ عادت مذہبی رسوم۔ اجتماعی روایات فوجی تواعد اور خاندانی جذبات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور سب سے آخیر مین اسکی بنیاد بین الملل رقابت اور مقابلہ سے ترقی پاتی ہے۔ قانون کی پابندی کی عادت سے قانون کی خواہش۔ بغاوت سے نفرت اور امن کے توڑنے والون کے خلاف پوری ملت مین غصہ اور عناد پیدا ہوجاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ قانون پوری ملت کی طرف سے نافذ ہوتا ہے اور اُسکے جاری کرنے اور بنانے والے وہ خود ہوتے ہین۔

٣ - قانون

حکومت اور قانون کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ مگر موجودہ تحقیق و تنقید نے دونون تخیلات مین کافی امتیاز اور فرق پیدا کر دیا ہے تاریخ شاہد ہے کہ قدیم زمانہ مین ایسی جماعتین موجود تھین جنمین حکومت کا قیام تو نہین ہوا تھا لیکن قانون موجود تھا بنی اسرائیل نے جب مصر سے ہجرت کی تو انکی یہی حالت تھی اور اگرچہ کوئی حکومت نہ تھی مگر قانون موسیٰ جاری تھا۔ اور یہ تو امر مسلمہ ہے کہ عرصہ تک حکومت قائم رہنے کے بعد قانون کا ظہور ہوا کرتا ہے لیکن دونون صورتون مین قانون کی خصوصیات موجود ہو سکتی ہین۔ حکومت کا صرف فعل ہوتا ہے کہ اُن قوانین کو قائم رکھے یا اُن مین ترمیم و تنسیخ کرتی رہے۔

روایات قدیم اور پُرانے دستور اکثر قانون کی صورت مین ظاہر ہوا کرتے ہین۔ اور اگر کوئی سلطنت کسی قوم پر اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد اُنکے قدیم قوانین کی جگہ اپنے جدید قوانین جاری کرے تو سخت مشکلات اور بعض اوقات انقلاب کا سامنا ہوجانا ضروری ہوجاتا ہے۔ سکندر نے مصر کے انتظام مین۔ رومیون نے اکثر مفتوحہ ممالک مین۔ اور مسلمان فاتحون نے اِس خطرے کو پورے طور پر محسوس کرلیا تھا اسی وجہ سے اُنھون نے اپنے قوانین کو بتدریج پھیلایا۔ اور مسلمانون نے تو نہایت ہی قلیل عرصہ مین ممالک مفتوحہ مین اپنا قانون و اخلاق پھیلا دیا جسکی وجہ یہ تھی کہ یہ قوانین مفتوحہ اقوام پر جبرًا نافذ نہین کیے جاتے تھے بلکہ اُنکو اپنے معاملات مین پوری آزادی دے دی جاتی تھی اور وہ خود اسلامی قوانین کو بہتر سمجھ کر انکے ماننے پر تیار ہوجاتے تھے۔

انگریزون نے آئرلینڈ مین اس حکمت عملی کے خلاف کارروائی شروع کی اور اُسکا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ بنگال مین تقسیم کرنے اور پُرانے قوانین کو توڑنے کی وجہ سے بغاوت کی سی حالت پیدا ہوگئی تھی۔ اسی طرح ہندوستان کی قدیم روایات کے خلاف جو قانون (مثلاً رولٹ ایکٹ۔ قانون اسلحہ) جاری کیا جاتا ہے اُس سے سخت بےچینی پیدا ہوجاتی ہے۔

لہذا قانون کے حقیقی معنی یہ ہوسکتے ہین کہ وہ سلطنت کی قوت ارادی کا مظہر ہو اور حکومت کے ذریعہ سے شائع کیا گیا ہو۔ قانون اور رسم ورواج کا قریبی تعلق ہے۔ اور عموماً قیام ملت وسلطنت کے بعد قانون کا حقیقی تخیل پیدا ہوتا ہے۔ غیر مکمل جماعات مین صرف غیر حقیقی قانون ہوسکتا ہے۔

تحریر شدہ اور غیر تحریر شدہ قانون

حقیقی معنون مین قانون کا وجود کسی نہ کسی سلطنت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسی صورت مین یہ ضروری نہین ہے کہ کل قانون قلمبند ہوجائے۔ نہایت ترقی یافتہ قانون کی خصوصیات یہ ہین کہ یہ سلطنت کے کل افراد کے لئے یکسان ہو اور نہایت واضح ہونے کے علاوہ مبہم نہ ہو یعنی اُسکے دو معنی نہ پیدا ہوسکین۔ ساتھ ہی اسکا نفاذ عام طور پر اسطرح کیا جاوے کہ اُسپر عوام تنقیدی نگاہ ڈال سکین اکثر ایسا ہوتا ہے نہایت ترقی یافتہ سلطنتون مین قانون کا بیشتر حصہ تحریر شدہ نہین ہوتا۔ اسکے کئی وجوہ ہوسکتے ہین۔ ایک سبب یہ ہے کہ اکثر سلطنتون مین مذہبی طبقہ کے لوگ قانون کے محافظ سمجھے جاتے ہین لہذا انکو یہ کافی حیثیت مل جاتی ہے کہ وہ اسے حفظ کرین۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ

اکثر او قات پرانی رسوم کی پابندی کی جاتی ہے اور قانون تحریر نہیں کیا جاتا۔

انضباط قانون دنیا مین غالباً سب سے پہلے مصر مین قانون کا انضباط شروع ہوا۔ ہندوؤن کا پورانا قانونی نظام منو کے زمانہ مین مکمل ہوچکا تھا۔ اور اسی طرح اکثر اقوام مین قانون کے مختلف ضابطہ اپنی ضروریات کی وجہ سے بنتے جاتے تھے۔ مسلمانون مین فقیہون کی جو کثرت ہوئی ہے وہ ظاہر ہے۔ اور موجودہ زمانہ مین تو غالباً کوئی ملک و ملت ایسی نہ ہوگی جس مین تدوین و انضباط قانون نہوا ہو یا نہ ہورہا ہو۔

حقیقی یا اصلی قانون وقتی ضروریات کے لئے حکومت کی طرف سے جو احکام نافذ ہوتے ہیں وہ حقیقی قانون نہین کہے جاسکتے۔ جو قانون مستقل۔ عام۔ اور کسی قدر باوقعت نہ ہو اور صرف تھوڑے عرصہ کے لئے کسی وقت یا ضرورت کے رفع کرنے لئے نہ بنایا گیا ہو اُسے حقیقی قانون کے زمرہ مین نہین داخل کیا جاسکتا۔

بہرحال اس تفریق کو آسانی سے سمجھنے کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حقیقی قانون وہ ہے جسے مجلس واضع قوانین جاری کرے۔ چونکہ قوت اجرائی قانون بنانے کا اختیار نہین رکھتی بلکہ قوانین پر عمل کراتی ہے اور اُنکا انفاذ کرتی ہے لہذا وہ قوانین جو مجلس قانون کے احکام کی مطابقت مین حکومت کی طرف سے جاری ہوتے ہین حقیقی قوانین نہین کہے جاسکتے بلکہ انکا تعلق قوت اجرائی سے ہوتا ہے۔ اس قسم کے قوانین ریلوے کمپنی بلدیہ اور پولیس وغیرہ کے ماتحت قوانین ہین۔

سلطنت کی مختلف قوتون کا ذکر اقسام حکومت کے بیان کردینے کے بعد کیا جائے

زیادہ موزون ہوتا۔ لیکن چونکہ لفظ قانون کی تفصیل ہو رہی ہے لہذا اسی سلسلہ مین اُن قوتون کا بیان زیادہ بے موقع نہوگا۔ چونکہ سلطنت اتحاد کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔ اسلئے وہ اپنے افعال کو تقسیم کر دینے کی وجہ سے اس اتحاد کو کمزور نہیں کر سکتی۔ ارسطو نے (سیاسات ارسطو باب ۱۴) سیاسی افعال کو تین قسمون پر تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم حسب ذیل ہے

(۱) غور کنندہ۔ اسکے متعلق قانون سازی صلح و جنگ کرنا اور سزا ت کا استعمال کرنا تھا۔

(۲) حکومت کنندہ۔ اسکے متعلق وہی امور تھے جو موجودہ زمانہ مین حکام اجرائی کے ہین۔

(۳) انصاف کنندہ۔ یہ تیسری جماعت موجودہ قاضیون (ججون) کی جماعت کے مطابق تھی۔ مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ یونان اور روم کے اکثر شہرون مین یہ تینون افعال (یا صفات) ایک ہی شخص کی ذات مین مجتمع ہو جاتے تھے۔ لیکن قانون سازی اور انصاف کرنے کے اختیارات کا ایک شخص مین جمع ہو جانے کے یہ معنی ہین کہ رحم و ضمانت کو ایک جگہ کر دیا گیا اسلئے رحم کرنے کے حق و اختیارات کو الگ کر دینا زیادہ مناسب ہے تاکہ قانون کے الفاظ کی بجائے اُنکے معنون پر عمل شروع ہو اور قانون کی سختی مین اعتدال پیدا ہو جائے۔

موجودہ زمانہ مین قانون ساز۔ اجرائی۔ اور انصاف کنندہ شعبون کو الگ کر دینا بہتر خیال کیا گیا ہے۔ مگر سلطنت کا اتحاد قائم رکھنے کے یہ ضروری ہے کہ اگرچہ ان تینون شعبون مین امتیاز رکھا جائے مگر ان کو قطعی علحدہ نہ کیا جائے۔ اسکے ساتھ ایک غلط خیال بھی عام طور سے رائج ہے۔ وہ یہ کہ مختلف شعبون کی قوت اور انکا درجہ مساوی ہے اس سے سلطنت کی زندہ ہستی ہونے کا انکار لازم آتا ہے۔ زندہ ہستی کے مختلف اعضا

اپنا اپنا کام کرتے ہین مگر ایک دوسرے کے ماتحت رہنا انکے لئے ضروری ہے۔ ورنہ اتحاد و تعلقِ کل مین فرق آجانا ضروری ہوجاتا ہے۔ سر کو نہ جسم سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ باقی جسم کے برابر سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو یقیناً انسان کی موت کا باعث ہوگا۔"

قوت قانونسازی جس طرح دوسرے شعبون کا ماتحت افعال سے تعلق ہے اسی طرح قانونسازی کا بحیثیت مجموعی پوری سلطنت سے تعلق ہوتا ہے۔ لہذا اسکا بیان پہلے کرنا ضروری ہے۔ یہی قوت سلطنت کا نظام اور قانون بناتی ہے۔ اور پوری سلطنت کے مستقل رشتون کو ایک نظام مین وابستہ کرتی ہے جب تک اس قوت کے حقوق کا بیان نہ کردیا جائے۔ دوسری قوتون کی تقسیم نہین کی جاسکتی۔

نفسیات مین قوت ارادی اور قوت عاملہ کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اسی طرح قانونسازی قوت ارادی ہے اور اجرائی قوت کو قوت عاملہ کہا جاسکتا ہے لیکن نفسیات سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ دونون قوتین الگ الگ نہین پائی جاتین بلکہ ایک کے لئے دوسری قوت کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح قوت قانونسازی اور قوت اجرائی مین ایک دوسری قوت کا کوئی جزو ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک قوت بہت زیادہ ہو اور دوسری قوت بہت کم۔ مگر جس طرح جزو سے کل زیادہ ہوتا ہے اسی تناسب سے قانونسازی کی قوت دوسری قوتون کی نسبت اعلیٰ رتبہ رکھتی ہے۔

قوت قانونسازی کے علاوہ دیگر [illegible] سلطنت مین [illegible]

قوت [illegible] مستقل [illegible]

حصّون مین منقسم ہوسکتی ہین۔ جنمین سے دو زیادہ ضروری ہین یعنی۔

۱۔ حکومت یا انتظام قائم رکھنے کی قوت۔

۲۔ انصاف کرنے کی قوت

انکے علاوہ دو اور قوتین ہین جو عموماً حکومت (عـلـ) کے ماتحت سمجھی جاتی ہین مگر حقیقتاً حکومت کا جزو اُنمین بہت کم پایا جاتا ہے اور وہ اُس سے علٰحدہ معلوم ہوتی ہین یعنی۔

۳۔ تہذیب و تمدّن کے دماغی عناصر کی نگہداشت۔

۴۔ مادّی ذرائع ترقی کا انتظام اور نگہداشت (معاشیات)

۱۔ حکومت اور قوت اجرائی

غلطی سے قوت اجرائی کو حکومت کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس اصطلاح سے نہ تو حکومت کا مطلب صاف سمجھ مین آتا ہے اور نہ اسکا قانونسازی اور انصاف کرنے والی قوت سے تعلق معلوم ہوتا ہے حکومت کے بہت سے قوانین کا اجرا بغیر کسی جبر کے ہوجاتا ہے اور قوت اجرائی جبر سے کسی قانون پر عملدرآمد کرانے کو کہتے ہین۔ اور حکومت صرف اجرائی طاقت ہی نہین بلکہ کسی حد تک غور و خوض کرنے والی طاقت بھی ہوتی ہے۔ قوت اجرائی حکومت کی ماتحت قوت کا نام ہے جسے غور کرنے سے کوئی تعلق نہین۔ قانونساز جماعت کے قوانین کا اعلان کرنا اور اسکو منوانا حکومت کا کام ہے لہٰذا یہ صاف ظاہر ہے کہ کسی قانون کا شائع کرنا اُسکے اجرا کرنے کا مترادف نہین ہوسکتا۔ اسی طرح عدالت کے کسی فیصلہ کا اجرا ہونا [illegible]

قوت انصاف کا ایک جزو ہے۔ اور یہ انصاف کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے اور حکومت سے یہ شعبہ اُس وقت تک کوئی مدد نہین مانگتا [illegible]ک کہ اسکی قوت ناکافی نہو۔ بہرحال اس لطیف بحث کو ہم آئندہ پر چھوڑ دیتے ہین اور [illegible]یگر قوتون کا ذکر کر دیتے ہین۔

۳۔ قوت انصاف قوت انصاف عموماً اُس قوت کو مانا جاتا ہے جو انصاف کرے۔ لیکن قوت انصاف کا مقصد انصاف کرنا نہین بلکہ قانون کے مطابق عمل کرنا ہی ہے لہذا موجودہ زمانہ مین قوت انصاف کو حکومت سے قطعی الگ رکھا جاتا ہے۔

۴۔ ملت اور قوم

ہماری زبان مین ملت۔ قوم۔ امت۔ گروہ۔ جماعت گ۔ وغیرہ اصطلاحات کا تمیز نہین کیا جاتا۔ اور یہ الفاظ ایک دوسرے کے مترادف سمجھے جاتے ہین۔ لہذا یہ بتا دینا ضروری ہے کہ گروہ کسی بے قاعدہ مجمع کا نام ہے۔ جماعت کسی خاص خصوصیت کو مدنظر رکھکر پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً دولت۔ یا علم۔ یا پیشہ۔ اوران خصوصیتون سے یہ جماعت دوسری جماعتون سے الگ ہو جاتی ہے قوم کسی ایک نسل کے باشندون کو جو عرصہ سے ایک ہی تمدن وتہذیب زبان اوررسم ورواج رکھتے ہون کہتے ہین اور جب ایک اور ایک سے زیادہ اقوام یا مختلف اقوام کے حصے۔ اسی طرح متحد ہو جائین کہ وہ اپنی سلطنت قائم کرلین اوراُن کی سیاسی ہستی دوسری سیاسی ہستیون سے الگ اورآزاد ہوجائے تو اُنھین ملت کہتے ہین۔ اس تعریف کا مفصل بیان آئندہ ہوگا۔

۵۔ سوراج

سوراج یا حکومت خود اختیاری کے متعلق ہندوستان کے سیاسی حلقون مین طویل بحثین ہو رہی ہین اور اسکی تعریف کرنے مین مختلف فرقے کوشان ہین۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ سوراج ملک کے باشندون کی اندرونی آزادی کا نام ہے۔ اندرونی آزادی سے یہ مراد لیجاتی ہے کہ کسی بیرونی سلطنت کو ملکی قوانین بنانے مین دخل نہ ہو۔ یہ خیال اُس طبقہ کا ہے جو عرصہ دراز سے غلامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد آزادی[1] کے تخیل کو بھی فراموش کر چکا ہے۔ دوسرا فرقہ اُن لوگون کا ہے جو کہتے ہین کہ حکومت خود اختیاری یا سوراج مکمل اندرونی اور بیرونی آزادی کا نام ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر ملت و قوم کو اپنے لئے اندرونی قوانین بنانے اور اپنے ہمسایون سے تعلقات (خارجی) قائم کرنے کا قدرتی حق ہے۔

نوٹ [1] اسی ضمن مین لفظ آزادی کی مختصر تشریح بھی ضروری ہے۔ آزادی ہمیشہ کسی چیز کے مقابلہ مین ہوتی ہے اسی وجہ سے یہ اصطلاح مطلق معنون مین استعمال نہین کی جاتی۔ مطلق آزادی ایک بے معنی چیز کا نام ہے۔ لہذا سیاسی آزادی بھی اگرچہ بعض شرائط سے محدود ہوگی مگر یہان ہمارا منشا یہ ہے کہ یہ آزادی پوری طرح سے روحانیات اور فطرتی قوانین کے مطابق ہو۔

مقالۂ دوم ۔ سیاسی استدلال

موجودہ زمانہ کی ترقی یافتہ اور مہذب سلطنتون مین اب تک فصاحت وبلاغت سے بہت سے کام نکل جاتے ہین۔ مؤثر اور جذبات کے بھڑکانے والی تقریرون کا اثر فطرتاً انسان پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر زیادہ تر اُن جمہوریتون مین زیادہ ہوسکتا ہے جو براہ راست ہر فرد ملت کو مجالس ملیہ مین آنے اور تقریر کرنے کی اجازت دیتی ہین۔ تقریر اور تحریر مین لفاظی و فصاحت کا اثر زمانۂ قدیم کی نسبت آجکل بہت کم ہورہا ہے۔ اور اسکی وجہ ظاہر یہ ہے کہ تعلیم اور صحافت کی ترقی کی وجہ سے رائے عامہ اُن باتون کو زیادہ پسند کرتی ہے جو بالکل منطقی ہون اور صرف جوش اور جذبات کی بنا پر رائے نہین قائم کی جاتی۔ سیاسی استدلال مین تاریخ و تقویم سے بہت زیادہ مدد لی جاتی ہے لیکن ان کا بیان کرنے سے پہلے ہمین یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اجتماعی معاملات کے متعلق ہر قسم کے سیاسی استدلال کی بنا اُن اصولون پر ہوتی ہے جو انسان کی فطرت سے متعلق ہین۔ مگر عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ نفسیات کے مطالعہ کرنے والون کے کلیات کو خیالی دلایل سمجھ کر اتنی وقعت نہین دیجاتی جتنا اُس گروہ کے دلائل اور کلیات کو مانا جاتا ہے جو تاریخ اور تقویم سے تجربہ کی بنا پر نتائج و کلیات کا سامان مہیا کرتے ہین۔ ابتدا ہی مین یہ بتادیا گیا ہے کہ فلسفہ کی ضرورت فطرت انسانی کے سمجھنے اور کلیات قائم کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اور چونکہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اور سیاسی تجربات کرنا اور حالات و واقعات کو اپنی خواہش کے مطابق پیدا کرنا ہماری

طاقت سے باہر ہے لہذا تاریخ سے ہمین بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

سیاسیات مین ہر عامی اور جاہل اپنے آپ کو راے زنی کرنے اور کلیات عامہ بنانے کا اہل سمجھتا ہے۔ اس طبقہ کو اس بات کا خیال نہین کہ دُنیا کے معمولی کاروبار مین وہ شخص نہایت بیوقوف سمجھا جاتا ہے جو کسی علم سے نابلد ہوکر اسکا ماہر ہونیکا دعوی کرے مثلاً وہ شخص جو مشین بناتا تو کجا اُسکے پُرزون کے نام سے بھی واقف نہین اُس مشین مین ترمیم و تنسیخ کرنا چاہے تو ہر شخص اُسے یا تو بیوقوف سمجھے گا یا مجنون۔ بخلاف اسکے سیاسیات مین ہر ایک کو یہ دعوی ہے کہ اگرچہ وہ فلسفہ اور تاریخ سے قطعی نابلد ہو اُسکی راے نہایت صائب ہے۔ اور اُن لوگون کی راے جو اِن علوم کے ماہر ہین غلطی پر ہے اس مغالطہ کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے تجربہ کی بنا پر راے زنی کرتا ہے اور کلیات بناتا ہے۔ اور نتائج اخذ کرنے کے وقت وہ کسی مسئلہ کے صرف ایک پہلو کو دیکھتا ہے اور دوسرے حالات و واقعات کو قطعی فراموش کرکے غلط نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے۔ مثلاً یہ دلیل کہ چونکہ انگلستان مین مشینون کے استعمال سے دولتمندی مین ترقی ہوئی لہذا ہندستان مین بھی وہی اثر ہوگا سراسر غلط ہے۔ وہ انگلستان کی جغرافیائی۔ ملکی اور تمدنی خصوصیات کا موازنہ ہندوستان کی حالتون سے نہین کرتا اور اسی وجہ سے یکطرفہ راے قائم کرتا ہے۔

منطق کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ان نتائج سے جو متعدد اسباب سے پیدا ہوتے ہین صرف مطالعہ اور تجربہ کی بنا پر کلیات عامہ بنائے جا سکتے ہین لیکن یہ امر اتنا مشکل ہے کہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ فطرت انسانی اتنی پیچیدہ ہے کہ اگر

ایک واقعہ بھی نظر انداز ہوگیا تو نتیجہ غلط ہو جائیگا۔ اور اُس کلیہ پر دوسرے حالات یا معاملات کا قیاس کرنا غلط نتائج پیدا کریگا۔ لہذا سیاسیات مین استقرار اور قیاس دونون مین اسوقت تک نہایت دقت ہے جب تک تاریخ و فلسفہ بپہلو بہ پہلو اور نہایت احتیاط و مطالعہ کے بعد نہ استعمال کئے جائین۔ چونکہ اس کتاب مین سیاسی استدلال کی تفصیل کی گنجائش نہین ہے لہذا صرف اشارات اور مغالطون کے بتا دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مفصل بیان آئندہ کسی مستقل کتاب مین درج کیا جائیگا۔

تاریخ۔ سیاسیات مین ایسے نتائج کا جمع کرنا جو ہر زمانہ اور ہر ملک و ملت کے لئے موزون ہون ناممکن ہے۔ اور اسی بنا پر اکثر غلط استدلال ہونے کی گنجائش ہوجاتی ہے تاہم روز بروز ایسے قواعد کلیہ کی ترقی ہو جاتی ہے جو نہ تو ملت کی ہر حالت مین صحیح ہوسکتے ہین اور نہ زمانہ کی ترقی کے بعد یا سیاسی تبدیلیون کی وجہ سے صحیح رہ سکتے ہین بہرحال تاریخ سے سیاسی حقیقتون کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ اسکا مطالعہ یکطرفہ نہو بلکہ اسکا وسیع اور مکمل مطالعہ کرنے کے بعد نتائج اخذ کئے جائین۔

تقویم۔ سیاسیات کو اُن تقاویم سے بہت زیادہ مدد مل سکتی ہے جو مہذب سلطنتون مین آجکل کثرت سے تیار کی جاتی ہین۔ سیاسی۔ تمدنی۔ معاشی۔ تجارتی اور دیگر شعبون کے متعلق ہر قسم کی معلومات اور صحیح اعداد و شمار ہر سال بلکہ سال میں کئی کئی دفعہ شائع ہوتے رہتے ہین۔ انکے مقابلہ اور موازنہ کے بعد تقریباً ہر قسم کے صحیح نتائج کا استنباط ہوسکتا ہے۔ لیکن اس بات کے خیال رکھنے کی سخت ضرورت ہے کہ بعض

کلیہ اور مسلمات عامہ جو اپنے علوم کے حدود کے اندر صحیح ہین سیاسیات مین عجیب نتائج اور مغالطہ پیدا کرسکتے ہین - اور عوام پر انکا اثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ مشکل سے دور ہوتا ہے۔ اس قسم کے استدلال کی دو مثالین مندرجہ ذیل ہین:-

یکطرفہ استدلال کی مثالین -

مالتھوس نے ایک قاعدہ کلیہ نہایت استدلال کے ساتھ ثابت کیا وہ یہہ ہے کہ "آبادی کی تعداد خوراک کے پیداوار کے مقابلہ مین روز افزون ترقی پر ہے" یہ عمومی طور پر اجتماعی - معاشرتی اور طبعی واقعہ تھا - جسے ہر طریقہ پر …بر استعمال کرسکتے تھے - مگر اسکا یکطرفہ استعمال کیا گیا اور صرف اس بات پر زور دیا گیا کہ واضعان قانون ایسے قوانین جاری کرین جن سے آبادی مین ترقی نہ ہو تاکہ خوراک کے حاصل کرنے مین دقت نہ ہو۔

(۲) معاشیات کا مسلمہ ہے کہ بجائے ہاتھون سے محنت کرنے کے مشین اور کلون سے کام کرنا قومی دولت کو ترقی دیتا ہے۔ اس سے مزدورون کی تنخواہون مین اضافہ اور انکی بہتری کی صورتین پیدا ہوتی ہین۔ مگر اس طرز عمل کو اگر ایسے ملک مین جہان مزدوری پیشہ جماعت کی کثرت ہے استعمال کیا جاوے (مثلاً ہندوستان) تو ابتدا مین عرصہ تک افلاس و تنگدستی اور عام تکلیف کا باعث ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت مین اگر …ی حکمت عملی کی بنیاد قاعدہ اولی پر رکھی جائے اور دوسرے جزو کو چھوڑا جائے تو یقیناً غلط نتائج پیدا ہونگے۔

سیاسی استدلال کی مثالین

متذکرہ بالا غلطیون کے علاوہ کثرت سے سیاسی استدلال مین

غلطیان کی جاتی ہین - وجہ یہ ہے کہ قدیم روایات اور رسوم کا انسانی فطرت پر ایسا لامعلوم اثر پڑتا ہے کہ پُرانے اور غلط سیاسی اعتقادون پر غیر محسوس طریقہ سے انسانونکا بھروسہ ہوجاتا ہے - اس زمرہ مین مندرجہ ذیل خیالات داخل کیے جاسکتے ہین -

(۱) عام طورسے یہ خیال کہ بادشاہ یا راجہ خواہ وہ کیسی ہی خراب حکومت کرتا ہو خدائی حکم سے حکومت کرتا ہے اسوجہ سے اُسکی اطاعت فرض ہے -

(۲) یونان اور روما مین غلامی کے رواج کو غیر فطرتی نہین مانا جاتا تھا بلکہ سلطنت کے لئے ضروری سمجھتا تھا -

(۳) کل انسانون کے حقوق مساوی سمجھے جاتے ہین خواہ اُسکی دماغی وروحانی ترقی کتنی ہی کم ہو -

(۴) عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو کسی علم کے حاصل کرنے مین زیادہ وقت صرف کرتے ہین اور اُسمین خصوصیت سے فضیلت کا درجہ حاصل کرتے ہین زیادہ قابل وقعت ہین اور اُنکی رائے سیاسیات مین نہایت مفید ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جتنا زیادہ وقت خاص طور سے طبعی علوم (مثلاً طب - کیمیا - طبعیات) وغیرہ مین صرف کرتے ہین اُتنا ہی کم فطرت انسانی کے سمجھنے کا موقع پاتے ہین - لہذا صرف فلاسفر - مقنن اور مصلح (وغیرہ) ہی سیاسیات مین بہتر طریقہ اور عمدہ اصلوب سے کام کرسکتے ہین - چونکہ ایسے ہی لوگ فطرت انسانی اور سیاسی زندگی کا وسیع مطالعہ کرسکنے کا موقع پاتے ہین -

مقالۂ سوم - سیاسیات مین حق و باطل

اس امر سے کوئی سمجھدار انسان انکار نہین کر سکتا کہ جس طرح انسان کے طرزِ عمل اور چال چلن کے متعلق حق و باطل - فرض و وجدان - اخلاق و بداخلاقی اور اچھا اور برا کہا جا سکتا ہے اسی طرح ان الفاظ کا استعمال سلطنتون اور حکومتون کے متعلق بھی ہو سکتا ہے - اسمین شک نہین کہ زیادہ پیچیدہ اور وسیع سیاسی معاملات مین اس قسم کی تحقیقات مشکل ہو جاتی ہے - اور اکثر معاملات مین تو رائے زنی بالکل ناممکن ہے - تاہم یہ ظاہر ہے کہ رائے عامہ حکومت اور قانونی مجالس کے احکام و قوانین پر بھی نکتہ چینی کرتی ہے -

اخلاقیات - مشرقی دنیا مین خصوصاً اور مغرب مین ازمنۂ وسطیٰ تک سیاسیات کی بنیاد اخلاقیات پر رہی ہے - انگلستان کے مشہور شاعر کولرج نے انجیل کو مدبری کا رہنما قرار دیا ہے - اور انجیل و شریعت موسوی کے اخلاقی اثرات کو خوب ثابت کر کے واضح کر دیا ہے - مگر مشرق مین جتنی کتابین سیاسیات پر لکھی گئی ہین اور جتنے مقنن نے سیاسی ترقی کی مہم کو نہ صرف زمانۂ قدیم مین بلکہ اب تک اخلاقی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش کی ہے - اس قسم کے اخلاقی مدبرون مین ہمارے سامنے کوئی ایسا مدبر نظر نہین آتا جس نے عمل کو بالکل اخلاقیات کی اصطلاح کے طور پر سیاسیات کا اصل اصول قرار دیا ہو -

سلطنت یا ملت افراد ملت سے ہر قسم کی خدمت کی مستحق ہے اور اس خدمت کو حکومت اور وقار کے ساتھ اُن سے طلب کر سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ افراد کا تعلق نہایت چھوٹے (مثلاً خاندان) نہایت وسیع (مثلاً شہنشاہی) نظام سے ہو۔ مگر بمقابلہ سلطنت کے ان دونون کے حقوق کم درجہ کے سمجھے جاتے ہین اور انسان کا فرض اولین یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اُس نظام سلطنت کا وفادار ہو جسکا وہ باشندہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت کا وجود نظام عالم مین ایسا ہوتا ہے جسکی کوئی ٹھیک مثال یا نظیر موجود نہین ہے۔ اور خصوصیت سے وہ افراد ملت سے مخصوص حق خدمت رکھتی ہے۔ جہانتک ہمارا علم یاری دیتا ہے ہم یقین سے کہہ سکتے ہین کہ انسانی زندگی اور اسکے مختلف شعبون کو جو ترقی اور وسعت قیام سلطنت کے بعد ہوتی ہے وہ نہ تو خاندان کی محدود زندگی مین ہو سکتی ہے اور نہ صرف ایسی اجتماعی زندگی مین جس مین قومیت کے درجہ تک ترقی ہو گئی ہو مگر ملت کا نظام نہ قائم ہوا ہو۔

ذیل مین ہم اُن حقوق اور فرائض کا بیان کرتے ہین جن پر "حق" "باطل" یا اچھے اور برے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ فہرست اعمال اگرچہ مکمل نہین کہی جا سکتی لیکن اس سے ایک اندازہ ہو سکیگا کہ کس طرح اخلاقی معیار کا استعمال سیاسیات مین ہوتا ہے۔ اخلاقیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی ایسی خوبیان ہین جو اگر اپنی حد اعتدال سے بڑھ جائین تو بدی کی صورت مین تبدیل ہو جاتی ہین۔ اسی طرح حب وطن۔ حب ملت ایثار وغیرہ ایک خاص درجہ تک "حق" کے حدود مین رہتے ہین۔ سیاسیات مین [illegible]

طویل تجربہ کے کسی امر کے متعلق اخلاقی فیصلہ کرنا مشکل ہے تاہم چند مثالون سے کچھ نہ کچھ واضح ہو جائیگا - سیاسیات مین تین قسم کے حقوق ہین اور ہر ایک کا مختصر بیان کرنا ضروری ہے

۱ - افراد ملت کا تعلق سلطنت سے | ہر فرد ملت کا فرض ہے کہ قانون کی پابندی کے ساتھ ساتھ اُن حقوق کو ادا کرتا رہے جو اخلاقی طور پر سلطنت کے لئے ضروری ہین اُن مین سے ہم صرف تین باتون کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہین -

(الف) مالیات | مالیات کے معاملات ہر سلطنت مین ایسے معیار پر قائم ہوتے ہین جس سے بحیثیت مجموعی سلطنت کے کاروبار مین آسانی ہو اور افراد ملت کی مالی ترقی مین رکاوٹ نہ پیدا ہو - اس طرح ہر فرد ملت کا فرض ہے کہ وہ نہایت خوشدلی سے سلطنت کی مالیات کے مطالبات کو پورا کرتا رہے ممکن ہے کہ بعض افراد پر ناموزون تناسب سے ٹکس عائد کیا جائے لیکن اُنکو لازم ہے کہ اُسکی ادائیگی کو فرض اولین سمجھین اور مالیات کے متعلق اور دوسری قسم کی بددیانتیون کو راہ نہ دین -

(ب) انتخاب - | انتخاب وکلا مین اکثر ذاتی مفاد یا فرقہ بندی یا دیگر تنگ خیالیون کی وجہ سے ملت کا بحیثیت مجموعی خیال نہین کیا جاتا - اور اس سے سلطنت کو کمزور کر دیا جاتا ہے - قلیل التعداد اقوام کی نمائندگی پر بد دیانتی سے بُرا اثر ڈالا جاتا ہے - یا اُن افراد کو حق انتخاب و راسے دہی سے روکا جاتا ہے جو جائز طریقہ سے اسکے اہل ہین - ان باتون کے متعلق ضروری ہے کہ اعتدال اور حق پسندی اور آزاد خیالی سے کام لیا جائے -

(ج) انقلاب۔ انقلاب دو قسم کی سلطنتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک آزاد سلطنت اور دوسری وہ سلطنت جو کسی بڑی یا طاقتور سلطنت کی محکوم ہو۔ اول الذکر میں افراد ملت کا فرض ہے کہ سوائے آئینی طریقوں کے کوئی ایسا سخت طرز عمل نہ اختیار کریں جو خونریزی کا باعث ہو یا قلیل التعداد اقوام کی مضرت رسانی پر مبنی ہو۔ موخر الذکر حالات میں انقلاب جب ہی رونما ہوتا ہے جب حاکم محکوم قوموں پر اتنا ظلم تعدی کرنا شروع کرتے ہیں کہ حد سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت مجبور کرتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس جوئے کو کندھے سے اتار کے پھینک دیا جائے جو ناقابل برداشت ہو گیا ہے تاہم ان لوگوں سے جو بانی ظلم و جور ہیں اعتدال اور انسانیت کا برتاؤ ضروری ہے علاوہ ضرورت کسی قانون کی پابند نہیں ہوتی۔

(د) سلطنت کے فرائض و خدمات کے متعلق۔ دوسرے وہ فرائض ہیں جو سلطنت کو افراد ملت سے وابستہ کرتے ہیں اور انکا ادا کرنا سلطنت کے لئے ضروری ہے۔ مختصراً چند فرائض کا ذکر جن پر حق و باطل کا اطلاق ہو سکتا ہے کئے جاتے ہیں۔

(الف) قانون جرائم۔ سلطنت کا فرض ہے کہ قانون جرائم میں بہ نسبت جسمانی تکلیف پہنچانے کے مجرم کی اخلاقی درستگی کا خیال رکھے اور قید خانوں میں اخلاقی و مذہبی معیار اتنا بلند ہو کہ اس سے افراد ملت کی گمراہیاں دور ہو کر پاکیزہ خصلتوں کی نشو و نما ہو سکے۔

(ب) غلامی۔ غلامی کا دنیا سے تقریباً ازالہ ہو گیا ہے۔ مگر اسکی جگہ دوسری قسم کی غلامی نے لے لی ہے۔ یہ غلامی غریب مزدوری پیشہ لوگوں کی ہے جو صاحبان دولت

اور غلام سے بھی بدتر درجہ رکھتے ہیں۔ سلطنت کو اس اجتماعی حالت کی درستگی کی خصوصیت سے ضرورت ہے اور وہ سلطنت قابل ملامت ہوگی جو اس حالت کو بہتر دبنا سکے۔

(ج) مجبوراً اخلاق کا پابند کرنا

امریکہ نے جبراً شراب نوشی کو بند کرکے پوری ملت کو افلاس ہی سے نہیں بچایا بلکہ دولتمند بنانے میں مدد دی۔ اسطرح ہر ایک سلطنت افراد ملت کو مجبوراً اخلاقی حالت کی درستگی پر زور دے سکتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس قسم کی دخل اندازی کو حکومت کے حدود سے باہر بتایا جاتا ہے۔

۳- ایک سلطنت کا دوسری سلطنت سے تعلق

کسی سلطنت کا دوسری سلطنت سے دو قسم کا تعلق ہوسکتا ہے ایک ان سلطنتوں سے جو قطعی آزاد ہیں دوسرے وہ جو اندرونی طور پر تو آزاد ہیں مگر بیرونی تعلقات میں مرکزی سلطنت کی مطیع ہیں۔

دونوں صورتوں میں ہر ایک سلطنت کا فرض ہے کہ وہ آپس کے عہدناموں اور صلحناموں کو صرف کاغذ کا ایک ردی ٹکڑا ہی نہ سمجھیں بلکہ اُسکی پابندی کو اخلاقی فرض تصور کریں۔ شہنشاہی سلطنتیں اپنے ذاتی مفاد کو دوسری ملتوں کی بیجا تکلیف رسانی سے حاصل کرتی ہیں۔ اور نہایت افسوس اور شرم کی بات ہے کہ موجودہ شہنشاہیت تجارتی ضرورتوں کی وجہ سے کمزور سلطنتوں کی ہستی ونیستی کی پرواہ نہ کرکے ایسے مظالم کرتی ہے کہ بیان قاصر ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے کام کرنے کا درحقیقت وہ وقت ہوتا ہے جب کوئی سلطنت شکست کھا جائے یا کمزور ہوجائے اور فاتح یا طاقتور سلطنت اُس سے

تعلق قائم کرے شہنشاہیت کے متعلق آئندہ ذکر کیا جائیگا۔ لیکن یہان اتنا بتادینا ضروری ہے کہ ہرایک سلطنت کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ دوسری آزاد سلطنت سے عمدہ تعلقات قائم رکھے۔ اور شہنشاہی سلطنتون کا فرض ہے کہ محکوم سلطنتون کی تمدنی۔ تجارتی۔ وسیاسی ترقی مین اس طرح کوشان ہون کہ کل دنیا مین آزاد سلطنتون کا اجتماع قائم ہوجاے اور ہر سلطنت کی بنیاد انسانیت۔ عدالت اور آزاد خیالی پر ہوسکے۔

باب رابع

سلطنت کی داخلی اور خارجی کیفیتیں

۷۸۶

تمہید

سلطنت کے قائم ہونے کے لئے دو باتین نہایت ضروری ہین چونکہ بغیر انکے سلطنت کا وجود مین آنا قطعی ناممکن ہے۔ان مین سے ایک ملت ہے دملت خاص معنون مین استعمال کیا گیا ہے۔ اور ماسبق اسکی تفصیل بیان کی گئی ہے) دوسرے ملک یا ملک وملت کی خصوصیات ایسی ہوتی ہین ۔ جو ایک سلطنت کو دوسری سلطنت پر ممتاز کرتی ہین ۔ لہذا ان خصوصیات کا تفصیل سے ذکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس لحاظ سے اس باب کو دو حصون مین تقسیم کیا جاتا ہے۔

حصہ اول سلطنت کی کیفیات داخلی ۔ یعنی ان حالتون اور کیفیتون کا بیان جو انسانی فطرت مین پائی جاتی ہین ۔ اور جنکا خاص اثر ملل عالم پر پڑتا ہے ۔ یا جنکی وجہ سے خاص طور سے تاریخی نشو ونما ہوتا ہے ۔

حصہ ثانی سلطنت کی کیفیات خارجی (یا طبعی) یعنی ان حالتون کا بیان جو انسانی فطرت سے تو کوئی تعلق نہین رکھتین مگر ملل عالم پر خارج سے اثر ڈالتی ہین ۔ یہ حالتین ملک آب وہوا سرحد زرخیزی وغیرہ وغیرہ ہین ۔ اور یہ انسانی ترقی اور طرز عمل پر بنا عمیق اثر ڈالتی ہین [illegible]

تین نسلیں صاف صاف تاریخ عالم پر نظر آتی ہیں۔ یعنی زرد۔ سفید۔ اور سیاہ۔ سفید نسل کی آبادی ۴۳ کروڑ ہے۔ زرد نسل کے انسان ۶۰ کروڑ اور سیاہ نسل کے بیس کروڑ ہیں۔ چونکہ پوری دنیا کی آبادی ۱/۲ ۱ ارب کے قریب قریب ہے۔ لہذا اگر کوئی نسل (مثلاً امریکہ کی سرخ نسل) اسی قلیل التعداد ہے کہ ان تینوں نسلوں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اور ان ہی نسلوں کی ایک شاخ ہو سکتی ہے۔

۱۔ سفید نسل | سفید یا آریہ نسل کی دنیا میں سب سے زیادہ تعداد ہے۔ اسی نسل نے دنیا کی تاریخ میں عظیم تغیر و تبدل کیا ہے۔ مذاہب عالم کا سرچشمہ یہی نسل ہے۔ ہر علم خصوصاً فلسفہ و حکمت اسی نسل سے پھیلا۔ اور تہذیب و تمدن کی ابتدا بھی اسی نے کی۔ اور اسکو عروج پر لانے کی باعث ہوئی۔ یہ نسل دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ یعنی آریہ اور سماٹک۔ آریہ اقوام نے علم ادب۔ زبان۔ قانون۔ فلسفہ۔ اور سیاسیات اور سماٹکیوں نے عیسائی یہودی۔ اور مذہب اسلام کو دنیا میں پھیلایا۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں زرد نسل نے بھی سیاسی و تمدنی ترقی کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ نسل بھی دنیا میں مسرت و امن۔ تہذیب و تمدن کو قائم رکھ سکتی ہے مگر یہ اب تک آریہ نسل کے زیادہ کام کرتی رہی اور اب تک آریہ نسل کا درجہ ہر اعتبار سے دنیا میں بالا ہے۔

۲۔ زرد نسل | زرد یا تورانی نسل کے دو حصے ہیں (۱) باشندگان ملایا (۲) چینی اور مغل۔ یہ نسل ایشیا تک محدود ہے ان میں چین اور جاپان کی قومیں زیادہ ترقی کر چکی ہیں اور

حصہ اوّل

سلطنت کی کیفیات داخلی

مقالہ اوّل - انسانی نسلین

یہ بات عام طور سے مانی جاتی ہے کہ اخوت بنی نوع انسان بلند ترین مذہبی تخیل ہے چونکہ انسانی فطرت ہر ملک اور آب وہوا مین یکسان ہے - اسلئے کل دنیا مثل ایک خاندان کے سمجھی جاسکتی ہے - مگر نسلون کا امتیاز سلطنتون کے لئے نہایت ضروری ہے - قرآن بھی کہتا ہے کہ اے انسانو! ہم نے دنیا مین تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلون مین تقسیم کردیا کہ باہم پہچانے جاؤ - اور درحقیقت اصل یہ تفریق وامتیاز کوئی امتیاز نہیں) اور شرف اسی کے لئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے لیکن اب تک ہمارا علم اس حد تک نہیں پہنچا کہ مختلف نسلون کے ماخذ کا صحیح طور پر پتہ بتا سکے - نہ یہی معلوم ہوسکتا ہے کہ موجودہ نسلین ایک ہی نسل کی مختلف شاخین ہیں - اور نہ اسکا اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ یہ نسلین الگ الگ پیدا ہوئین - اور اگر ایسا ہے تو کن قوتون اور اسباب کی وجہ سے ایسا اتفاق ہوا -

بہرحال ہمین اس بحث مین زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہین ہے - ہمارے سامنے

تجلیات متعددہ مین خاص امتیاز رکھتی ہین انکی تاریخ دنیا کی نظر سے عرصہ دراز تک مخفی رہی۔ مگر جنگ روس۔ جاپان کے بعد اس نسل نے اپنی بیداری اور قابلیت کی وہ مثال پیش کی ہے جسکا پہلے وہم وگمان بھی نہ تھا اور اب ان قومون کے متعلق یہ اندازہ نہین کیا جاسکتا۔ کہ کس حد تک یہ قومین ترقی کرین گی۔

۳۔ حبشی یا سیاہ نسل سیاہ یا حبشی نسل نہ صرف افریقہ تک بلکہ جنوبی یورپ اور ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی یہ نسل ہمیشہ سفید نسل کے ماتحت رہی لیکن جسمانی طاقت اور محنت کرنے کے لحاظ سے ہر نسل سے ممتاز ہے دماغی حیثیت سے یہ قوم ہمیشہ کمزور رہی لیکن مسلمانون کے اثر سے شمالی افریقہ نے بہت کچھ ترقی کی اور جنوبی افریقہ بھی یورپ کے اثر سے دماغی ترقی کر رہا ہے

۴۔ امریکہ کی سرخ نسل یہ نسل مقابلتہً نہایت قلیل التعداد ہے تاہم سیاہ نسل کے مقابلے مین زیادہ ترقی یافتہ ہے اور اس مین مقابلتہً زیادہ دماغی قوت موجود ہے جسکا صحیح اندازہ اسوقت ہوسکے گا جب موجودہ تعلیم مین انکو کافی دستگاہ حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

نسلون کا امتیاز قدرتی ہے اور قومی امتیاز انسانی کوشش کا نتیجہ ہے مندرجہ بالا نسلون کی دماغی اور جسمانی حالتون مین بیّن فرق ہے اور تاریخ پر اسکا بہت اثر پڑا ہے نسلی امتیاز کا اگرچہ ہم خصوصیت سے مطالعہ کرتے ہین تاہم یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کبھی کبھی کسی قوم مین ایک ایسا انسان پیدا ہوجاتا ہے جو تاریخ عالم کی روش کو تبدیل کردیتا ہے لہذا ہمین انفرادی قابلیتون اور خصوصیات کو نظرانداز نہ کرنا چاہئے۔ فرانس مین نپولین۔ جرمنی مین قیصر ولیم۔ ہندوستان مین مہاتما گاندھی اور محمد علی ترکی مین مصطفٰے کمال

غازی اور افغانستان مین امیر امان اللہ خان ایسی ہستیان ہین جنھون سے موجودہ زمانہ مین صرف اپنی شخصیت اور انفرادی قابلیتون سے اُن قومون مین نئی روح پھونک دی جو بغیر اُنکی کوششون کے اپنی پرانی روش کو ہرگز نہ چھوڑ سکتین۔

مقالہ دوم ملت اور قوم

قوم جس طرح نسلوں کا امتیاز قدرتی ہے۔ اسی طرح ملت و قوم زیادہ تر انسانی کوششوں کا نتیجہ ہیں خارجی اثرات مثلاً ملک۔ آب و ہوا وغیرہ کے علاوہ انسانی سعی و محنت کا زیادہ حصہ اس امر کا باعث ہوتا ہے کہ ملت و قوم صفحہ عالم پر نمودار ہو۔ ہر قوم کا طرز زندگی۔ تہذیب و شائستگی دوسری قوم سے الگ ہوتا ہے یہی ایک قوم کا دوسری قوم سے فرق ہے۔ اگر اتفاقیہ چند انسان ایک بستی بناکے آباد ہو جائیں اور تجارتی یا کسی اور ضرورتوں کی وجہ سے ایک اجتماعی معاہدہ کرلیں تو اسے قوم نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً جنوبی امریکہ مین مختلف ملکوں کے آدمی اکثر سونے کی تلاش مین ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے مگر یہ ہرگز قوم کے نام سے موسوم کئے جانے کے مستحق نہ تھے۔ "قوم ایک واحد جماعت انسانی کا نام ہے جسکے رسم و رواج تمدن و علم مین یکرنگی ہو۔ یہ یکرنگی و تکمیل عرصہ دراز کے بعد پیدا ہوتی ہے اور اسکے لئے ضروری ہے کہ انسان کئی پشتون تک اجتماعی و مدنی زندگی بسر کرے

ان اسباب کو جو کسی جماعت کو ملت کے درجہ تک پہنچاتے ہین چند خاص اور ضروری اسباب مجملاً مندرجہ ذیل ہین:۔

اسباب بنائی ملت

(۱) مذہب پندرھوین صدی عیسوی سے اٹھارہوین صدی تک یورپ مین اور زمانہ قدیم مین ایشیا مین ملت کی بنیاد مذہب پر تھی کسی غیر مذہب کا شخص اس مذہب کی ملت کا فرد نہیں سمجھا جاتا تھا خواہ وہ اسی نسل اور ملک کا ہو جس مین کہ وہ ملت ہے۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ قدیم آریوں سے الگ ہو کر کچھ آریہ ہندوستان مین آکر آباد

ہوئے ۔ اگرچہ اس زمانہ میں کل ہندوستانی ایک ہی ملک کے تھے مگر ہندو اور بودھ مذہب والے ایک دوسرے سے برسرِ جنگ رہتے تھے اور ایک دوسرے کو اجنبی اور غیر تصور کرتے تھے اسکی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں گروہوں کا مذہب الگ الگ تھا ۔ عرصہ دراز تک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو غیر سمجھتے رہے مگر اکبر اعظم نے اس دورنگی کے برے اثر کو محسوس کر کے دونوں مذہب والوں کو ملانے کی کوشش کی اور اپنی بلند نظری اور حکمت عملی سے ہندو مسلم اتفاق کو عملاً کامیاب بنا کے دکھا دیا جو ایک دوسرے سے انگریزی حکومت میں پھر الگ کر دیے گئے اب دوبارہ ہندو مسلمان اتفاق کی طرف رجوع کیا گیا ہے چونکہ بغیر اسکے ترقی ناممکن ہے یہ مان لینا پڑیگا کہ موجودہ زمانہ میں بہ نسبت مذہب کے کسی خاص ملت سے تعلق رکھنا زیادہ مضبوط رشتہ سمجھا جاتا ہے اور مذہب کا درجہ بجائے اول درجہ کے دوسرے بلکہ شاید تیسرے درجہ پر رہ گیا ہے سلطان عبدالحمید خان کے زمانہ سے مسلمانوں کے اس اتحادِ عظیم کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو قرون اولےٰ میں تھا ۔ مغربی ممالک میں یورپ کے پادری اپنی قوت کو دنیاوی قوت پر فوقیت دینے کی متواتر کوشش کر رہے ہیں اسی طرح جاپان میں مذہبی دور عرصہ تک رہا حقیقت میں حکومت مذہبی پیشواؤں کی تھی اور میکاڈو نام کا بادشاہ ہوتا تھا مگر اب کل سیاسی قوتیں صرف ایک ہستی یعنی میکاڈو میں منتقل ہو گئی ہیں اور رفتہ رفتہ ملک کے ہر حصہ میں ملت کے آگے مذہب زیادہ اثر نہیں رکھتا اور ملت کی بنا مذہب پر نہیں رہی ۔ بلکہ ایک ہی ملت میں مختلف المذاہب افراد کا ہو جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا ۔

مسئلہ زبان | ایسا حیوان جو ناطق ہو انسان کہلاتا ہے - یہ انسان کی منطقی تعریف ہے - نطق یا قوت گویائی انسان کو دوسرے حیوانون سے الگ اور ممتاز درجہ دیتی ہے حقیقت یہ ہے کہ زبان ہی کے ذریعہ سے انسانی دماغ مین گویائی پیدا ہوتی ہے - اگرچہ "نطق" انسانی دماغ کی کوشش کا نتیجہ ہے تاہم جب ہم غور فکر کرتے ہین تو دل ہی دل مین گویائی سے کام لیتے ہین اور اکثر نہین بلکہ تقریباً بالکل ہمارا تخیل ہمارے ہی بنائے ہوئے الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے ابتک ہمارے ہزارون جذبات و تخیلات ایسے ہین جنہین ہم گویائی مین نہین لاسکتے اور تصویرکشی و دیگر فنون لطیفہ کی زبان سے انکا اظہار کرتے ہین اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس ملت نے بہترین و لطیف ترین تخیلات کو اپنے فنون لطیفہ کے ذریعہ ظاہر کیا ہو وہ زیادہ مہذب و متمدن قوم ہے اور اس قوم کی زبان کو حق ہے کہ زندہ رکھی جائے اور دیگر وحشی اقوام کی غیر مکمل زبانون کے بجائے جاری کردیجائے -

آریون کی زبان غالباً پہلے ایک ہی تھی مگر رفتہ رفتہ فرقون اور خاندانون کی زبانین نئی صورت اختیار کرتی گئین اور اسوجہ سے یہ نسل مختلف ملتون مین تقسیم ہوگئی زبان انسانکا دماغی معیار ہے جو قوم زیادہ ترقی یافتہ ہوگی اسکی زبان ہرطرح سے زیادہ مکمل اور جامع ہوگی زبان ہی پر انسانی ترقی کا دارمدار ہے اسی پر تہذیب و تمدن کی ترقی منحصر ہے اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم کی زبان اختیار کرے تو اسکے تخیلات بالکل اسی قوم کے سے ہوجائینگے اور آخرکار وہ قوم اس قوم مین مدغم ہوکر اپنے تہذیب و شائستگی کے بجائے اس قوم کے نقش قدم پر چلنے لگے گی - انگریزی زبان کا اثر ہندوستان مین ظاہر ہے لوگون کے خیالات مین

مغربیت کا رنگ انگریزی زبان کے استعمال سے غالب ہو چلا ہے۔ اسی طرح عربی زبان کے اثر سے شمالی مصر میں جو تہذیب اور اسلامی تمدن وحشی اقوام میں پھیلا وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا فی زمانہ زبان، ادب اور صحافت ملی اتحاد کو مضبوط کئے ہوئے ہے یہ ممکن ہے کہ دو مختلف ملتیں ایک ہی زبان رکھتی ہوں جیسے انگریز اور امریکن دونوں انگریزی زبان بولتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی ملت مختلف زبانیں بولے جیسے سوئٹزرلینڈ میں جرمن اطالوی و فرانسیسی زبانیں بولی جاتی ہیں۔

۳۔ سیاسی اتحاد | کئی آزاد فرقے یا چھوٹی چھوٹی قومیں آپس میں سیاسی اتحاد قائم کر کے ملت واحد قائم کر سکتی ہیں جیسے جرمنی آسٹریا و سوئٹزرلینڈ کی ملتیں ہیں یا جس طرح ہندوستان کی مختلف قومیں ملت واحد بنجانے کی کوشش کامیاب میں سرگرم ہیں۔

قوم کی تعریف | مختلف پیشوں کے انسانوں کا اجتماع جو تہذیب و تمدن میں یکساں اور زبان و رسم و رواج میں دوسری قوموں سے اس طرح الگ ہوں کہ انمیں اتحاد و یکتائی کی حس پیدا ہو جائے قوم کہلاتی ہے قوم کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسی قوم کی سلطنت و حکومت بھی ہو قومیت کی روح اسکا تہذیب و تمدن ہے جو زمانہ کے ساتھ اندرونی طور پر غیر مرئی طریقہ سے نشو و نما پاتی رہتی ہے یہ ارتقا قدرتی و غیر محسوس طریقہ پر جاری رہتا ہے یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب دوسری تہذیب کو فنا کر کے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے بشرطیکہ یہ تہذیب بلند تر اور وسیع تر ہو تہذیب و تمدن اقوام عروج و زوال پا سکتا ہے اور داخل کی تہذیب سے متغیر ہو سکتا ہے دو مختلف اقوام کے عرصہ تک ایک جگہ رہنے سے ایک دوسرے کے اثرات قبول

کر کے ایک نئی تہذیب رونما ہو جاتی ہے جیسے ہندوستانی تہذیب ہندو مسلمانوں کے ساتھ رہنے سے پیدا ہوئی ہے۔

ملت | وہ قوم جو اپنی حکومت اور سلطنت قائم کرلے ملت کہلاتی ہے سلطنت کے قیام کے بعد ملت کا ظہور ہوا کرتا ہے۔ شاذ و نادر ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ سلطنت کے قیام سے پہلے ہی ملت کا وجود پایا جائے۔ ایسی ملت یہودی قوم کی تھی یہ لوگ سلطنت تو نہ قائم کر سکے تھے مگر قانون کے ماتحت کام کرتے تھے اور چونکہ قانون ہی کی موجودگی سے کسی سلطنت کا قیام ہوتا ہے لہذا یہودی قوم سلطنت قائم کرنے سے پہلے ملی درجہ تک پہنچ گئی تھی۔

اگر کسی ملت میں ایک ہی قوم کی کثرت ہو تو اس قوم کی زبان اور رسم و رواج پوری ملت پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اور اگر مختلف اقوام کے مجموعہ سے اسطرح ملت بنی ہو کہ اس میں متوازن اقوام ہوں یعنی ایک قوم دوسری قوم سے تعداد میں تقریباً مساوی ہو تو ملی اشیاء و رسوم کی یکسانیت نہیں ہوتی۔

ملت کے قائم ہونے کے بعد ہی اس ملت کے حقوق و قوانین کی ترقی شروع ہو جاتی ہے یہ ایسا اجتماع ہوتا ہے جسکی ہستی سیاسی و قانونی ہوتی ہے۔ اسکی ہستی افراد ملت کو اپنی جمعیت اور یگانگت کی قوت سے محض قوم (غیر سیاسی اجتماع) سے افضل ثابت کر دیتی ہے۔ اور اسکا عروج و زوال ذی حیات ہستیوں کے عروج و زوال کے مانند ہوتا ہے۔ اگرچہ بالکل اسی طرح نہیں ہوتا۔

ملت نام ہے ذی حیات، ذی حس، صاحب روح، قانونی اور سیاسی اجتماع کا اور قوم صرف معاشرتی اور ثقافتی یگانگت کا نام ہے۔ ملت کے لئے سلطنت کا ہونا ضروری ہے۔ قوم بغیر سلطنت قائم کئے ہوئے اپنی ہستی قائم رکھتی ہے

مقالہ سوم۔ حقوق ملل

ملی ہستی کے قیام کے لئے اس زمانہ مین ہر ملت سرگرم ہے۔ ملی آزادی کے قائم رکھنے کیلئے ملل عالم اپنی ہر عزیز چیز کے نثار کرنے کو نعمت سمجھتی ہین۔ ملی حقوق کا طلب کرنا ہی اسکی دلیل ہے کہ موجودہ زمانہ مین تہذیب و شائستگی ترقی کر رہی ہے اور شاعر و مدبر کا بہترین غرض یہ ہے کہ ملت کے درجہ سے بلند تر درجۂ انسانیت کو اپنا نصب العین قرار دیکر کل دنیا کی واحد سلطنت قائم کرنے کی کوشش کرے۔

(۱) حق حیات | ہر ایک ملت کے مندرجہ ذیل حقوق ہین جنکا حصول اور نگہداشت ہر ملت کے لیئے لازمی ہے سب سے پہلا اور اہم ترین حق، حق حیات ملی ہے چونکہ اسی پر دیگر حقوق کی بنا ہے۔ حق حیات اصل ہے اور باقی حقوق فروع حیات ہین۔ خواہ کوئی ملت چھوٹی ہو یا بڑی کسی دوسری ملت کو قدرتاً و اخلاقاً یہ حق حاصل نہین کہ اس حق کو اس سے چھینے یا اس سے محروم کرنے کی بلا وجہ کوشش کرے۔ ایک عضو مجروح دوسرے اعضا کے لئے مضر ثابت ہو سکتا ہے اور انجام کار اسکا کاٹنا ضروری ہوتا ہے اگر اسی طرح کوئی قوم حیات ملی کے لئے غیر مفید و مضرت رسان ثابت ہو تو اس قوم کی تربیت نئے تمدن کے اثر سے کی جا سکتی ہے مگر حق حیات کو کوئی غصب نہین کر سکتا۔

۲۔ زبان | زبان ایک مضبوط رسی ہے جسمین پوری ملت وابستہ ہوتی ہے۔ زبان ہی سے ملی تخیلات و جذبات ظاہر ہوتے ہین اسی سے ملی تہذیب و تمدن کا اندازہ کیا جا سکتا

زبان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس حد تک اس ملت نے علمی و ادبی ترقی کی ہے حکومت نہ اس حق کو چھین سکتی ہے نہ کسی خاص قسم کے رواج کو روک سکتی ہے اسی بنا پر ملی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سلطنت صحافت و ادب کو قطعی آزادی دے۔ بشرطیکہ یہ آزادی اصول اخلاق کے ماتحت ہو یہ ممکن ہے کہ ایک ہی سلطنت کے اندر مختلف زبانین رائج ہون ہر ایک زبان کو ایسی صورت مین حقِ حیات و ترقی حاصل ہے تاہم سلطنت کسی خاص زبان کو ملکی و سیاسی کامون کے لیے مقرر کر سکتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ مین تین زبانین پہلو بہ پہلو بولی جاتی ہین اور تینون زبانون مین حکومت کے اعلانات وغیرہ شائع ہوتے ہین مگر اس امر سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ملی یکجہتی کے لیے پوری ملت کی ایک ہی زبان ہونا باعث ترقی ہوتا ہے اور ترقی تعلیم کے لیے بھی یہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ ملی زبان کا رواج تعلیم گاہون مین کرنا سلطنت کا فرض ہے اور کسی مہذب قوم پر اس سے زیادہ اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ اسکی زبان کا رواج نہ ہو سکے یا وہ علمی زبان نہ ہونے پائے اور بجائے اسکے دوسرے اپنی زبان جاری کی جائے۔

۳۔ رسم و رواج ہر ملت و قوم کے رسم و رواج مختلف ہوتے ہین بہت سی رسمین تاریخی یادگار ہوتی ہین اور ہر رسم کے کچھ نہ کچھ مفید معنی ضرور ہوتے ہین قدیم یونان مین کمزور بچون کو مار ڈالنے کی رسم تھی تاکہ قوم کمزور نہ ہونے پائے۔ ہندوستان مین ستی کی رسم تھی۔ تاکہ عمر بھر جلنے کے بجائے ایک ہی دفعہ اپنی زندگی شعلون کے نذر کیون نہ کر دی جائے بعض وحشی اقوام مین آدم خوری کی رسم تھی اسی قسم کی رسوم کا مٹا دینا مہذب دنیا کا فرض تھا۔ کردو

بچون کے لئے شفاخانے اور ستی ہونے والیون کے لئے پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر نے دوبارہ شادی کی تجویز قوم کے سامنے پیش کی مگر ایسی رسمین جو مخرب اخلاق ہونے کے بجاے سوسائٹی مین رنگینی یا کسی قومی یادگار کو تازہ کرتی ہین یا کوئی برا اثر پیدا نہین کرتین انکے زندہ رکھے جانے کا ہر قوم مطالبہ کر سکتی ہے لہذا ہر قوم و ملت کا حق ہے کہ اپنے رسم و رواج کو قائم رکھ سکے۔

۴۔ قانون مسلمانون کی حکومت کا سیلاب جب پھیلا تو انکی یہ حکمت عملی کہ انھون نے مفتوحہ اقوام کے رسم و رواج قانون و مذہب پر دست درازی نہین کی نہایت مفید ثابت ہوئی اسی طرح انگریزون نے ہر ملک کے قانون کو قائم رکھ کر آیین رفتہ رفتہ نیا قانون جاری کیا رومیون نے مفتوحہ اقوام کو فوراً رومی قوانین پر چلانا چاہا اسکی وجہ سے سخت انقلاب ہوتا رہا ہے۔ وہ قوانین جو ہمیشہ سے کسی ملت مین رائج ہین اور ملی ترقی و زندگی کے مانع نہین انکو رائج رکھنے کا ہر قوم کو حق حاصل ہے اگر یکایک کوئی بلند تر قانون کسی پست یا نیم مہذب قوم مین رائج کر دیا جائے تو بدامنی کا نمودار ہونا ضروری ہے خواہ وہ قانون کتنا ہی اچھا ہو۔

۵۔ آزادی ان سب باتون کے لئے ملی آزادی ضروری ہے مجموعی حیثیت سے ایک ملت کو دوسری ملتون کے سیاسی اثرات سے محفوظ رہنے کا حق ہے اور اخلاقی دماغی آزادی حاصل کرنا ہر ملت و ہر فرد ملت کا فرض اولین ہے اگر کوئی حکومت اس حق کو چھینے تو اس ظلم کے خلاف جنگ کرنے سے زیادہ کوئی جنگ بہتر اور مفید تر نہین ہو سکتی یہ نہایت پاک اور مبارک جنگ ہوتی ہے جسمین اپنی ہر چیز کو جو عزیز ترین ہو قربان کر دینا انسانی فرض ہے چونکہ عزت ملی بغیر قربانی کے حاصل نہین ہوتی۔

مقالہ چہارم۔ ملت اصولِ قیامِ سلطنت ہے

ملت ہمیشہ قومی رہی

تاریخ عالم مین ہمیشہ سیاسیات اور سلطنتون پر ملی رنگ غالب رہا ملی یکجہتی اور ملی آزادی کے قائم رکھنے کے لئے یونانیون کی جنگ زرکسیس شاہ ایران سے ہوئی اور جرمن اسی بنا پر رومیون سے لڑے۔ رومی سلطنت کے دو حصے یعنی لاطینی و یونانی ملی اختلاف کی وجہ سے ظہور مین آئے قدیم تاریخ مین اصول ملت اتنے محسوس طریقہ سے کام نہین کر رہا تھا جتنا کہ موجودہ زمانے مین ہے آئرلینڈ و انگلستان کا اختلاف اصول ملت پر ہے۔ بلغاریہ۔ سرویہ۔ یونان وغیرہ ترکی سلطنت سے ملت کی وجہ سے الگ ہوگئین۔ لہٰذا اس زمانہ مین ملت اصول سلطنت اور اصل سیاست مان لی گئی ہے۔

نپولین اور ملل یورپ

جب نپولین نے پارس اعظم کی سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا تو ملت فرانسوی اسکی قوت بازو تھی مگر فرانسیسی حکومت کو دوسرے اقوام نے نفرت وخوف کے ساتھ دیکھا اور نپولین عالمگیر حکومت یورپ پر نہ قائم کر سکا لیکن باوجود خداداد قابلیت کے نپولین اسوجہ سے قومون کے جذبات کو نہ پہیر سکا۔ کہ وہ اصول ملت کے سمجھنے سے قاصر تھے جذبہ ملی یا حس قومی اسوقت درجہ تکمیل تک نہین پہونچا تھا۔ اگرچہ عوام مین حس پیدا ہو چلی تھی تاہم روح ملی بیدار نہین ہوئی تھی۔ ملت فرانسیسی سے انگریز محض اسوجہ سے نفرت نہین کرتے تھے کہ دوسری اقوام کو فرانسیسی انقلاب سے سخت نفرت تھی بلکہ یورپ مین فرانسیسی اقتدار انکی تجارت کے لئے نہایت مضر ہوتا۔

انگریزوں نے باوجودیکہ بلند سیاسی زندگی قائم کرلی ہے تاہم ملت کو بطور سیاسی اصول کے ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھا وہ جانتے ہیں کہ انکا جزیرہ مختلف ملتوں کا مجموعہ ہے آئرلینڈ کی کلٹک قومی حس نے متواتر انکی ملی یکجہتی کے ٹکڑے اڑا دینے کی کوشش کی ہے کشور ہندوستان بھی اس ملی حس کے پیدا ہوجانے سے غیر محفوظ ہوگیا ہے اس طرح اسپین کے باشندوں نے جب فرانسیسوں سے جنگ کی تو اپنی ملی یکجہتی کو محسوس کرلیا تھا اگرچہ یہ جذبہ ملی زندگی کے قیام کے بجائے اپنے کیتھولک مذہب اور اپنے بادشاہ کے بچانے کے لیے تھی انقلاب فرانس نے آزادی کا سرسری اعلان کیا تھا جو تسلط ہونے کے بعد پامال کر دیا گیا وینا کی کانگریس نے حقوق کی قطعی پرواہ نہ کی اور مسلط شدہ خاندانوں میں مختلف ملتوں کے ملکوں کو تقسیم کر دیا۔ پولینڈ روس آسٹریا و جرمنی میں تقسیم ہوگیا اور باوجود اختلاف ملل کے بلجیم اور ہالینڈ کی ایک متحدہ سلطنت بنا دی گئی۔

ہر قوم کے لئے نئی سلطنت انتہائی اصول۔

قوم سیاسی سوسائٹی کو نہیں کہتے لیکن اگر یہ اپنی تہذیب کو محسوس کرے اور روح ملی کو بیدار پائے تو یہ فطری بات ہوگی اگر ایسی قوم اپنی پوری ہستی قائم کرکے اپنی واحد آزادی کو عملاً ظاہر کر سکے بالفاظ دیگر اپنی سلطنت قائم کر سکے۔

ملت کو عملی اصول سلطنت ماننے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ملی زبان۔ تہذیب و علوم کی حفاظت کی جائے بلکہ سلطنت خود ملی ہو جائے صاف الفاظ میں اسکا مفہوم یہ ہے کہ

(۲) ہر قوم کو ضرورت ہے اور حق حاصل ہے کہ اپنی سلطنت قائم کرے جس طرح دنیا مختلف قومون مین تقسیم ہے۔ اسی تعداد مین سلطنتون کا قائم ہونا بھی ضروری ہے یعنی ہر قوم کو علیحدہ حکومت ہونا چاہیئے اور ملت سلطنت کی بنا یا اصل الاصول ہوگیا یہ صحیح ہے اسکے دریافت کرنے کے لئے ہمین قوم اور سلطنت کا مقابلہ انکے حدود اور وسعت کے لحاظ سے کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا کیا اختلافات رونما ہوتے ہین۔

۱۔ ایک ہی قوم مین کئی سلطنتین | اگر سلطنت کے حدود قوم کے حدود سے کم ہون تو دو متضاد صورتین ہمارے پیش نظر ہوتی ہین۔

(الف) علیحدگی | اگر باشندگان سلطنت کو اپنی سیاسی یکجہتی کا زیادہ احساس ہوتا تو یہ سلطنت اپنی قومون مین ایک نئی ملت کے علیحدہ قیام کا سبب بن جاتی ہے جیسے ممالک متحدہ امریکہ نے ایک نئی سلطنت انگریزی سلطنت سے الگ ہوکر قائم کرلی یہ علیحدگی کہلاتی ہے

(ب) اتحاد | جب ملی محسوسات کمزور ہونے لگتے ہین تو اسی ملت کی دیگر سلطنتین ملکر ایک بڑی متحدہ سلطنت قائم کرلیتی ہین مثلاً موجودہ جرمنی واٹلی و جمہوریہ متحدہ وغیرہ۔

۲۔ ایک ہی سلطنت مین کئی قومین | اگر سلطنت کے حدود قوم سے وسیع ہون یعنی اسمین دو یا دو سے زیادہ قومین یا قومون کے حصے شامل ہون تو مندرجہ ذیل صورتین ہوتی ہین۔

(الف) انجذاب | کسی قوم کی بہتر تہذیب اور شائستگی دوسرے اجزا کو اپنے مین جذب کرکے پوری ملت کو قوم واحد بنا دیتی ہے مثلاً روس نے اہل پولینڈ کو روسی بنانا چاہا اور پرشیا نے اہل ہنگری اور دیگر اقوام کو اپنے اندر جذب کرلیا۔

(ب) علیحدگی | مختلف قومین سیاسی علیحدگی کے طرف متوجہ ہوتی ہین جیسے تحریک علیحدگی آئرلینڈ و انگلستان۔ پولینڈ و روس وغیرہ۔

(ج) اتحاد اختلاف | سلطنت بغیر کسی قوم کے ساتھ خصوصیت رہتے ہوئے مختلف قومون کو متحد رکھ سکتی ہے یا تو۔

۱۔ منصفانہ حکومت کے ذریعہ سے جس مین مختلف قومون کے حقوق ترقی برابر ہون جیسے سوئٹزرلینڈ مین جرمن مختلف اقوام پہلو بہ پہلو آباد ہین اور مساوی حقوق رکھتی ہین۔

۲۔ قوت سے جس طرح اسٹریا کی مختلف سلطنتین دوسری سلطنتون کے مجموعی دباؤ سے متحد ہین مگر ایسی حالت خطرناک ہوتی ہے۔

۳۔ فوجی طاقت اور اقوام محکومہ کی تفریق سے حکومت قائم رکھی جا سکتی ہے جیسے ہند کی دفتری حکومت۔

حقوق ملت کا خلاصہ

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصول ملت اور سلطنت ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہین لیکن یہ ضروری نہین ہے کہ ملت اور قومیت تطبیق کرے یعنی بالکل ایک ہون اسی وجہ سے ہم اصول ملت کا کوئی خالص حق قائم نہین کر سکتے اور زیادہ غور کرنے پر مندرجہ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہین۔

۱۔ سیاسی قابلیت | ہر ایک قوم اس قابل نہین ہوتی کہ سلطنت قائم کرکے اسکو

باقی رکھے وہی قوم سلطنت قائم کر سکتی ہے جس مین سیاسی قابلیت ہو۔ ناقابل قومون کو زیادہ قابل ملتون کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے کمزورون کے لئے ضروری ہے کہ وہ طاقتورون کے سہارے سے کام کرین تاکہ رفتہ رفتہ خود بھی قوی ہوجادین دراصل وہی قومین جن مین صفات مردانگی دماغی قابلیت اور بہادری غالب ہوتی ہین ایک ملی سلطنت قائم کرکے جاری رکھ سکتی ہین بخلاف انکے وہ قومین جنمین یہ صفات نہون ہمیشہ طاقتور ملتون کی محکوم رہتی ہین۔

۲- اختلاف باعث قوت ہی یا کمزوری چونکہ ہر ایک قوم کا جوہر تہذیب ہے نہ کہ سیاسی اتحاد۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی تہذیب کو جان بوجھکر بھی سیاسی طور پر آپس مین اختلاف رکھتی ہو اسکا ایک حصہ شاہ پسند اور دوسرا حصہ جمہوریت پسند ہو۔ (مثلاً ائرلینڈ) یہ اختلاف بعض اوقات سیاسی کمزوری کا باعث ہوتا ہے اسی اختلاف کی وجہ سے ہندوستان محکوم بنا ہوا ہے اور جرمنی اور اٹلی نے عرصہ دراز تک سیاسی ترقی نہ کی علاوہ برین ایک ہی قوم کی دو سلطنتین اس قوم کی ترقی کا باعث ہوسکتی ہین جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکا اور انگلستان۔

۳- سیاسی زندگی کا حق وہ قوم جو اپنی زندگی کو محسوس کرتی ہے اسے فطرتاً سلطنت قائم کرنیکی ضرورت ہوتی ہے کسی قوم کی ہستی و ارتقا کے حق کے سامنے افراد قوم کے ذاتی حقوق کوئی درجہ نہین رکھتے بقول بسمارک "اقوام دنیا کو سانس لینے اور اپنے اعضا ہلانے کی آزادی ہونی چاہئے بشرطیکہ وہ زندہ رہنا چاہتے ہون" یہ اس پاک حق کی بنیاد ہے جو ہر قوم کو اپنی متحدہ زندگی کے اظہار کے لئے حاصل ہے تاکہ وہ اپنی سلطنت قائم کرسکین۔

۴۔ سلطنت قومی | ملّی سلطنت مین پوری قوم کا شامل ہونا ضروری نہین ہے ایک بڑے اور مضبوط حصّہ قوم کا ہونا کافی ہے تاکہ وہ اپنی تہذیب کو سلطنت مین جاری کر سکے اصول ملّت کو اگر بہت زیادہ بڑھادیا جاوے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملّی سلطنت کو اتنا ہی بڑا ہونا چاہئے جہانتک انکی زبان بولی جاتی ہے مگر یہ سلطنت کی ہستی کے قیام کے لئے ضروری نہین ہے فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی۔ ملّی سلطنتین ہین حالانکہ فرانسیسی اطالوی اور جرمنی قومون کے کچھ حصے انکے قبضہ سے باہر ہین کوئی قوم جو ملّت کی حدتک پہونچ رہی ہو اپنے افراد کو جمع کر سکتی ہے مگر یہ حق اسوقت قائم نہین رہتا جب بغیر انکو جمع کئے ہوئے یہ ملّت اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔ اور نہ اُسے یہ حق حاصل ہے کہ انکو اس سلطنت سے زبردستی چھین سکے جس سے وہ خوش ہین۔ افغانستان کی زبان پشتو ہے اور اسے اپنے ملّی سلطنت کے قیام کے لئے کل اقوام کو جو پشتو بولتی ہین جمع کرنا ضروری ہے بشرطیکہ بغیر انکے اسکی آزادی نہ قائم رہ سکے اور وہ اقوام بھی اُسپر خوش ہون۔

۵۔ بہترین سلطنت | سیاسی ترقی کی انتہا ملّت نہین ہے بلکہ انسانی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف قومین آزادی سے میدان ترقی مین مقابلہ کرین بلکہ ایک بالاتر اتحاد قائم کرین قانون بجائے قومی خصوصیات کے زیادہ تر انسانی فطرت پر مبنی ہے مہذب اقوام کا ترقی یافتہ قانون زیادہ تر انسانی اجتماع کی ضروریات پر منحصر ہوتا ہے بجائے اسکے کہ وہ ملّی رسم و رواج کا پابند ہو۔ مختلف ملتون مین سلطنت کے ضروری شعبہ ایک ہی قسم کے ہین اور سلطنت کا بہترین تخیل یہ ہے کہ اسکی بنیاد انسانیت پر ہو۔

لہذا ایک ملی سلطنت کئی ملل پر مشتمل ہو سکتی ہے نیز وہ سلطنت جو صریحاً ملت پر مبنی ہے اپنی وسعت اور قوت بیرونی عناصر کے شامل کرنے سے حاصل کر سکتی ہے یعنی اُسے دوسری ملتوں کی تہذیب سے تعلق رکھنے مین عذر نہ کرنا چاہیئے اس قسم کا اختلاط ایسا ہے جیسا کہ چاندی مین تھوڑا سا تانبہ ملا دینا جس سے وہ زیادہ دیرپا اور مضبوط ہو جاتی ہے۔

۶- اتحاد | سلطنت کے اتحاد کے لئے یہ زیادہ مفید ہوتا ہے کہ اسکی بنیاد ایک ہی ملت پر ہو جسمین آبادی کے دوسرے عناصر کا حصہ بہت ہی کم ہو جس طرح جرمنون کی تعداد روس مین یا یہودی جرمنی مین یا فرانسیسی شمالی امریکہ مین ہین بخلاف اسکے اگر کوئی ملت ایسی قومونکا مجموعہ ہو جو ایک دوسرے سے طاقت اور اہمیت مین سبقت لیجانا چاہتے ہون تو ایسی حالت مین ملی اتحاد کا قائم رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ انگلستان نے اس دقت کو رفع کرنے کے لئے پہلے سیکسن قوم کو نارمن سے اور پھر انگریز کو اسکاٹ لینڈ والون سے اور ان دونون کو اہل آئرلینڈ سے ملایا ہندوستان کی ملی تحریک مین ہندو مسلمان۔ پارسی۔ عیسائی سکھ اتحاد پر اسی درجہ زور دیا جا رہا ہے کہ بغیر اسکے قیام سلطنت ناممکن ہے۔

۷- مساوات | اگر کسی سلطنت مین مختلف اقوام ہین جو سب ملکر ایک ملت بن گئی ہین تو ایسی صورت مین حقوق کا مساوی ہونا لابدی ہے۔

۸- تاریخ کا فیصلہ- | کونسی قوم کہانتک سلطنت قائم کرنے کے قابل ہے اسکا فیصلہ قانون بین الاقوام کے غیر مکمل ہونے کی صورت مین انسانی عقل فیصلہ نہین کر سکتی یہ فیصلہ ہمیشہ سے فیصلہ خداوندی پر منحصر رہا ہے جیسے اس نے تاریخ عالم پر وقتاً فوقتاً ظاہر کیا ہے۔ انجمن

بین الاقوام ان سلطنتون کے حقوق کا زیادہ خیال کرتی ہے جو زیادہ طاقتور ہین اور ابھی تک مشرقی و مغربی دنیا کے اتحاد کی کوئی قانونی انجمن قائم نہین ہوتی ہے لہذا ہمین تاریخی اصولون کی بنیاد پر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ مسلسل اور عظیم جنگون اور اپنے اوپر تکالیف اور انتہائی قربانی کرنے کے بعد کوئی ملت اپنا حق ثابت کر سکتی ہے۔

اگر کوئی سلطنت اپنا فرض ادا کرنا چاہتی ہے تو ضروری ہے کہ اسکے قوانین اور محکمے اپنے قوم کی ضروریات اور قابلیتون کا خیال رکھین مختصراً یہ حکومت ملی ہوگی لہذا وہ دستورالعمل جو اپنی قوم کے خاص طرز عمل کو نظرانداز کرتا ہے اور جو اسکی روح اور تخیل سے تطبیق نہین کرتا غیر فطرتی اور بیکار محض ہے اگر ایسی حکومت کسی غیر قوت کے ذریعہ سے لوگون پر جبراً عاید کیجائے تو وہ اس ملت کی قوت کے زوال کے ساتھ یا قومی بیداری کے شروع ہوتے ہی فنا ہوجاتی ہے اور ہر صورت مین سیاسی نشوونما کو ایسا صدمہ پہونچتا ہے کہ یہ قوم یا زوال پذیر ہوجائے یا کمزور ہوجائے۔

ہر قوم جو ملت و سلطنت بن سکتی ہے اسکا ایک خاص سیاسی نقطہ نظر اور خاص طرز حکومت ہوتا ہے اور یہ اس وقت تک نہین ہوسکتا جب تک کہ وہ سلطنت پر اپنے طرز عمل کا اثر نہ ڈالے یہ معنی ہین اس اصول کے کہ ہر قوم کو حق فطرتی حاصل ہے کہ وہ قومی دستورالعمل بنائے دنیا کی اقوام کے مختلف دستور ہائے عمل ان خداداد قابلیتون کو ظاہر کرتے ہین جو خدا نے ان اقوام اور ملل کو ودیعت کئے ہین ہر قوم اپنی ترقی کے تبدیل ہونے والے درجون سے گذر جاتی ہے اور حقیقت مین یہ وہی قوم رہتی ہے جو پہلے تھی مگر اسکی ضروریات اور نصب العین اپنی

زمانۂ زندگی کے ضروریات کے مطابق تبدیل ہوا کرتے ہین - ایک قومی اور ملی سلطنت اپنی ملی
ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی ہے لیکن اپنی ہستی کو مکمل طور سے کبھی ضائع نہین کرتی حکومت
روما مین اگرچہ بہت کچھ تبدیلیان ہوئین لیکن اس کا رومی طرز عمل اور خصوصیات زائل نہین
ہوئین رومیون نے شاہی جمہوری اور شہنشاہی حکومت قائم کی مگر ان سب مین روم
کی صاف جھلک موجود تھی انگریزی شاہی شاہان ٹیوڈر کے زمانے مین شاہان ہنوور سے
مختلف تھی چونکہ اس قوم نے سولھوین اور اٹھارھوین صدی کے درمیان ترقی کر لی تھی
اسی طرح اکبر کی سلطنت اورنگ زیب کی سلطنت سے مختلف تھی تاہم انگریزون اور ہندوستانیون
کی جو خصوصیات تھین وہ سلطنت کے تبدیل ہونے پر بھی قائم رہین ہمارا مطلب صاف
ظاہر ہے کہ ہر قوم کا یہ قدرتی حق ہے کہ وہ اپنے نظام حکومت کو زمانے کے مطابق تبدیل
کرتی جاوے -

مختصراً یہ کہ ہر سلطنت قطعی فطرتی ہوتی ہے اگر اسکا نظام حکومت کسی زمانے مین ملت
کے خاص طرز عمل اور زمانہ ارتقا کے مطابق تبدیل ہوتا جائے - اور نظام حکومت کے بدلنے
سے ملت مین کوئی تبدیلی نہین ہوتی بلکہ وہ اپنی ہستی قائم رکھتی ہے -

مقالۂ پنجم - سوسائٹی (جماعت)

مدبرین فرانس نے (خصوصاً روسو کے زمانہ سے) سلطنت کو سوسائٹی کے مانند سمجھا ہے اور ملت و قوم کو سوسائٹی کا مترادف خیال کیا ہے۔ اسی وجہ سے علم سیاسیات مین پیچیدگیان پڑگئین اور سیاسیات کو نقصان پہونچا۔ جرمن مدبرین نے اسکو بہتر سمجھا اور سلطنت کو زیادہ مستقل بنیاد پر قائم کیا۔

سوسائٹی کا تعلق ملت و سلطنت سے

ملت ایک مستقل اور مکمل اجتماع ہے لیکن سوسائٹی افراد کے اتفاقیہ یکجا ہونیکو کہتے ہین۔ ملت ذی حیات باقاعدہ قانونی قوت اور آزادی رکھنے والی سیاسی ہستی ہے سوسائٹی بے قاعدہ غیر سیاسی اور بجائے ذاتی قوت آزادی اور نافذ قانون و انصاف ہونے کے صرف رائے عامہ رکھنے والی جماعت ہے اسمین شک نہین کہ سوسائٹی اور ملت ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہین اور سوسائٹی سلطنت کے لئے دماغی اور معاشرتی منبع ہوتی ہے اسکا زوال سلطنت کا زوال اور اسکی صحت و ترقی سلطنت کی قوت ہوتی ہے لیکن سوسائٹی ہمیشہ سلطنت کی ہم آہنگ نہین ہوتی بسا اوقات سوسائٹی سلطنت سے اپنے گوناگون مطالبات کے پورا کرانے مین ساعی ہوتی ہے اور اکثر سلطنت سوسائٹی سے اس قربانی و ایثار کی طلبگار رہتی ہے۔ جیسے سوسائٹی دینے مین تامل کرسکتی ہے اور اکثر کرتی ہے۔

سوسائٹی کا تعلق قوم سے

سوسائٹی کا تعلق قوم سے ہے مگر یہ ایک دوسرے

کا مترادف نہیں ہے سوسائٹی جو زبان مناسب سمجھتی ہے استعمال کرتی ہے مگر قوم کی خاص زبان اور خاص تمدن ہوا کرتا ہے ایک قوم دو سلطنتوں پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ مگر سوسائٹی کا تخیل ایک ہی سلطنت کے افراد تک محدود ہے قوم کا قدرتی نظام ہوتا ہے اور سوسائٹی صرف افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔

مقالہ ششم قبیلہ

جس طرح نسلیں مختلف قوموں میں تقسیم ہیں اسی طرح ایک ہی قوم کے متعدد قبیلے ہوتے ہیں اور ایک قوم کے متعدد قبائل اپنی زبان و رسم رواج کی یکرنگی سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر قبیلہ کی انفرادی خصوصیات کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہیں مگر اس وجہ سے وہ اپنی قوم سے علیحدہ نہیں ہو سکتے یہ صرف قوم کے اندرونی اختلافات کی مظہر ہوتی ہیں اگرچہ ملی زندگی میں ان اختلافات سے نیرنگی اور نئے خیالات کا ظہور ہوتا ہے لیکن اکثر سلطنت کے اتحاد کو ان سے نقصان پہونچتا ہے مثلاً روما کو اپنے مختلف سیاسی فرقوں کے اختلاف سے گو قوت حاصل ہوئی لیکن یہی وجہ یونان میں متحدہ سلطنت کے قائم ہونے سے مانع ہوئی۔

قبیلہ کا باہمی اختلاف

وسط ایشیا کے مختلف قبیلہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرجنگ رہے اور بعض قبائل خانہ بدوش زندگی بسر کرتے رہے اسی طرح عرب کے قبائل ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے اور اپنے اختلافات کی وجہ سے متحدہ سلطنت کو قائم کرکے زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رکھ سکے۔ اسلام نے عربی قبائل کی اس حالت کو بدلکر اتحاد قائم کرنا چاہا اور بجائے خانہ جنگی کے انکی جنگجو فطرت کو ان لوگوں سے جنگ کرنے پر رجوع کردیا جو گو ان کے قبیلوں کے دشمن نہ تھے لیکن ان کے مذہب کے دشمن تھے ایسی حالت میں اگرچہ متحدہ ملی احساس پیدا ہونا شروع ہوگیا مگر قبیلہ بندی کی عمیق حس دور نہ ہوئی اور بنی امیہ و بنی عباس پھر لڑنے لگے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں وسط ایشیا کے

قبائل میں اتحاد قومی پیدا ہو گیا ہے اور اسی طرح افغانستان کے مختلف خیل قومی یکجہتی کی طرف مائل ہو کر سلطنت قائم کر چکے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ قبائل کا باہمی اختلاف دور ہو گیا ہے اور تعلیم نے بلند اتحاد کیطرف ان قبیلوں کو رجوع کر دیا ہے۔

قبیلہ ایک تخم ہے جس سے درخت قوم نمودار ہوتا ہے لیکن بجائے نئی قوم و تہذیب قائم کرنے کے ایک قبیلہ ہی سلطنت قائم کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ سلطنت نہایت ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ وسط ایشیا کے متعدد قبائل نے گو نئی سلطنتیں قائم کر لی ہیں لیکن اُنکی تہذیب اور طرز حکومت ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ ہے

مقالہ ہفتم۔ ذاتیں

قوم اور قبیلہ کے حصے

قوم یا قبیلہ کے جغرافیائی حدود کے اندر ایسے اختلافات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ جو جغرافیائی حدود کے متوازی نہیں ہوتے گویا یہ سوسائٹی کے مختلف درجے ہیں جو سیاسی اہمیت و ترقی کے لحاظ سے بالاتر یا کم درجہ کے ہوتے ہیں یہ درجے ذاتیں طبقات خصوصی۔ اور جماعات ہیں طبقات خصوصی کا ذاتوں سے یہ امتیاز ہے کہ انکی ترقی تاریخ کے اثر سے ہوتی ہے یورپ میں ذاتیں خاص طبقات میں تبدیل ہوگئیں ہیں اور انمیں مختلف تبدیلیاں پیدا ہوگئیں ہیں۔

ذاتوں کا نظام ہندوستان میں نہایت مکمل طریقہ سے موجود ہے اگرچہ ذاتوں کا اثر مصر و ایران میں بھی بہت کافی رہا ہے۔ لیکن ایشیائی آریوں کی ہی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں ذاتیں نمودار ہوئیں اسی طرح امریکہ میں بجائے ذات کے مسئلہ رنگ موجود ہے یعنی سفید رنگ کے انسان یا سیاہ حبشی یا سرخ امریکی کی گویا ذاتیں قائم ہیں۔ زمانہ قدیم سے اکثر اقوام میں متعدد درجے یا طبقے موجود ہیں۔ یورپ کی ٹیوٹن اقوام نے ان درجوں یا طبقات خصوصی کو زمانہ قدیم میں درجہ کمال پر ظاہر کیا تھا ذاتیں قدرتی یا خدا کے مقرر کردہ درجے سمجھے جاتے ہیں۔ طبقات خصوصی تاریخی مدوجزر سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور فنا ہوجاتے ہیں۔ اور جماعتیں حکومت کی قائم کردہ ہوتی ہیں۔ ذاتوں میں مذہب کا اثر، طبقات خصوصی میں اجتماعی زندگی اور جماعتوں میں و تعلیم و جہالتوں کی قوت ظاہر ہوتی ہے اور جماعات سے مدبر کی سیاسی قابلیت کا اظہار ہوتی ہے

ذاتیں پیدائشی اور ناقابل تبدیل ہوتی ہیں۔ طبقات خصوصی پودوں کی طرح بڑھتے ہیں اور ملتوں اور سلطنتوں کی طرح ترقی کرتے ہیں قدیم زمانہ میں یہ بھی مثل ذاتوں کے پیدائش پر منحصر تھے مگر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ جماعت کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں جماعات سلطنت کے نصب العین کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

ہندو ذاتیں افلاطون نے اپنی کتاب دو جمہوریہ میں انسان کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا ہے (۱) حکومت کرنیوالی ذات۔ (۲) جنگ کرنیوالی ذات (۳) تاجر پیشہ (۴) خدمت گار تقریباً یہی تخیل ہندو ذاتوں میں عملاً ظاہر ہوا ہے۔ جسے ہم مختصراً درج ذیل کرتے ہیں

برہمن منو کے دہرم شاستر نے برہمنوں کی ذات کو سب سے اوّل درجہ دیا۔ یہ گویا برہما کے سر سے پیدا ہوئے تھے اسی وجہ سے وہ دماغی و روحانی پیشوا قرار پائے سائنس۔ مذہب اور قانون انکی حفاظت میں رہا۔ ذلیل ترین برہمن بھی بادشاہوں سے بلند مرتبہ رکھتا ہے اگرچہ دنیاوی کاروبار میں حصہ لینا انکے لئے ممنوع نہیں ہے تاہم یہ ذات سراسر مذہبی اور علم و فن کی محافظ جماعت ہے اگر کوئی شخص کسی برہمن کو ایک تنکا بھی مار دے تو ابدالاباد کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے

۲۔ چھتری دوسری ذات جو برہما کے بازوؤں سے پیدا ہوئی۔ وہ چھتری ہے۔ یہ گویا طاقت و قوت کے اوتار ہیں اور زیادہ تر بادشاہ راجہ اور صاحب حکومت لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ذات جنگجو سپاہیوں کی ذات ہے انکا اصلی پیشہ جنگ کرنا ہے اگرچہ انہیں تجارت کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

۳۔ ویش تیسری ذات ویش ہے انکا کام تجارت۔ زراعت اور جانوروں کا پالنا وغیرہ ہے۔ یہ ہندوؤں کا نہایت پرامن طبقہ ہے۔ جو صرف تجارت ہی کرسکتا ہے۔ اور مندرجہ بالا ذاتوں سے کسی قدر کم درجہ رکھتا ہے۔

۴۔ شودر چوتھی نہایت ذلیل ذات شودر ہے۔ یہ برہما کے پیروں سے پیدا ہوئی ہے اس ذات کا فرض ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کی خدمت کرے اور ذلیل پیشے اختیار کرے۔ انکے لئے مذہبی تعلیم منع ہے۔

اس تقسیم میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک ذات سے دوسری ذات میں چلا جانا ناممکن ہے اگرچہ ہم اس نتیجہ پر منطقی طور پہنچ سکتے ہیں اور بعض ہندو مذہب کی کتابیں بھی ظاہر کرتی ہیں کہ ذاتوں کی تفریق انسانی تقسیم کا نتیجہ ہے۔ اسکو مذہبی جامہ اس وجہ سے پہنا دیا گیا کہ ہندوستان قدیم میں ہر کام فطرۃً مذہبی سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ تقسیم افلاطون کی تقسیم کی طرح انسانی درجۂ زندگی کو ظاہر کرتی ہے حالانکہ اب بجائے تقسیم عمل کے ذات محض پیدائش پر منحصر رہ گئی ہے۔ اصل وجہ اس تفریق کی یہ ہے کہ جب آریوں نے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ تو یہاں کے اصلی باشندوں کو بطور غلام رکھکر شودر کا لقب دیا گیا (جس طرح سے امریکہ میں سفید اقوام نے اصلی باشندوں کو غلام بنا رکھا ہے۔) ذات کا اصلی نام "ورنا" (یعنی رنگ) ہے اس سے ظاہر ہے کہ گورے رنگ والے آریہ سیاہ فام اصلی باشندوں سے رنگ کی وجہ سے الگ ہوگئے تھے برہمن اور چھتری بہ نسبت ویش ذات کے زیادہ معزز ہیں (جیسا کہ عام طور پر آریہ قوم میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ ہوتا ہے)۔

برہمنوں کا اعزاز چھتریوں پر غالباً اسوجہ سے ہوا کہ پراسنے لاتعداد دیوتاؤں کی پرستش کو چھوڑ کر برہمنوں سے برہما کے "مذہب ہمہ اوست" کو ترقی دی اور انمیں انکے بڑے بڑے رشی اور منی دنیاوی اعزاز اور طاقت کو چھوڑ کر ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اسطرح انکی عزت ہونے لگی۔

اس تاریخی ارتقا نے رفتہ رفتہ مذہبی رنگ پکڑ لیا اور ذاتیں الگ الگ ہو گئیں یہ ذاتیں نہ تو آئین سلطنت میں داخل ہیں نہ نظام حکومت کا جزو ہیں ایسی صورت میں سلطنت کی ترقی اور استحکام ناممکن ہے سیاسی نصب العین تک کوئی قوم اس وقت نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ افراد قوم ایسی ناقابل تبدیل جکڑ بند سے نہ نکل سکیں۔ جب تک اس نظام کو چھوڑ کر ہندو ذاتوں میں یکسانیت ومساوات نہ پیدا ہو گی انکی حکومت کو قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے آجکل بعض روشن خیال اور دور بیں مدبر چھوت کو دور کرنے اور اچھوت ذاتوں کو ترقی دینے میں ساعی ہیں ممکن ہے کہ بالاتر ذاتیں اپنی عزت وعلمی حالت پر خوش ہوں مگر پنچ ذات والوں کے لئے یہ ابدی ذلت ہے اس سے نہ صرف پنچ ذاتوں کی آزادی سلب ہو گئی ہے بلکہ انمیں خودداری بھی کم ہو گئی ہے جو ہندوستانیوں کیلئے باعث شرم ہونے کے علاوہ انکی سیاسی واجتماعی ترقی کو بہت کچھ روکا ہوا ہے

ذاتوں کی یہ تقسیم امن وانتظام کو قائم رکھ سکتی ہے۔ مگر اس سے زندگی وترقی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اسکا نصب العین جمود ہے اور حرکت وترقی ذاتوں کے نظام کے لحاظ سے باعث مضرت سمجھی جاتی ہے

مقالہ ہشتم

طبقات خصوصی (الف) یورپ

یورپین اقوام میں بجائے ذاتوں کے طبقات خصوصی ہیں۔ مگر ذاتوں سے ان کا یہ فرق ہے۔ کہ یہ تاریخ سے اثر پذیر ہوکر ترقی کرتے ہیں یورپ میں ذاتیں طبقات خصوصی بن گئے ہیں اور ان میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔

۱۔ طبقہ مذہبی | ملک غالبہ کے ڈروئیڈ برہمنوں کے مانند کہے جا سکتے ہیں انکی حفاظت میں مذہب سائنس اور قانون ہوتا ہے (اگرچہ وہ قومی امیروں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں) زمانۂ وسطیٰ کے عیسائی پادری برہمنوں سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔

۲۔ طبقہ امرا | طبقہ امرا یورپ میں ہر جگہ پایا جاتا تھا۔ اور برہمنوں اور چھتریوں کے فرائض کو انجام دیتا تھا یہ طبقہ پیدائش پر منحصر ہوتا تھا اس طبقہ میں پادری۔ قانون داں فوجی سردار۔ اور افسران اعلیٰ بھی ہوتے تھے۔ تجارت اور حرفت سے انکو واسطہ نہ تھا اور عموماً انکے ماتحت بہت سے آدمی ہوا کرتے تھے۔ اور وہ ہندوستان کے تعلقداروں کے مانند ان لوگوں سے اسامیوں کا سا سلوک کرتے تھے۔

۳۔ آزاد طبقہ | آزاد طبقہ کو پورے قومی حقوق حاصل تھے اور انہیں پر سلطنت اور حکومت کا دارمدار تھا طبقہ امرا ان سے بہتر حالت میں تھا مگر بخلاف اس کے کہ ہندوستانی رئیس کے مانند بلند تر ہستی سمجھا جاوے وہ انہیں میں سے ایک انسان ہوتا تھا جو کہ ترقی پاکر بلند رتبہ کا ہوجاتا تھا طبقہ آزاد عموماً زمینوں کا مالک اور اپنی کاشت

کرنیوالا ہوتا تھا وہ لوگ تجارت میں بھی حصہ لیتے تھے مگر بہت کم۔ اگرچہ حکومت کے ماتحت رہنا انکا فرض تھا مگر کسی خاص رئیس سے وابستگی یا انحصار کا ہونا ان پر لازم نہ تھا۔

(۴) نیم آزاد طبقہ

ان لوگوں کا تھا۔ جو زندگی کے ادنیٰ ضروریات کو مثل ہندستانی شودروں کے مہیا کرتا تھا یہ بعض اوقات ملک مفتوحہ کے باشندے ہوتے تھے اور بعض اوقات وہ مفلس جو قرض کی وجہ سے دائمی غلامی میں آگئے ہوں ان کی حفاظت کے لیے ایک امیر ہوتا تھا جسکو وہ اپنا سرپرست اور مربی سمجھتے تھے اور وہ قوم کے ایک جزو سمجھے جاتے تھے اور غلاموں سے انکا مرتبہ اعلیٰ اور آزاد طبقہ سے کم ہوتا تھا۔

یورپ میں طبقات بالا کا خاص قانون اور خاص طریقہ انصاف تھا اور ہر طبقہ جداگانہ قانون کا پابند تھا۔ اور ملی اتحاد کو ان اختلافات کی وجہ سے سخت صدمہ پہنچتا تھا۔ آخرکار یہ طبقے بجائے پیدائشی ہونے کے اختیاری ہوگئے اور آخری دور میں صرف چار طبقے رہ گئے۔ (۱) طبقہ مذہبی (۲) طبقہ امرا (۳) طبقہ مدنی (۴) طبقہ مزارعین قرون وسطیٰ میں یہ طبقات زوال پذیر ہونے کے بعد بڑی حد تک مٹ گئے موجودہ زمانہ میں کہیں کہیں کوئی انکا شکستہ نمونہ مل جاتا ہے۔ ان طبقات کے سمجھ لینے پر موجودہ زمانہ کی سلطنتوں کی نشوونما اور سیاسی ترقی و تنزل کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

طبقات خصوصی (ب) ایشیا

ایشیائی اقوام خصوصاً اسلامی سلطنتوں میں چار طبقات خصوصی بنتے اور چونکہ

جمہوریہ اسلام نے بہت جلد شاہی طرز حکومت اختیار کرلیا اسلئے یہاں وہی طبقات قائم ہو گئے جو پہلے موجود تھے۔

۱۔ طبقہ مذہبی | مذہب اسلام علما کو عزت و منزلت کا مستحق سمجھتا ہے۔ مگر بخلاف یورپ کے (جہاں مذہبی طبقہ سلطنت سے قطعی آزاد تھا! وہ اُسکے اُن احکامات کو نہیں مانتا تھا۔ جو یا تو اُسکی قوت کو گھٹاتے یا اُس پر ٹیکس عاید کرتے تھے) علما کا طبقہ قانون کے سامنے کسی خصوصیت کا مستحق نہیں ہے۔ اُنکی عزت اُنکے علم و عمل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور ہر مسلمان علم حاصل کرنے کے بعد اس طبقہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں میں برہمنوں کا طبقہ علما کے طبقہ کا متوازی ہے۔ لیکن اُنہوں نے اپنی تنگدلی سے اسے محدود کر لیا ہے اور کوئی دوسرا شخص اس طبقہ میں داخل نہیں ہو سکتا

طبقہ علما نسبی نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ اسی طبقہ کے پہلو بہ پہلو ایک وہ جماعت ہے جنکی عزت صرف نسبی امتیاز کی وجہ سے علما سے بھی زیادہ کیجاتی ہے۔ یہ سادات ہیں۔ انکی عزت و منزلت اسوجہ سے ہے کہ وہ آل رسول ہیں۔ اور زیادہ تر حقیقت و معرفت آگاہ سمجھے جاتے ہیں۔

علما کا فرض ہے کہ وہ تبلیغ دین کریں۔ اسی لیئے وہ مذہبی پیشوائی اور دینی رہنمائی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اور اسلامی قانون کے ماہر اور سمجھانے والے ہوتے ہیں۔ اسوجہ سے اسلامی سلطنتوں میں انکا حکومت و انصاف سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن سیاسی حکمت عملی ہمیشہ عام مسلمانوں کی رائے پر منحصر رہی ہے۔

ہندوستان میں برہمنوں کی ذات اس طبقہ سے بھی لیکن اسکو حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا سوائے اسکے کہ یہ قانون کی حفاظت کرتے اور سلطنت کے مذہبی رسوم کو انجام دیتے تھے

اور ایسے مذہبی قوانین بناتے تھے جنکی وجہ سے راجہ کا اُن سے مشورہ لینا نہایت
ضروری تھا۔

۲۔ طبقہ شاہی امرا | اس طبقہ میں بادشاہ یا راجا اور اسکے رشتہ دار اور فوجی سردار
شامل تھے ہندوستان میں اس طبقہ کے لوگ اکثر راجہ و نواب وغیرہ ہوتے تھے جنکے
پاس باقاعدہ فوج ہوتی تھی۔ اور یہ کبھی حکومت بالا کے ماتحت اور کبھی آزاد رہتے
تھے۔ شاہی نسل کے لوگ مختلف صوبوں کی حکومت یا فوجی خدمت انجام دیتے تھے
اور دنیاوی اعتبار سے کل رعایا سے افضل و اعلیٰ سمجھے جاتے تھے۔ یہ طبقہ
عام طور سے پیدائش پر منحصر تھا اور بعض اوقات معمولی طبقہ کا انسان اپنی غیر معمولی
قابلیت یا حسن اتفاق سے اس رتبہ پر پہنچ سکتا تھا عرب کے قبائل کے شیوخ
اور ایران کے امرا و وزرا افغانستان کی قوم دُرانی اسی طبقہ سے ہیں اور ایشیا میں یہ
طبقہ اب تک باقی ہے۔

۳۔ طبقہ متوسط | یہ طبقہ فوجی خدمات و ملکی ملازمت و تاجر پیشہ لوگوں کا تھا یہ لوگ
ایران و ہندوستان میں طبقہ امرا سے نیچے درجہ کے ہوتے تھے مگر عرب میں طبقہ امرا کو
متوسط طبقے کے لوگوں سے بلندتر نہیں سمجھا جاتا تھا اس طبقہ میں عموماً دو درجے
ہوتے تھے ایک وہ جو طبقہ امرا سے قریب تر ہوتا تھا اور دوسرا وہ جو ادنیٰ طبقے سے کسقدر بلند تھا

۴۔ طبقہ ادنیٰ | اس میں غریب کاشتکار معمولی پیشہ والے لوگ نیم آزاد انسان اور ہندوستان
کی شودر ذات۔ اور غلام وغیرہ شامل تھے۔

ایشیا میں ہر ملک کے اعتبار سے ان طبقات کی کچھ نہ کچھ خصوصیت و لوازم تھے
اور سوائے ہندو ذاتوں کے جو اب تک اس جمود کی حالت میں ہیں یہ طبقات ترقی و تنزل

پاتے رہتے تھے صرف ہندوستان میں کاشتکاروں کی مختلف حالتیں تھیں بعض
جگہ وہ اپنے زمیندار کو کچھ لگان ادا کرتے تھے۔ اور بعض جگہ خود ہی زمین کے
مالک ہوتے تھے اور آزاد رہتے تھے اسی طرح عرب میں مختلف قبائل کے
سردار و عامی سپہ گری سوداگری اور جانوروں کے پالنے کا کام کرنے میں مشغول
رہتے تھے۔ بخلاف ہندوستان کے شام و ایران میں زراعت یا گلہ بانی کو معمولی
پیشہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان طبقات کے قیام میں ملکی و
جغرافیائی حالات کو بہت کچھ دخل ہے۔ ہمنے ایشیائی طبقات کو مجملاً بیان کیا ہے
حالانکہ ضرورت اسکی ہے کہ ہر ملک کے طبقات خصوصی کا مفصل مطالعہ کیا جائے
تاکہ وہاں کی سیاسی ترقی کو بآسانی سمجھا جا سکے۔

مقالۂ نہم غلامی

کسی خاندان یا قوم کے اندر غلام بحیثیت اجنبی کے داخل ہوتا ہے اور کبھی جزو قوم نہیں سمجھا جاتا یہی اس امر کی دلیل ہے کہ غلامی فطرت انسانی کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ سراسر خلاف ہے۔

خیالات ارسطو | ارسطو نے نہایت لطیف منطق سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض انسان فطرۃً آقا ہوتے ہیں اور بعض فطرتی طور پر غلام ہوتے ہیں۔ مگر اس دلیل سے ایک ایسی جماعت کی ضرورت معلوم ہوتی ہے جو ادنیٰ خدمات انجام دے سکے نہ یہ کہ یہ دلیل غلاموں کی جماعت کے قیام کی تائید کرتی ہے جو کچھ بھی حقوق نہ رکھتی ہو۔ اسمیں شک نہیں کہ اعلیٰ قابلیتوں کے انسان کو اپنے فرائض کے انجام دہی کے لئے ایسے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں ارسطو نے "زندہ ہتیار" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یقیناً بعض انسان اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کام لینے والے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو ایسی باہمی ضرورت ہے کہ آقا و ملازم۔ کاشتکار اور مزدور۔ تاجر اور کاریگر کا ایسا تعلق قائم ہو جنمیں ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ درجہ کا آدمی سمجھا جائے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان مثل پالتو جانوروں کے اپنی انفرادی آزادی اور انسانی ہستی کو زائل کر دے۔ اور اپنے آقا کا غلام بن جائے اور اسکی سوداگری مثل بے جان چیزوں کے ہونے لگے۔ انسان قدرتی طور پر جاندار ہستی ہے۔ اس سے بے جان اشیا

کی طرح سلوک کرنا بھی طور غیر فطرتی ہے لہذا یقیناً وہ غلام نہیں ہوسکتا۔

رومی قانون رومی قانون سازوں نے اپنے نظریہ قانون میں اس سختی سے غلاموں کو بے جان اشیا کی مانند سمجھا۔ کہ قدیم زمانے کے لحاظ سے بھی تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے۔ انکو کوئی حقوق نہیں رکھے گئے اور محض اشیائے بے جان کی طرح سلوک کیا جانے لگا تاہم انکا خیال تھا کہ غلامی غیر فطرتی ہے اور اقوام عالم کے رواج کی وجہ سے جاری ہے لیکن آنکے متعلق اتنے سخت قوانین تھے کہ نہ تو غلام مال رکھ سکتا تھا نہ اسے شادی اور رشتہ داری کرنے کی اجازت تھی۔

یورپ کا غلام جرمن قوم اور عموماً ٹیوٹن اقوام اتنی سختی سے غلام نہیں رکھتی تھیں جتنا کہ رومن قوم کے قوانین سے ظاہر ہے مغربی یورپ سے غلامی نیم آزاد نسل کی صورت میں تبدیل ہوکر انیسویں صدی کی ابتدا میں بالکل مٹ گئی روس میں ابتداءً طبقہ کاشتکار آزاد تھا مگر امرا کے ظلم و سختی سے ان کی بہت کچھ آزادی چھن گئی تھی ۱۹ فروری سنہ ۱۸۶۱ء میں زار سکندر ثانی نے باوجود امرا کی مخالفت کے ایسا قانون جاری کردیا جس میں روس سے انفرادی آزادی کا نیا دور شروع ہوگیا۔

امریکہ کا غلام نئی دنیا میں غلامی نے اتنی ظالمانہ اور وحشی صورت اختیار کرلی تھی کہ بیان قاصر ہے۔ سیاہ رنگ کے حبشی چونکہ سفید قوم والوں کے غلام ہوتے تھے لہذا غلاموں کو نہایت ذلیل اور انسانیت سے خارج سمجھا جاتا تھا۔ بھلا یہ کیسے

ممکن تہا کہ سفید رنگ کا فرعون اپنے سیاہ غلام کو اسی فطرت انسانی اور ان ہی جذبات کا مالک سمجھے جنکا وہ خود ہے اسی وجہ سے ظلم کا دور دورہ تہا۔ کیا یہ برتاؤ انسانی اخلاق یا خلاقی انتظام کے مطابق تہا۔

سخت کوششوں کے بعد ولبرفورس نے انگریزی مجلس قومی سے یہ قانون پاس کرادیا کہ انگریزی ممالک میں غلامی قانوناً ناجائز ہے آقاؤں کو ان کے ملازموں کا معاوضہ دیا گیا۔ اور غلاموں کی تجارت کو روکنے کیلئے بین الاقوامی معاہدے ہو گئے یہ ولبرفورس کی بہترین انسانی خدمت کا نتیجہ تہا اسکا اثر امریکہ پر بھی پڑا یکم فروری

بسنہ ۱۸۶۵ء

میں غلامی کے خلاف قانون پاس ہو گیا مگر امریکہ کے سیاہ باشندوں کو ذاتی آزادی اور خانگی حقوق کے علاوہ کوئی حقوق نہیں ملے موجودہ امریکہ میں مسئلہ رنگ نے بہت سی پیچیدگیاں اختیار کر لی ہیں اور وہی حبشی جو غلاموں کی حیثیت سے افریقہ سے آئے تھے اب مساوی سیاسی حقوق طلب کر رہے ہیں مگر سیاسی حقوق لینے کے لیے سیاسی قابلیت کا ہونا ضروری بتایا جاتا ہے اور اب تک سیاہ فام باشندے گورے چمڑے والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ مساوی حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔

غلامی پر ایشیا کا اثر
۱- ہندوستان

آریہ اقوام جب ہندوستان میں داخل ہوئیں تو انہوں نے یہاں کے اصلی باشندوں کو غلام نہیں بنایا بلکہ انکی وحشی حالت کو اپنی حالت سے بدتر پا کر انکا سوسائٹی میں ادنیٰ درجہ رکہا۔ اور وہ مثل غلاموں کے رہے۔ مگر انکو ذاتی مال و دولت رکھنے اور شادی بیاہ کر کے رشتہ قائم کرنے اور دیگر حقوق ذاتی کی اجازت تہی صرف مذہبی تعلیم سے وہ الگ رکھے جاتے تھے ... حالت

نہایت قابل رحم ہے اور اس جہالت کی غلامی سے نجات دینا انسانیت کا فرض اولین ہے۔

۲۔ چین | چین میں ایسی غلامی کبھی نہیں پھیلی جیسی کہ مغرب میں تھی نہ انکی تعداد کبھی اس قابل ہوئی کہ اسکی طرف توجہ کی جائے قحط کے زمانہ میں اکثر بچے معمولی قیمت پر فروخت کر دیے جاتے تھے یا قرض اور جرم کی وجہ سے انسان اپنی آزادی بیچ ڈالتا تھا تاہم وہاں زیادہ سختی و ظلم کی داستان موجود نہیں۔

۳۔ جاپان | جاپان اور یورپ کے تصادم سے غلاموں کی تجارت جاپان میں پھیلی سولہویں صدی کی طویل خانہ جنگیوں اور کوریا پر فوج کشی کرنے کی وجہ سے جاپان اتنے مفلس ہو گئے تھے۔ کہ اکثر خود سپاہی پرتگالی لوگوں کے ہاتھ فروخت ہو جاتے تھے۔ غلام اتنے سستے ہو گئے تھے کہ پرتگالیوں کے ملایا اور حبشی ملازم بھی جاپانی غلاموں کی تجارت کرنے لگے۔ انیسویں صدی میں جاپانی اور حبشی غلام امریکہ جانے لگے انکی حالت اتنی قابل رحم تھی کہ امریکہ میں آئیں سے اکثر نے افیون کھا کر بعض نے پہاڑ سے کود کر اور بعض نے سمندر میں گر کر جان دیدی مگر جاپان نے سیاسی ترقی بھی کی اور خود بخود جاپانی قلی (جو مثل ہندوستانی ٹھیکہ کے قلیوں کے جو جزائر فجی وغیرہ میں بھیجے جاتے ہیں) مزدوری کرنے کے بجائے صنعت و حرفت کرنے لگے۔ اور غلامی کا دروازہ جاپان پر خود بخود بند ہو گیا۔

اسلام اور غلامی | ٹھیک اس وقت جب کہ تمام یورپ تقریباً عیسائی ہو گیا تھا۔ ایک نیا مذہب عرب میں پیدا ہو رہا تھا۔
شاید اسوقت جب کہ انگریزی غلام روما میں فروخت

مجبور ہے تھے مکہ میں اسلام غلاموں کو اپنی آغوش مساوات میں لیکر آزاد کر رہا تھا غلاموں نے اسلام کے واسطے نہایت استقلال کے ساتھ مصیبتیں اٹھائیں اور حضرت بلال جو ایک حبشی غلام تھے محض اسلام کی وجہ سے اس درجہ اعلیٰ پر پہنچے جو موجودہ زمانہ کے آزاد جمہوریہ کے شہری کو بھی حاصل نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام کا یہ قاعدہ تھا کہ ہمیشہ اپنے غلام کو آزاد کر دیتے تھے۔ آپ نے آخری حج میں غلاموں کے متعلق فرمایا "اور تمہارے غلاموں کے متعلق یہ کہ انہیں وہی خوراک کھلاؤ جو کہ تم کیا تے ہو اور ایسا لباس پہناؤ جو تم خود پہنو اور اگر وہ ایسا قصور کریں کہ جسے تم معاف کرنے پر تیار نہیں ہو تو انہیں فروخت کر ڈالو کیونکہ یہ خدا کے بندے ہیں انہیں اذیت نہ دینی چاہیئے" قرآن میں غلاموں کے لئے صاف احکام ہیں جن سے غلاموں کی آزادی کی بنا پڑی اور یہ خیالات اسلامی ترقی کے ساتھ ساتھ مغرب میں پہنچے کہ انہیں محسوس کرا سکے کہ غلام بھی انسان ہے اور اسکا حق بھی آزاد ہونا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ "تمہارے ایسے غلام جو کچھ رقم ادا کرنے پر اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم اسکے متعلق تحریر دیدو تو تمہیں چاہیئے کہ تم ایک تحریر لکھ دو اگر تم ان میں بہتری دیکھتے ہو اور انہیں خدا کی وہ نعمتیں دو جو اسنے تمہیں عطا کی ہیں"۔ اس سے واضح ترایک دوسرا حکم یہ ہے "کہ تم کس نیکی کی شاہراہ کو سمجھ سکتے ہو یہ غلام کو آزاد کرتا ہے........"

مسلمانوں کا طرز عمل مسلمان غلاموں پر سخت گیر ہو سکتے تھے اور اکثر تھے مگر اسلام

کی تعلیم مغربی دنیا کے صدائے حریت سے ہزار برس قبل بلند ہو چکی تھی اور اسیکا اثر تھا کہ مغرب مین اس تحریک کو نشو و نما دیسکے۔ غلام مسلمان ہوتے ہی آزاد ہو جاتا تھا چونکہ اسلامی شریعت مین کل مسلمانون کو بھائی بھائی بتایا گیا ہے غلامون کو مسلمانون نے اتنی باقاعدہ تعلیم دی کہ ہندوستان مین خاندان غلامان سے بادشاہ ہوئے شاہ فیروز نے غلامون کو فوجی اور تجارتی تعلیم دی تھی اسکے چالیس ہزار غلام شاہی محلون کے محافظ ہوتے تھے بارہ ہزار ماہر فن غلام دلی مین تھے اور اور ایک لاکھ اسی ہزار غلام حکومت کے وظیفہ خوار تھے اسی طرح سلطان مصر نے چنگیز خان کی فوج سے بارہ ہزار سپاہیون کو گرفتار کرکے غلام بنایا جو بطور فوج کے رکھے گئے اور آخر کار اتنے طاقتور ہو گئے کہ انہون نے اپنی پسند سے بادشاہ بنانا شروع کیا اور عرصہ تک مملوک سلطان حکومت کرتے رہے اسیطرح سلاطین ترکی نے ینی چری کو (جو غلامون کی ایک فوج ہوتی تھی) اتنی عزت دی کہ وہ بہترین اور معزز ترین فوج سمجھی جاتی تھی۔ اور عرصہ دراز تک انکی قوت پر سلاطین عثمانیہ کا دار و مدار رہا مسلمانون کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہے کہ کہانتک اسلام کا اثر ایسے زمانہ مین ہوا جبکہ غلامی کو رفتہ رفتہ کم کرنے کے علاوہ یکایک غلامی کو روک دینا بجائے اصول مساوات اور انسانی ہمدردی کے قیام کے زیادہ سختی سے غلامی کو رواج دے دیتا اور قرآن نے کس آسان اور منطقی طریقہ سے اس منحوس رسم کو دنیا سے مٹا دینے میں مدد دی۔

مقالہ دہم ۔ جماعات

جماعات وطبقات خصوصی | جماعات کی ابتدا اور انکا انجام سلطنت کے ساتھ

ہوتا ہے مگر طبقات خصوصی کا تعلق سلطنت سے کچھ نہین ہوتا جماعات اتحاد قومی پر منحصر ہوتی ہے طبقات کو اسکی ضرورت نہین جماعات سیاسی حدود ہین جنکی بنیاد قومی اتحاد اور قومی تعاون پر ہوتی ہے بخلاف اسکے طبقہ ایسے گروہ یا مجمع کا نام ہے جسکی بنیاد قومی نہین ہوتی بلکہ انفرادی اور خانگی حقوق پر ہوتی ہے مذہبی طبقہ مذہب کو سلطنت پر فوقیت دیتا ہے طبقہ امرا اپنا اور اپنے اجتماعی حقوق کا پہلے خیال کرتا ہے شہری اپنے کاربار کو سب کچھ سمجھتا ہے اور کسان کا نصب العین کاشتکاری ہے ہر طبقہ مین مخصوص تعلیم و مخصوص طرز زندگی ہوتا ہے اور ان کا امتیاز زیادہ تر انکے پیشون کی وجہ سے ہے نہ یہ کہ سلطنت کے مقرر کردہ قوانین نے ان مین افتراق و امتیاز پیدا کیا ہے طبقات خصوصی قدرتی طور پر سوسائٹی مین نمودار ہو جاتے مگر جماعات کی بنا ڈالنے والی سلطنت ہوتی ہے یہ قومی عقل و قوت عمل کا نمونہ ہوتی ہین اسی وجہ سے موجودہ زمانہ مین یہ جماعتین صرف ان ہی قومون مین موجود ہین جو مہذب کہی جاتی ہین ہر جماعت کے لوگ مختلف طبقات کے لوگون پر مشتمل ہوتے ہین جس سلطنت مین نظام جماعات اس طرح نہین بنتا وہان کی اجتماعی زندگی کافی ترقی نہین کر سکتی اگر جماعات کی تقسیم اسی اعتبار سے ہو

جس طرح طبقات خصوصی کی اور جماعات مین مختلف طبقات کے لوگ شامل نہ ہون تو خاص طبقات کے ذاتی فوائد سیاسی قوت کی مدد سے ملی فوائد پر جلد غالب ہوجائینگے اور سلطنت مین شدید اختلاف پیدا ہوجائیگا جیساکہ ہندوستان مین طبقہ امرا اور طبقہ مزارعین مین اختلاف رونما ہوکر سخت فسادات برپا ہوسے اور آئندہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

اکثر جماعات کی تقسیم باعتبار دولت ہوتی ہے اس قسم کی تقسیم اُس تقسیم کا مقابلہ نہین کرسکتی جو بجائے دولت کے سیاسی قابلیت کو معیار مقرر کرتی ہے اور جہانتک ممکن ہوتا ہے اس بنا پر جماعات کی تقسیم کرتی ہے یہ تقسیم نہایت مشکل ہے لہذا عموماً موجودہ سلطنتون مین چار مختلف جماعات کا وجود تسلیم کیاجاسکتا ہے

۱۔ حکام | موجودہ زمانہ کی حکومت کرنے والی جماعت عموماً عہد قدیم کے طبقہ امرا یا شاہی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جمہوری حکومت کے اعلےٰ حکام اپنی عمدہ تعلیم یا پیشہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے طبقہ امرا کے درجہ کے سمجھے جاتے ہین۔

۲۔ امرا | جماعت امرا اگرچہ حکومت کرنے والی جماعت نہین ہوتی لیکن سوسائٹی مین اسکا اعلےٰ وارفع درجہ ہوتا ہے اور وہ جماعت حکام اور قوم کے عام افراد کے درمیان ممتاز درجہ رکھتی ہے ادنیٰ جماعت کے لوگ وقتاً فوقتاً اُس جماعت کے رتبہ پر پہنچتے رہتے ہین اور اکثر اس جماعت کے لوگ اپنی اہمیت کو زائل کرکے ادنیٰ درجہ پر پہنچ جاتے ہین اس جماعت کے درجہ کو حاصل کرنا بغیر دولت یا عمدہ پیشہ یا اعلیٰ تعلیم کے

مشکل ہے۔

۳-جماعت مدنی تعلیم یافتہ جماعت (جماعت مدنی) عوام اور جماعت امرا سے بالکل الگ ہے انکا امرا سے یہ فرق ہے کہ انہیں نہ تو یہ دعوے ہے کہ ہمارے خاص حقوق (ملّی حقوق کے علاوہ ہیں) نہ وہ خاص اعزاز چاہتے ہیں وہ عوام سے اسلئے بالاتر ہیں کہ انکی تعلیم و تربیت اور معزز پیشہ عوام سے اچھے ہیں وہ زیادہ تر جسمانی محنت کو عوام کے لئے چھوڑکر دماغی محنت کرتے ہیں اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقسام کے لوگ شامل ہیں۔

۱-معمولی عمال حکومت (علاوہ حکامان اعلےٰ کے جو جماعت امرا میں داخل ہیں)

۲-علما مذہبی طبقہ- اور عموماً تعلیم دینے والے اصحاب۔

۳-قانون پیشہ- طلبا- اور تعلیم یافتہ اصحاب۔

۴-ماہرین فن- ڈاکٹر- انجینیر اور اسی قسم کے پیشوں کے اعلیٰ ماہر۔

۵-صنعت و تجارت پیشہ۔

۶-صاحبان راس المال (سرمایہ دار)

۷-بڑے زمیندار (جو طبقہ امرا میں داخل نہ ہوں۔

اس جماعت کے لئے ضروری ہے کہ اچھی تعلیم پائی ہو اور خدمات عامہ کیلئے کچھ وقت بھی صرف کرسکے چونکہ اسی جماعت کے لوگ زیادہ تر حکومت کی مختلف مجالس میں نمائندگی کرتے ہیں۔

۴۔ جماعت ادنیٰ | اس جماعت مین وہ تمام باشندے شامل ہین جو متذکرہ بالا جماعتون
مین نہین ہین انہین عموماً عوام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ان مین مختلف پیشون اور
حالتون کے افراد ہوتے ہین مگر ہر ایک یکسان حق رکھتا ہے انکے جملہ حقوق جماعت
مدنی کی طرح ہوتے ہین اگرچہ ان لوگون کو اتنا وقت نہین ملتا کہ وہ جماعت مدنی کی
طرح خدمات عامہ انجام دین اس وجہ سے انکا درجہ جماعت مدنی سے کم سمجھا جاتا
ہے انکی ترکیب عموماً مندرجہ ذیل اجزا سے ہے۔

۱۔ گلہ بان۔ ملاح۔ کاشتکار۔ اور عموماً تمام مزدوری پیشہ جنکا کام زیادہ
تر جسمانی محنت پر مبنی ہوتا ہے۔

۲۔ ادنیٰ جماعت مدنی خواہ وہ گھر پر کام کرتے ہون خواہ کسی کارخانہ مین
کرتے ہون مثلاً جلاہے سبزی میوہ فروش وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ حکومت کے ادنیٰ ملازم اور معمولی منشی وکلرک فوج و پولیس کے سپاہی وغیرہ

۴۔ نہایت ہی معمولی خدمتگار قلی وغیرہ۔

مندرجہ بالا تفریق کا معیار نہایت عمدہ ہے دماغی کام کے لئے اعلیٰ تعلیم اور
عمدہ طرز زندگی کی ضرورت ہے جسمانی کام کے لئے محض پیشہ کا سیکھ لینا اور معمولی
طرز زندگی کافی ہے قدرتاً انسان کے یہ دو درجہ ایک دوسرے سے آسانی سے تمیز
کئے جاسکتے ہین اس جماعت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگرچہ سلطنت کا یہ
ضروری جزو ہوتے ہین لیکن ان مین حکومت کی اہلیت نہین ہوتی اسی وجہ سے

انکو رہنماؤن کی ضرورت ہے موجودہ زمانہ مین یہ جماعت مزدوری پیشہ جماعت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اور اسکا متحدہ اشتراک اقتصادی و معاشرتی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا ہے یہ حکومتون کو بدل سکتے ہین اور نظام حکومت مین ردو بدل کرا سکتے ہین مگر ان مین حکومت کی اہلیت قطعی نہین ہوتی اس وجہ سے انقلاب کے بعد اپنی حکومت کو قائم نہین رکھ سکتے ۔

اس جماعت کی اہمیت کو ہندوستانی امرا نے سنہ ۱۹۲۱ء کی تحریک ہزارہا مین محسوس کیا اسیطرح یورپ مین بھی یہ جماعت بہت زیادہ قوی ہو رہی ہے اور بولشوک تحریک کی بنا اسی جماعت نے ڈالی ہے ۔ اگر اس جماعت کو کسی مذہبی یا اجتماعی جذبے سے روکا گیا تو امن عامہ مین جلد خلل ہونے کا اندیشہ ہے اس جماعت کے باقاعدہ نظام قائم ہونے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے چونکہ اسی جماعت سے نہائت ادنی درجے کے آوارہ گرد لوگ پیدا ہوکر جرم و بدامنی پھیلانے کا باعث ہوتے ہین اس وجہ سے انکا انتظام ضروری ہے اور انکے جذبات کو فائدہ مند راستون کے طرف پھیرنا مدبرون کا کام ہے ۔

اگرچہ اس جماعت مین حکومت کرنے کی قابلیت نہین ہوتی تاہم ان کا انتخاب اگر بلدی جماعتون اور دیگر قومی مجالس مین ہو تو کوئی مضائقہ نہین اصل یہ ہے اس جماعت کو قومی تحریکون اور خدمت عامہ کرنے کی فرصت نہین ہوتی اگر اس جماعت کے حقوق انتخاب بالکل جماعت مدنی کے برابر کر دئے جائین ۔

تو جماعت مؤخرالذکر کے حقوق کو بے انصافی سے چھین لینے کے مترادف ہوگا اس جماعت کو بجائے حق نمائندگی کے سرپرستون کی ضرورت ہے جو انکو باقاعدہ نظام مین قائم کرکے تعلیم دے سکین۔

مقالۂ یازدہم سلطنت کا خاندان سے تعلق

مدبرین قدیم اور موجودہ نے اس نظریہ کو مان لیا ہے کہ خاندان سلطنت کا نمونہ ہے اور انکا قول ہے کہ سلطنت مثل باپ کے اور ملتین اور قومین مثل بچون کے ہین۔

خاندان اور سلطنت کا فرق

مندرجہ بالا تمثیل خاص حد تک صحیح ہے چونکہ جب تک سلطنت پدری اقتدار کی بنا پر قائم ہوتی ہے اسوقت تک سلطنت خاندان کا نمونہ ہوتی ہے اور جب رفتہ رفتہ ملت یا انسانیت پر سلطنت کی بنا قائم ہو جاتی ہے اسوقت یہ مثال غلط ہو جاتی ہے۔ لہذا خاندان و سلطنت کا فرق ہم ذیل مین درج کرتے ہین۔

۱۔ خاندان کی بنا شادی پر ہوتی ہے اسی وجہ سے اسکے افراد ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے ہین بخلاف اسکے سلطنت کے افراد کا تعلق نہ شادی پر ہوتا ہے نہ رشتہ داری پر بلکہ اسکی مختلف جماعتین عموماً ایک دوسرے سے شادی کرنے کا صرف حق رکھتی ہین اور آپس مین رشتہ داری اور خون کا تعلق نہین ہوتا۔

۲۔ سلطنت کی بنیاد ملت و ملک پر ہوتی ہے مگر خاندان مین یہ بات نہین ہوتی خاندانی سوسائٹی کا کسی خاص ملک سے تعلق نہین ہوتا۔ بخلاف اسکے بجائے خاندان کے سلطنت افراد پر مشتمل ہوتی ہے یعنی بجائے اسکے کہ کل خاندان متحدہ طور پر ایک فرد سمجھا جائے اسکے کل افراد کا الگ الگ حق ہوتا ہے۔

۳۔ دونون نظام اپنے اپنے طرز عمل مین علحدہ ہین خاندان مین بزرگ یا

سردار اپنے ماتحتوں کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ سلطنت مین اگرچہ بادشاہ مثل باپ کے ہوتا ہے۔ مگر اسکا رعایا کی مختلف جماعتون سے کوئی رشتہ سوا سیاسی رشتہ کے نہین ہوتا[1]۔

ان وجوہ سے خاندان سلطنت کے مانند نہین ہو سکتا۔ صرف خاندانی سلطنت اور خاندان ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہین۔ موجودہ سلطنتون مین خاندانی سلطنتون کا وجود باقی نہین ہے۔

عورتون کے سیاسی حقوق
(۱) مسلمان

مردنے اپنے متمرد و سرکشانہ طرز عمل سے ہمیشہ عورت کو اپنے سے کمتر سمجھا اور اسکو بہت کم حقوق دیئے تاہم مشرقی دنیا نے عورتون کی جتنی عزت قائم رکھی اسکا عشر عشیر بھی مغرب مین نہین ہے۔ چنانچہ قرآن مردون سے خطاب کرتا ہے " کہ عورتین تمہارا لباس ہین اور تم عورتون کے لباس ہو" اتنے تاریک زمانہ مین جبکہ ایشائی تہذیب عام طور سے نہایت گر رہی تھی۔ بھلا عورتون کی کب عزت ہو سکتی تھی۔ مگر اس عبارت قرآنی نے یکایک عورتون کی مساوات کو نئی شان سے پیش نظر کر دیا۔ مگر ساتھ ساتھ مردون کو عورتون کا فطری سرپرست و محافظ قرار دیا۔

(۱) زمانۂ جاہلیت مین عورتین مثل جانورون کے سمجھی جاتی تھین۔ اور سوائے مردون کی فلاحی کے اونکا اور کوئی کام نہ تھا۔ مگر اسلام نے انکو حق میراث و ذاتی مال

---

[1] دیکھئے باب نمبر ا مقالہ نمبر ا۔

مقالۂ یازدہم سلطنت کا خاندان سے تعلق

مدبرین قدیم اور موجودہ نے اس نظریہ کو مان لیا ہے کہ خاندان سلطنت کا نمونہ ہے اور انکا قول ہے کہ سلطنت مثل باپ کے اور ملتین اور قومین مثل بچون کے ہین۔

خاندان اور سلطنت کا فرق

مندرجہ بالا تمثیل خاص حد تک صحیح ہے چونکہ جب تک سلطنت پدری اقتدار کی بنا پر قائم ہوتی ہے اسوقت تک سلطنت خاندان کا نمونہ ہوتی ہے اور جب رفتہ رفتہ ملت یا انسانیت پر سلطنت کی بنا قائم ہو جاتی ہے اسوقت یہ مثال غلط ہو جاتی ہے۔ لہذا خاندان و سلطنت کا فرق ہم ذیل مین درج کرتے ہین۔

۱۔ خاندان کی بنا شادی پر ہوتی ہے اسی وجہ سے اسکے افراد ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے ہین بخلاف اسکے سلطنت کے افراد کا تعلق نہ شادی پر ہوتا ہے نہ رشتہ داری پر بلکہ اسکی مختلف جماعتین عموماً ایک دوسرے سے شادی کرنے کا صرف حق رکھتی ہین اور آپس مین رشتہ داری اور خون کا تعلق نہین ہوتا۔

۲۔ سلطنت کی بنیاد ملت و ملک پر ہوتی ہے مگر خاندان مین یہ بات نہین ہوتی خاندانی سوسائٹی کا کسی خاص ملک سے تعلق نہین ہوتا۔ بخلاف اسکے بجائے خاندان کے سلطنت افراد پر مشتمل ہوتی ہے یعنی بجائے اسکے کہ کل خاندان متحدہ طور پر ایک فرد سمجھا جائے اسکے کل افراد کا الگ الگ حق ہوتا ہے۔

۳۔ دونون نظام اپنے اپنے طرز عمل مین علحدہ ہین خاندان مین بزرگ یا

سردار اپنے ماتحتوں کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ سلطنت مین اگرچہ بادشاہ مثل باپ کے ہوتا ہے۔ مگر اسکا رعایا کی مختلف جماعتون سے کوئی رشتہ سوائے سیاسی رشتہ کے نہین ہوتا۔[1]

ان وجوہ سے خاندان سلطنت کے مانند نہین ہوسکتا۔ صرف خاندانی سلطنت اور خاندان ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہین۔ موجودہ سلطنتون مین خاندانی سلطنتون کا وجود باقی نہین ہے۔

عورتون کے سیاسی حقوق (۱) مسلمان

مردنے اپنے متمرد و سرکشانہ طرز عمل سے ہمیشہ عورت کو اپنے سے کمتر سمجھا اور اسکو بہت کم حقوق دیئے تاہم مشرقی دنیا نے عورتون کی جتنی عزت قائم رکھی اسکا عشر عشیر بھی مغرب مین نہین ہے۔ چنانچہ قرآن مردون سے خطاب کرتا ہے "کہ عورتین تمہارا لباس ہین اور تم عورتون کے لباس ہو" اتنے تاریک زمانہ مین جبکہ ایشائی تہذیب عام طور سے نہایت گر رہی تھی۔ بھلا عورتون کی کب عزت ہوسکتی تھی۔ مگر اس عبارت قرآنی نے یکایک عورتون کی مساوات کو نئی شان سے پیش نظر کر دیا۔ مگر ساتھ ساتھ مردون کو عورتون کا فطری سرپرست و محافظ قرار دیا۔

(۱) زمانۂ جاہلیت مین عورتین مثل جانورون کے سمجھی جاتی تھین۔ اور سوائے مردون کی غلامی کے اونکا اور کوئی کام نہ تھا۔ مگر اسلام نے انکو حق میراث و ذاتی مال

[1] دیکھو باب نمبر ۱ مقالہ نمبر ۱۔

و دولت رکھنے کا حق دیا۔

(ب) چونکہ تہذیب اور تمدن مین ہر شخص بغیر تعلیم کے کچھ ترقی نہین کرسکتا اسوجہ سے ہر مسلمان عورت کو تعلیم حاصل کرنا فرض ہوگیا اور انکو اس دولت سے محروم نہین کیا گیا

(ج) جس طرح مرد کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت تھی اسیطرح بیوہ کو دوبارہ شادی کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ جتلایا گیا کہ اخلاقاً و مذہبًا یہ فعل نہایت ہی مناسب ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ عورت کو اپنے شوہر سے خاص خاص حالتون مین قطع تعلق کر لینے کا بھی حق ہے۔

(د) عام طور سے سامی نسل مین لڑکیون کو مار ڈالنے کی رسم تھی اس رسم کو قانوناً منسوخ کر کے عورتون کی اہمیت اور اجتماعی حیثیت کو بڑھایا گیا۔ مردون کو عورتون سے نرمی کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا اور عورتون کو ان کل معاملات مین جو خواہ سیاسی ہون یا مذہبی رائے دینے اور تنقید کرنے کا حق دیا گیا قانوناً دو عورتون کی شہادت ایک مرد کے برابر اور میراث مین عورتون کا حق مردون سے نصف رکھا گیا تھا۔ مگر یہ حکم اس وقت کے لئے تھا جب عورتون کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ اور عورتون کو مردون کے برابر حقوق دیئے جانے کی ایسی شاہراہ کھول دی گئی تھی کہ رفتہ رفتہ عورتون کے بعض حقوق مردون کے حقوق سے بھی بڑھ گئے۔ اور عموماً ہر اسلامی ملک مین عورتین صرف خانگی امور اور اجتماعی زندگی مین وہ درجہ پاگئین کہ مرد اُن کا خادم تصور کیا جانے لگا۔ اور عورتین مردون کی محنت پر اتنا انحصار کرنے لگین کہ اعتدال سے گذر جانیکا خوف

ہے - اور بہت ممکن ہے کہ عورتین (صرف مشرق مین) بیرونی دنیا سے بالکل بے تعلق ہوجائین -

(۲) ھندو | مسلمانون کے علاوہ مشرق مین دو قومون کی عورتین قابل ذکر ہین - اول ہندو دوسرے چینی وجاپانی اقوام کی عورتین - موخر الذکر زیادہ تر مردون کے برابر حقوق رکھتی ہین اور مغربی تہذیب کے اثر کو نہایت سرعت سے قبول کر رہی ہین ہندو عورتون کو مذہب کی وجہ سے سخت پابندیون مین رہنا پڑتا ہے - اور وہ درج ذیل ہین

(۱) شادی | ہندو خاندانون کے اصول مذہبًا آبا و اجداد کی پرستش پر مبنی ہین اسوجہ سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر ہندو پر یہ فرض ہے کہ وہ شادی کرکے اولاد پیدا کرے تاکہ اپنے آبا و اجداد کی خدمت انجام دینے کا سلسلہ جاری رہے[۵۱] - اس طرح ہندو شادی آرام یا آسائش کے واسطے نہین بلکہ مذہبی فرض سمجھکر کی جاتی ہے - لہذا اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ -

(ا) لڑکون کی خواہش بہ نسبت لڑکیون کے زیادہ ہوگئی - اور کثیر تعداد مین لڑکیون کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالنا شروع ہوگیا -

(ب) اسی وجہ سے کئی شادیون کی خواہش مین ترقی ہوئی اور منو کے قانون کے مطابق برہمن کو چار - کھتری کو تین اور ویش کو دو بیویون کی اجازت دی گئی[۵۲] -

---

[۵۱] دشستھا باب ۹ صفحہ ۴۴ ترجمہ انگریزی مسٹر بارنٹ -

[۵۲] پارسکارا باب ۱ صفحہ ۴ - ۸ -

خاندان کے سب سے بزرگ مرد کے ماتحت کل بچے اور عورتین ہوتی ہین۔ اور ہندو قانون کسی عورت کو کسی طرح آزادانہ زندگی کی اجازت نہین دیتا۔ (یورپ سے مقابلہ کیجئے)۔ اُسے اپنے باپ یا شوہر یا بیٹے کی تابعداری مین رہنا ضروری ہے[۵۱]۔ عورت کے اس تخیل نے بدھ مذہب کے اس خیال کو ترقی دی۔ کہ وہ جب تک مرد کا جنم نہ لے نروان نہین حاصل کرسکتی۔

رگ وید کے زمانہ مین عورت کو کافی آزادی اور قوت حاصل تھی۔ اور خاندان کی زندگی نہایت مسرت بخش ہوتی تھی۔ مگر برہمنون نے یہ جدت کی کہ عورتون کو مردون کے ساتھ کھانا کھانے تک سے روک دیا۔ اور ویدون کی پاک تعلیم عورتون کے لئے قطعی بند کردی گئی۔ جس وجہ سے عورتین جاہل مطلق رکھی جانے لگین۔

(ب) سنی | لڑکی کے سن بلوغ تک پہونچنے سے پہلے شادی کردینے کو مذہبی قانون مان لیا گیا اور سوائے لاولد بیوہ کے کسی بیوہ کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہ تھی[۵۲]۔ مگر اجتماعی رسوم ایسی ہوگئیں کہ وہ بیوائین جو نہایت صغیر سنی مین اس مصیبت مین مبتلا ہوجاتی تھین۔ تمام عمر شادی نہ کرتی تھین۔ اور نہایت تکلیف کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھین۔ یہ زندگی اتنی تلخ ہوتی تھی کہ عموماً اس

---

[۵۱] بودھیانا جلد ۲ صفحہ ۴۴۔ ۴۵۔

[۵۲] گوتا باب ۱۸ صفحہ ۴ ۔ ۱۷۔

زندگی پر آگ کے شعلون کو ترجیح دیجاتی تھی اور ستی کی رسم عام طور سے ہندوستان مین رائج ہوگئی تھی۔ ہندؤن کے بعض محبان وطن و ہمدردان قوم اور انگریزکمپنی نے اس منحوس رسم کے مٹانیکی بہت کوشش کی بعض ہندؤن نے دوبارہ شادی کا رواج ہندوستان مین شروع کیا۔ اور انگریزی قانون نے ستی کو جرم قرار دیا۔

مندرجۂ بالا اشکلات کے مقابلہ مین موجودہ زمانہ کے مصلحان قوم کی کوششون سے عورتون کو کافی آزادی اور عزت دیجارہی ہے۔ بیوہ کی شادی۔ تعلیم۔ اور ملکی مجالس مین عورتون کو مردون کے برابر حق نیابت و انتخاب دیاجارہا ہے۔ اور ان امور کے متعلق اُنکو ترغیب و تحریص دی جارہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہندوستان مین وہ زمانہ آنیوالا ہے جب عورتون کا درجہ بہت بلند ہوجائے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہین کیاجاسکتا۔ کہ مذہب کی آڑ مین ایسی بُری رسوم جاری ہین جنکا مٹا دینا ضروری ہے۔ اور یہ کہ عورتین فطرۃً مردون کی امداد اور اُنکی سرپرستی مین رہ کر (بہ نسبت آزادی مطلق کے) زیادہ ترقی کرسکتی ہین۔ لیکن اس سرپرستی سے عورت کے درجہ مین کچھ فرق نہ آنا چاہیئے نہ اُنکو کمزور اور لطیف جنس ہونیکی وجہ سے کمتر سمجھا جاسکتا ہے۔ عورت کی بہت سی ایسی خصوصیات ہین جو مرد مین نہین اور مرد و عورت ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہین نہ یہ کہ مرد کے قوی ہونیکی وجہ سے وہ عورت کو اپنا غلام سمجھنے لگے۔

عورتون کی حالت یورپ مین | چونکہ موجودہ زمانہ کی سلطنتون مین خاندان کی جگہ فرد کا

نے لے لی ہے ۔ اسوجہ سے سیاسی زندگی مین ایک تغیر عظیم پیدا ہوگیا ہے ۔
ایک خاندان کے مختلف افراد (بیٹے ۔ بیٹیان ۔ مان ۔ باپ وغیرہ) مختلف سیاسی خیالات رکھ سکتے ہین ۔ اور مختلف سیاسی فرقون سے اپنا تعلق رکھ سکتے ہین ۔ بخلاف اسکے زمانۂ قدیم مین پورا خاندان بجائے فرد واحد کے ہوتا تھا ۔ اور بحیثیت مجموعی ایک خیال کا پابند سمجھا جاتا تھا ۔ خاندانی جماعتون مین جو محبت و اخلاص ایک خاندان کے مختلف ممبرون مین آپس مین ہوتا تھا ۔ وہ اب بہت کم ہوتا جاتا ہے ۔ عورتون کا اعتماد مردون سے اُٹھتا جاتا ہے ۔ اور وہ حق نیابت کے مساوی ہونے اور اپنے طبقہ کو مردون سے قطعی الگ اور مساوی حقوق حاصل کرنیکی کوشان ہین ۔ حتی کہ فوجی خدمت مین (جسمین جسمانی قوت کی زیادہ ضرورت ہے) بھی برابر کے حصّہ کی طلبگار ہین ۔

مِلؔ | جان اسٹوارٹ مِلؔ نے مندرجہ ذیل وجوہ عورتونکی نمائندگی کے متعلق ظاہر کئے ہین ۔

(۱) عورتون کو مردون کی مانند اسکا حق حاصل ہے کہ اُنپر عمدہ حکومت کیجائے چونکہ انتخاب و نمائندگی کا مقصد یہی ہے کہ عمدہ حکومت ہو ۔

[لیکن بچونکو بھی اچھی حکومت کے ماتحت رہنے کا حق ہے (یعنی وہ بھی سلطنت کے حفاظت چاہتے ہین) مگر اس سے کوئی یہ نتیجہ اخذ نہین کرتا کہ بچونکو بھی حق انتخاب ملنا چاہیئے ۔ لہذا عمدہ حکومت کئے جانیکے یہ معنی نہین ہین کہ حکومت مین عورتین حصّہ بھی لین ۔ بلکہ حق حفاظت کی ضرورت ہے ۔ اور یہ حق محض مجہول حق ہے ۔ اور حقِ نمائندگی کا معیار ذاتی قابلیت ہے]۔

(۲) حقوق عامّہ اور حقوق ذاتی ایک دوسرے کی ضد ہین۔ نظامات حقوقیہ (ذاتی قانون) کے لحاظ سے عورتین اپنے شوہرون کی ولایت مین سمجھی جاتی ہین۔ مگر عورتون مین اپنے ذاتی مال۔ وملکیت کے انتظام کی اہلیت پیدا ہوگئی۔ تو اونہین اس معاملہ مین مردون کے برابر کر دیا گیا۔ مگر قانون عامّہ مین یہ امتیاز باقی رکھا گیا۔

ہم عورتون سے ٹکس لیتے ہین مگر اُسکے خرچ پر رائے دینے کا حق نہین دیتے۔ یہ بات انصاف سے بہت دُور ہے۔ نظامات حقوقیہ مین عورتون اور مردون کے مساوی حقوق رکھنے کی وجہ سے عمدہ نتائج پیدا ہوئے۔ لہذا قانون عامّہ مین بھی مساوات کا ہونا اغلباً عمدہ نتائج پیدا کریگا۔

(۳) ظاہرا ہمارے قانون مین ایک بڑا نقص یہ ہے کہ عورتون کو مساوی سیاسی حقوق تو نہین دیئے جاتے مگر انکا اعلیٰ ترین سیاسی حق (ملکہ ہونا) تسلیم کرلیا گیا ہے اسکی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟۔ یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بجائے ملکہ بنانیکے عورتون کو سلطنت مین ماتحت عہدون پر جگہ دیجائے۔ بہرحال اسکی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ تخت حکومت موروثی سمجھا جاتا ہے۔ اور میراث جس طرح مرد کو ملتی ہے اوسی طرح عورت کو مل سکتی ہے۔

(۴) چونکہ عورتین خاندان مین زندگی بسر کرتی ہین۔ لہذا وہ اپنے خاندان کے بزرگ کے ساتھ رائے (ووٹ) دینگی۔ اسطرح اونکے جو رگوگی (جنپر سلطنت کا دار مدار

ہوتا ہے) سیاسی اہمیت بڑھ جائے گی۔

(۵) عورتون کا خاص اثر سیاسات پر بہ نالیقینی ہے مگر ابتک یہ اثر بالواسطہ اور غیر ذمہ داری کے ساتھ ہے اگر انہین حق انتخاب دے دیا جائے تو یہ زیادہ اعتدال اور ذمہ داری کے ساتھ ہوگا۔

مخالف دلائل | شاید مسٹر مل کی آخری دلیل سب سے زیادہ قوی ہے۔ مگر ان سب سے زیادہ قوی دلائل اسکے خلاف بھی پیش کئے جاسکتے ہین۔

(۱) کل مذاہب و ملل کا اسپر تقریبًا اتفاق رہ چکا ہے کہ عورتونکو حق نیابت نہ ملنا چاہیئے۔ چونکہ ایسا کرنا انسانی اجتماعی زندگی اور حالات مستمرہ کے قطعی خلاف معلوم ہوتا ہے۔

(۲) عورت کا فطرتی درجہ یہ ہے کہ وہ خاندان کی روح روان ہو۔ نہ کہ خدمات عامہ اور سیاسی پیچیدگیون مین مبتلا ہوکر وہ اپنی خصوصیت کو زائل کردے۔ مان اور بیوی کی حیثیت سے جو فرائض عورت کے ذمہ ہین اُنکے نہ ادا ہونے سے سیاسیات پر بہت برا اثر ہوگا

(۳) سیاسی مساوات کی بنیاد زیادہ تر جذبات پر ہو جائیگی اور عقلی دلائل کم ہوتے جائینگے لہذا سلطنتون مین ایسے بیکار اور مجہول عناصر کے بڑھانے اور عملی عناصر کے کم کرنے سے سخت نقصان ہوگا۔

لہذا اگرچہ کسی عورت کا کسی قوم مین ملکہ ہو جانا مضرت رسان نہین ہوسکتا تاہم عام طور سے عورتون کو سیاسی حقوق دینا تباہ کن ہوسکتا ہے۔ لیکن اگرچہ عورتون کے اس بالواسطہ حق کو روکا جاسکتا ہے مگر اُن کے بلاواسطہ مفید اثر سے انکار نہین ہوسکتا۔ وہ عورتین جنھون نے

سیاسیات مین زیادہ حصہ لیا ہے عموماً مضرت رسان ثابت ہوئی ہین۔ اُن کی نسوانی فطرت وجذبات انتقام ونفرت وحرص جب مشتعل ہوجاتے ہین۔ تو دنیا مین آگ کا شعلہ بھڑک اُٹھتا ہے اسی بنا پر یورپ کے ایک مورخ نے اس امر کے ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ دنیا مین جتنی جنگ وجدل ہوئی ہے اوسکی وجہ عورت ہی کی ذات ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کسی حد تک غلط ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیاسیات مین عورتون کا زیادہ حصہ لینا اونکو اپنے قدرتی افعال اور ذمہ داریون کے ادا کرنے سے روک سکتا ہے۔ اور ان کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ مرد کی سیاسی عزت کی شریک ہون۔ اکثر عورتون نے قومی ترقی کو خودداری اور استقلال سے مدد دے کر ہر زمانہ مین مردون کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر مدبر اس امر کا اقرار کرتے ہین کہ عورت کو صرف خانگی امور تک محدود رہنا چاہیے تاکہ وہ مردون کی پریشانیون اور دلی کدورتون کو کم از کم خاندانی زندگی مین دور کر سکے۔ عورت ایک نہایت مستقل مزاج اور تکلیف برداشت کرنے والی ہستی ہوتی ہے اور اسی کے اثر سے مرد ایثار و قربانی کرتا ہے اور غیرت ملّی کے جذبہ سے مغلوب ہوکر ایسے کام کرگزرتا ہے جو بادی النظر مین اوسکی طاقت کے حدود سے باہر معلوم ہوتے ہین ہندوستان عرب اور یورپ بلکہ ہر ملک کی تاریخ سے شہادت مہیا کیجا سکتی ہے کہ بعض عورتین مردون سے زیادہ جری معاملہ شناس اور عقلمند ہوتی ہین اور اکثر مردون کے دوش بدوش کام کرتی ہین۔ آجکل بھی ہندوستان کی آزادی کی تحریک ورکرکی وسعت مین ہر طبقہ مین ایسی عورتین نظر آتی ہین جنسے سیاسیات مین تو ربانی یا کیزگی پیدا ہوگئی ہے۔ بہرحال انگلستان۔ اٹلی۔ فرانس و جرمنی مین عورتونکو حقوق انتخاب دیدئے گئے ہین اسمین زیادہ تر انکی آزادی اور اکثریت کو دخل ہے۔

مقالہ دوازدہم سلطنت کا افراد سے تعلق

سلطنت کا ملکی و اجنبی سے تعلق سلطنت کا افراد سے دوگونہ تعلق ہوتا ہے۔ یا تو افراد اسی سلطنت و ملت کے ہوتے ہین۔ یا اوس سلطنت و ملت کے نہین ہوتے۔ وہ لوگ جو کسی ملت کے فرد یا کسی سلطنت کے باشندے ہوتے ہین وہ مندرجہ ذیل صورتون سے ہوتے ہین۔

۱۔ **پیدایش** ناجائز بچون کی مان اور جائز بچون کے باپ کو سلطنت کا ممبر ہونا ضروری ہے۔ اس طرح یہ بچے اُس سلطنت کے باشندے سمجھے جاتے ہین جسمین وہ پیدا ہون۔ اسی طرح لاوارث بچے بھی اسی سلطنت کے سمجھے جاتے ہین جسمین وہ پیدا ہون یا پائے جائین۔

۲۔ **شادی** شادی کر لینے کے بعد اجنبی بیوی اُسی سلطنت کی فرد سمجھی جاتی ہے۔ جسمین وہ شادی کرے یعنی جس ملت کا شوہر ہوتا ہے اسی کی بیوی بھی ہوجاتی ہے

۳۔ **اختیار وطن** اگر کوئی اجنبی اپنا وطن ترک کرکے اپنی جائے سکونت کسی سلطنت مین مستقل طور پر بنا لے تو وہ کچھ عرصہ کے بعد اوسی سلطنت کا فرد سمجھا جاتا ہے ہر سلطنت مین اس کے متعلق مختلف زمانون کی تعداد مقرر ہے۔ بعض سلطنتون مین مستقل قیام ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ اوس ملت کا فرد ہوجائے۔ اور بعض مین کچھ وقت کی تعداد یا سرکاری ملازمت کا ہونا ضروری ہے۔

ملکی شخص کے ذاتی حقوق عموماً نظامات حقوقیہ کے سامنے ملکی اور اجنبی حقوق برابر ہوتے ہین۔ بعض سلطنتوں (مثلاً سوئٹزرلینڈ) مین اجنبی شخص جایداد نہین خرید سکتا۔ بعض مین چند خاص پیشیون اور حرفتون کی اجازت نہین ہے۔

ملکی شخص کے حقوق عامّہ قانون عامّہ مین اجنبی و ملکی کے امتیازات اب تک باقی ہین۔ اور اسی وجہ سے۔

(ا) ملکی شخص کسی اجنبی سلطنت کو نہین دیا جا سکتا۔ اور اُسے اپنے ملک مین رہنے کا مستقل حق ہوتا ہے۔

(ب) اگر وہ کسی دوسری سلطنت مین چلا جائے تو اُسے اپنی حفاظت کا اپنی سلطنت پر حق ہوتا ہے۔

(ج) جماعت مدنی کے جز حقوق کے استعمال کا اس کو پورا حق حاصل ہوتا ہے اور وہ ملت کی ملازمت کا حق بھی رکھتا ہے۔ اور یہ حقوق اجنبی شخص کو صرف اُس وقت مل سکتے ہین جب اُسے اُسکی اجازت ملے۔

سلطنت کا جماعت مدنی سے تعلق جماعت مدنی کی خصوصیات اس سے پہلے بتائی جا چکی ہین۔ یہ جماعت عوام الناس سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ اور سلطنت کا افراد سے تعلق اس جماعت مین پورا پورا ظاہر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ملی خصوصیات ملی کا مرکز بھی جماعت ہوتی ہے۔

اس جماعت کے حدود مندرجہ ذیل ہین۔

عورت (ا) عورتین مردون کے برابر سیاسی حقوق نہین رکھتین اگرچہ وہ اپنے حقوق کو رفتہ رفتہ مردون کے حقوق کے مساوی کر رہی ہین۔

بچے (ب) نابالغ بچے اسوجہ سے سیاسی حقوق سے محروم رہتے ہین کہ انکے استعمال کیلیئے عاقل ہونیکی ضرورت ہے اور سن بلوغ عقل کا معیار رکھا گیا ہے۔ اور ہر سلطنت مین عاقل و بالغ ہو کر سیاسی حقوق حاصل کرنیکی عمر کی تعداد اکیس اور پچیس سال کے درمیان مقرر ہے

(ج) وہ لوگ جو جرائم پیشہ - نہایت ہی مفلس - دیوالیہ یا مجنون ہوتے ہین وہ اس حق سے محروم ہوجاتے ہین۔

آمدنی (د) بعض سلطنتون مین حق انتخاب اسوقت حاصل ہوتا ہے جب رائے دہندہ کی مقررہ آمدنی ہو یا مقررہ ٹکس ادا کرتا ہو۔

مذہب (ہ) بعض سلطنتون میں اس ہی قوم کے مذہب کی پابندی حقوق مدنیت اور رائے دہندگی کے لئے ضروری تھی۔ یورپ مین کیتھولک اور پراٹسٹنٹ فرقون مین اسی بناء پر سخت اختلاف تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہان مذہب کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔ لیکن اسکا یہ منشا نہ تھا کہ مذہب کے اصول برے سمجھے گئے یا سلطنت نے مذہب کو ترقی دینے سے انکار کیا۔ تاہم امریکہ مین ۱۷۸۹ء جرمنی مین ۱۸۴۸ء آسٹریا مین ۱۸۴۹ء اور سوئیٹزرلینڈ مین ۱۸۶۶ء مین مدنی و سیاسی حقوق کو مذہب کی پابندی سے الگ کر دیا گیا۔ اسی طرح ملک ہندوستان مین ۱۹۱۶ء سے ہندو مسلم جماعات متحدہ طور پر کام کرنے لگین۔ اور سیاسی نظام کو مذہبی تعصبات سے

الگ کر دیا گیا۔ اور ہر شخص اصول ملّی سے متفق ہونے پر اُس کا ممبر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اُن جمہوریتوں میں جو وسط ایشیا میں قائم ہوئی ہیں ہر شخص کو حق انتخاب مساوی طور پر حاصل ہے۔ افغانستان میں بھی مذہب کی تفریق سیاسی امور سے ہٹا لیگئی ہے۔ اور ہر فرد ملّت کو مساوی حقوق ہیں۔ سوائے سویڈن ناروے کے دیگر مہذب سلطنتیں مختلف المذاہب افراد ملّت کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہیں اسپر بھی مذہب کو خاص درجہ (خصوصًا یورپ میں) حاصل ہے۔ یعنی عیسوی مذہب کے رہنما (پادری) غیر مذاہب کے لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کو صلیبی جنگ بتاتے ہیں اور یہی مذہبی اور مغربیت کا تفاخر مشرقی مذاہب اور ملل کو مٹانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

رنگ امریکہ کے سیاہ رنگ اور سرخ رنگ کے باشندے اگرچہ آزاد جمہوریہ کے باشندے ہیں مگر سفید انسان کے مقابلہ میں اپنے رنگ و نسل کی وجہ سے مساوی حقوق نہیں حاصل کر سکے۔ اور اس حق سے محروم رکھنے کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ سفید رنگ کی اقوام کے علاوہ دوسری نسلوں میں اتنی سیاسی اور دماغی قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ برابر کے حقوق حاصل کر سکیں۔

حصہ ثانی

سلطنت کی خارجی (طبعی یا جغرافیائی) کیفیتین۔

مقالہ اول۔ آب و ہوا۔ زرخیزی زمین وغیرہ

۱۔ آب وہوا | اگرچہ انسان نے سائینس کے زور سے فطرت پر بہت کچھ فتح حاصل کرلی ہے۔ اور سخت گرم ملک مین سردی اور سرد ملک مین گرمی کے سامان مہیّا کرسکتا ہے۔ تاہم اوس پر ملکی آب وہوا کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اسیوجہ سے گرم ملک کے باشندے زیادہ آرام پرست و کاہل ہوتے ہین۔ سرد ملک کے لوگ محنتی ہوتے ہین اور قطب شمالی کے لوگ سوائے ضروریات زندگی کے بہم پہونچانے اور کسی شعبہ زندگی کی طرف رجوع نہین کرسکتے۔ گرم ملک کے لوگ اس وجہ سے کاہل ہوتے ہین کہ وہان قدرتاً کم محنت کے بدلے مین زیادہ پیداوار حاصل ہوجاتی ہے۔ اور سرد ملکون مین محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی بناء پر یہ اصول قائم کیا گیا ہے کہ عموماً منطقہ حارہ کی بہ نسبت منطقہ معتدلہ کے لوگ زیادہ محنتی اور قابل ہوتے ہین۔ اور منطقہ بارد ہ مین اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لئے وقت ہی مشکل سے ملتا ہے۔ چونکہ ان کا زیادہ وقت تلاش معاش مین صرف ہوجاتا ہے۔

اسی ضمن مین یہ بیان کردینا نامناسب نہ ہوگا کہ قومی خصوصیات

کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دارالسلطنت ملکیہ ایسے مقام پر بنایا جائے۔ جہان کی آب وہوا بہ نسبت دیگر حصص ملک کے زیادہ معتدل ہو۔ یہ خیال کہ قانون کے ذریعہ سے قومی خصوصیات کو تبدیل کیا جا سکتا ہے غلط ہے۔ لیکن تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہو سکتا ہے جو اُن قومی عیوب کو جو آب وہوا کی وجہ سے پیدا ہو جائین دور کرے۔ مثلاً سرد ممالک کے باشندے عموماً محنتی اور شراب کے عادی ہو جاتے ہین۔ اس عادت کو امریکہ کی حکومت نے قانون کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو اس قسم کے قومی خصائل بد کو اخلاقی ترقی کے ساتھ دور کرسکے۔ گرم ممالک کے باشندے قدرتاً جلد بالغ ہو جاتے ہین۔ اور ناتجربہ کاری اور کم عقلی سے ایسے زمانہ مین جو نتائج بد پیدا ہو سکتے ہین اون کو قانون نے اتنا کم نہین کیا جتنا تعلیم نے کیا ہے۔

۲۔ ملک کی قدرتی خصوصیات	اس زمانہ سے بہت پہلے ارسطو نے اس امر کو محسوس کر لیا تھا۔ (دیکھو سیاسیات ارسطو)

کہ انسان پر ملک کی قدرتی اور طبعی خصوصیات کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ ان طبعی اثرات مین سے چند مندرجہ ذیل ہین۔

(۱) دریا ابتداے عالم سے جتنی مہذب سلطنتین تاریخ پر نظر آتی ہین وہ دریاؤن کے کنارے آباد نظر آئینگی۔ دریاؤن سے سڑکون کا کام لیا جاتا تھا اور اس سے تجارت۔ زراعت

اور آمد و رفت مین قدرتی طور پر بہت مدد ملتی تھی۔ مثالاً اون قومون کی تمدنی ترقی پر غور کیا جائے جو پنجاب۔ دوآبہ گنگ وجمن دجلہ و فرات اور دریائے نیل کی وادیون مین آباد تھین تو معلوم ہوگا کہ اُن کی ترقی مین دریاؤن کا بہت بڑا اثر اور دخل تھا۔

(ب) سمندر | اسی طرح وہ ممالک جو سمندرون کے کنارون پر آباد ہین یا جزیرہ اور جزیرہ نما ہین وہ جلد ترقی پا گئے تھے۔ جہازرانی۔ ماہی گیری۔ تجارت کے لئے سمندر نے اچھا اثر کیا۔ یونان۔ اطالیہ۔ پرتگال۔ انگلستان۔ جاپان وغیرہ ممالک نے سمندر کی وجہ سے سیاسی اہمیت حاصل کی۔

(ج) پہاڑ | پہاڑون کی عظمت وشان نے انسان دل و دماغ مین بلند خیالی پیدا کی۔ عموماً پہاڑی اقوام محنتی۔ جنگجو اور جفاکش ہوتی ہین۔ پہاڑی اقوام کو روزمرہ کی ضروریات کے لئے معمول سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور پہاڑون کی وجہ سے مختلف وادیون مین مختلف قبائل پیدا ہو جاتے ہین۔ اور ایک دوسرے سے معمولی باتون پر لڑتے لڑتے جنگجو ہو جاتے ہین۔ علاوہ ازین پہاڑ کی یہ خصوصیت ہے کہ پہاڑی باشندے ہمیشہ آزادی پسند ہوتے ہین۔ وجہ یہ ہے کہ ان اقوام کو مشکل سے دوسری قوم قبضہ مین لاسکتی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اُن پر قبضہ کر بھی لے۔ تو اُس قبضہ کا قائم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ وغیرہ زلینہ۔

افغانستان - اناطولیہ اور نیپال کے باشندے مثالاً پیش کئے جاسکتے ہین۔

(د) ریگستان | جسطرح پہاڑی اقوام شجاع اور جفاکش ہوتی ہین اسی طرح وہ اقوام جو ریگستانی علاقون مین رہتی ہین اگرچہ نہایت آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہین تاہم اُنکی قدرتی زندگی اُنہین جری اور جفاکش بنادیتی ہے۔ یہ لوگ قدرتاً نہایت فیاض۔ مہمان دوست اور شجاع ہوتے ہین۔ عرب اور راجپوتانہ کے ممالک کی آب وہوا نے نہ صرف انسان پر اپنا اثر ڈال کر بہادر اور جری بنادیا ہے بلکہ دونوں ملکون کے حیوان (مثلاً گھوڑے) تک اس صفت سے اثر پذیر ہوتے ہین۔

موجودہ زمانہ مین وسائل آمدورفت کی آسانی کی وجہ سے ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کے باشندہ سے قریب ہوتا جاتا ہے اور قدرتی مناظر۔ آب وہوا۔ اور موسمی تبدیلیون کا اثر گذشتہ زمانون کی نسبت کم ہورہا ہے۔ اور امید کیجاسکتی ہے کہ مستقبل قریب مین کوئی ایسی صورت اتحاد عام کی پیدا ہوجائے کہ دنیا بحیثیت مجموعی مثل ایک مکان کے ہوجائے جس مین ہر کمرہ ہر فرد کے لئے بغیر کسی رکاوٹ کے کھلا ہوا ہو۔ اور فطرتی مناظر سے ہر شخص بہرہ اندوز ہوکر اس مکان کی مجموعی مسرت مین اضافہ کرے۔ لیکن تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ اور گرم ملک کے باشندے سرد ملک والون کو اور سرد ملک کے باشندے گرم ملک والون کو اپنے اپنے جدید تجربات اور تخیلات سے فائدہ پہنچاکر نہایت تیزی سے ترقی کرسکتے ہین۔

۲-زرخیزی زمین | بلحاظ زرخیزی زمین کے تین بڑے حصے کئے جاسکتے ہین-

(الف) نہایت زرخیز-

(ب) کم زرخیز-

(ج) بنجر

| ۱-نہایت زرخیز | عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ملک جو نہایت ہی زرخیز ہو اور

تھوڑی سی محنت مین زیادہ سامان زندگی مہیا کرسکے وہ انسانی تہذیب و ترقی کیلئے مفید ہوگا- مگر یہ خیال کسی حد تک غلط ہے- ایسی سرزمین مین تین باتین ضرور پیدا ہوجاتی ہین-

۱-کاہلی عام طور پر پھیل جاتی ہے- اور انسان محنت نہ کرنے کی وجہ سے نہ تو تجارت مین ترقی کرسکتا ہے اور نہ تمدن مین اضافہ ہوتا ہے- چند افراد قوم زیادہ مالدار ہوجاتے ہین- اور نہایت کثیر تعداد مین مزدوری پیشہ اور کسان اسوجہ سے ناقدری کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہین کہ اکثر ایسے ممالک مین آبادی نہایت تیزی سے بڑھتی ہے اور قحط یا جنگ کے زمانہ مین غربا کی تعداد غیر محدود ہوجاتی ہے- اسلئے ان ملکون مین درمیانی طبقہ کے باشندے بہت کم ہوتے ہین- یا تو نہایت ہی مالدار ہوتے ہین یا نہایت ہی غریب-

| (ب) بنجر زمین | بخلاف اسکے وہ زمین جسمین کچھ پیدا نہین ہوسکتا یا نہایت

کم اور مشکل سے کاشت کی جاسکتی ہے- وہان عام طور پر تلاش معاش سے اتنی

فرصت نہین ملتی کہ متمدن ہون اور اجتماعی ترقی کی طرف رجوع کرین۔ ایسے ممالک کے لوگ فرقہ بندی کر کے لوٹ مار کے عادی ہو جاتے ہین اور لشکار وغیرہ پر خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہین۔ جسطرح مغل۔ یا تاتار یا بعض قبائل عرب اور ہندوستان کے سرحدی پٹھان یا راجپوتانہ کے بھیل وسنتھال وغیرہ ہین۔ اور جب تک یہ لوگ کسی زرخیز زمین پر آباد نہون تمدنی زندگی مین ترقی نہین کر سکتے۔

(ج) کم زرخیز زمین | ایسا ملک جو کم زرخیز ہو انسانی ترقی کے لئے نہایت مفید ہے۔ ایسے ملک مین نہ تو بہت زیادہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ بہت کم محنت سے کام چلتا ہے۔ اعتدال کے ساتھ محنت کرنے سے ضروریات زندگی فراہم ہو جاتی ہین اور مال و دولت کی تقسیم تقریباً مساوی ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ دوسرے اثرات بھی کام کرتے ہین۔ تاہم اگر ممالک متحدہ امریکہ کو وسط امریکہ و شمالی امریکہ سے مقابلہ کیا جائے اور شمالی ہندوستان کا مقابلہ جنوبی ہندوستان اور نیپال سے ہو یا اطالیہ و فرانس کا مقابلہ شمالی روس سے کیا جائے تو مندرجہ بالا امور پایۂ ثبوت کو پہنچ جائین گے۔

علم المعیشت کی ضروریات | حکومت ملکی خصوصیات کو اگرچہ تبدیل نہین کر سکتی مگر زمین کی زرخیزی تجارت کی ترقی مین اعتدال پیدا کرتی ہے اور مزدوری پیشہ کے لئے ایسے ذرائع بہم پہنچا سکتی ہے جس سے تقسیم دولت تقریباً مساوی ہو اسلئے اگر کوئی قوم اپنے ملک کی خصوصیات کا لحاظ نہ کر کے ترقی

کرنا چاہے تو وہ ناپائدار اور مخدوش ہوگی ۔ اور برے اثرات کا پیدا ہو جانا ضروری ہے ۔ اسی وجہ سے وہ علم جدید جسے معاشیات کہتے ہیں قومی اور ملی ترقی کے لیئے ضروری ہے ۔

مقالہ دوم ملک اور اسکی تقسیم

سلطنت کی ملکی وسعت جس طرح سلطنت کی داخلی بنیاد انسانی فطرت پر منحصر ہے۔ اسی طرح خارجی بنیاد ملک پر ہوتی ہے۔ وہ حصہ زمین جو کسی سلطنت کے ماتحت ہوتا ہے اُسے "ملک" کہتے ہین۔ اور ملک کی وسعت کا سلطنت کی اہمیت اور اُسکے نظام عمل پر خاص اثر پڑتا ہے۔ ملک اور ملت ایک دوسرے پر اپنا اثر کرتے رہتے ہین مثلاً اگر ملک چھوٹا اور ملت بڑی ہو تو یہ نوآبادیان قائم کرنے پر مجبور ہوگی یا دوسری سلطنت پر حملہ کریگی۔ بخلاف اسکے وہ ملتین جو قلیل التعداد ہین اور ملک وسیع ہے۔ اپنی حفاظت کے لئے دوسری اقوام سے اتحاد قائم کرینگی یا ملک کی وسعت کی وجہ سے ایک ہی ملت کے کئی ٹکڑے ہوجاینگے اور اپنی جداگانہ سلطنت قائم کرلینگے۔

موجودہ تہذیب نے ملکی وسعت کی بنا ڈالی اگرچہ زمانہ گذشتہ مین اکثر سلطنتون کی ملکی وسعت بہت زیادہ تھی مگر درحقیقت اُسی سلطنت کے اندر متعدد خودمختار سلطنتین قائم ہوجاتی تھین۔ بعض اوقات مختلف قصبے اور گاؤن تک آزاد ہوتے تھے اور اپنی حفاظت خود کرتے تھے۔ اس کے متعدد وجوہ ہین۔

(۱) سڑکون اور وسائل آمدورفت کی کمی۔

(۲) اپنے ذاتی اور خاص حقوق قائم کرنے کی خواہش۔

(۳) ذرائع جنگ اور پولیس کی خرابی اور حیات ملی اور اتحاد کی کمی۔

بخلاف اسکے موجودہ زمانہ مین وسیع سلطنتون کی بنیاد ان وجوہ سے پڑی جو متذکرہ بالا وجوہ کی ضد ہین۔ اور انکا اعادہ فضول ہے سلطنت کی قوت زیادہ تر اُس سلطنت کے باشندون کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وسعت ملک کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔

زمانہ قدیم مین یہ خیال تھا کہ سلطنت کی وسعت اتنی ہونی چاہیے جہانتک کہ وہ اپنے دارالسلطنت سے بہ آسانی اثر اور انتظام قائم رکھ سکے۔ مگر زمانہ موجودہ مین وخانی کلون کی وجہ سے فاصلہ بالکل بے بنیاد ہوگیا ہے اور سلطنت کی ملکی وسعت کی کوئی حد مقرر نہین کی جاسکتی۔ اور تمام دنیا ایک ہی سلطنت مین وابستہ ہوسکتی ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیشہ سلطنت کی قوت اُسکی وسعت سے زیادہ نہین ہوسکتی۔ چونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک وسیع سلطنت لڑائیون سے کمزور ہوکر دور دراز ممالک پر سلطنت نہ قائم رکھ سکے اور چھوٹی سلطنت اپنی خوش انتظامی کی وجہ سے اُس سے طاقتور ہوجائے۔

حدود — سلطنت کے ملکی حدود عموماً مستقل ہوتے ہین۔ اور سوائے جنگ یا خاص معاہدون کے تبدیل نہین ہوتے۔ حدود قدرتی ہوتے ہین۔ یا مصنوعی۔ قدرتی حدود۔ دریا۔ پہاڑ۔ سمندر بیابان وصحرا ہین۔ مصنوعی حدود بذریعہ دیوار

خندق یا کٹہرے وغیرہ کے بنائے جاتے ہین۔ بعض اوقات کئی ملک مل کر نئی اور وسیع سلطنت بنا لیتے ہین۔ ایسی صورت مین مممالک متحدہ یا تو اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے مساوی درجہ رکھتے ہین (مثلاً امریکہ کی مختلف ریاستین) یا ایک ملک شہنشاہی ملک ہو جاتا ہے اور دوسرے ممالک ماتحت سلطنتون یا نوآبادیون مین تقسیم ہو جاتی ہین (جیسے انگلستان اور اُسکے ماتحت ممالک اور نوآبادیان ہین)۔

مگر جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ سلطنت کی وسعت کی کوئی خاص حد مقرر نہین کی جا سکتی۔ اور سیاست کا حقیقی تخیل یہ چاہتا ہے کہ کل دنیا سلطنت واحد بن جائے اور انسانیت کو بنائے سلطنت قرار دیا جائے۔ اور کل دنیا کے انسان مل کر متحدہ ملت کی صورت مین آ جائین اور یہ اُسوقت ہو سکتا ہے جب کل ملتین جو حکومت کی قابلیت رکھتی ہین حکومت خود اختیاری حاصل کر لین اور قانون ملل قانون عالم ہو جائے۔

سلطنت کی سیاسی تقسیم | حکومت کی غرض سے عموماً سلطنت کے مختلف حصے کر دئے جاتے ہین۔ خواہ وہ مندرجہ ذیل اسباب مین سے کسی سبب (یا اسباب) سے ہون۔

۱۔ سیاسی وجوہ۔

۲۔ قدرتی (مثل دریا و پہاڑ وغیرہ) حد بندی۔

۳۔ تجارتی وجوہ۔

(۴) تاریخی وجوہ

صوبہ کسی سلطنت کے وسیع حصۂ زمین کو جو بطور خود ایک چھوٹی سلطنت کہی جا سکتی ہو صوبہ (یا ولایت) کہتے ہین اور صوبہ کی حکومت عموماً علیحدہ ہوتی ہے اور وہ مرکزی حکومت کے ماتحت ہوتی ہے۔

حلقہ یا قسمت صوبے کے بڑے حصے جو ملک مین کئے جا سکتے ہین حلقے کہلاتے ہین یہ تقسیم مقامی خصوصیت یا خاص قبائل کی آبادی کی وجہ سے نہین بلکہ نظام حکومت کے قیام اور باقاعدہ حکومت کی غرض سے کی جاتی ہے اسے ہندوستان مین کمشنری کہتے ہین۔

ضلع حلقہ کے سیاسی حصون کو ضلع کہتے ہین اور یہ حلقہ کے نظام حکومت کے ماتحت ہوتے ہین ضلع انتخاب اور انصاف مین آسانی پیدا کرنے مین مدد دیتا ہے

تحصیل ضلع مختلف تحصیلون مین تقسیم ہوتا ہے اور یہ تقسیم ہندوستان کی حکومت موجودہ مین زیادہ تر مالگزاری وصول کرنے کی آسانی کی وجہ سے ہے۔

باب خامس

سلطنت کا نصب العین

مقالہ اوّل سلطنت اصل مقصود ہے یا ذریعہ مقصود؟

نظریۂ قدیم قدیم یونانیوں کا یہ نظریہ تھا کہ انسانی کوششوں کا آخری مقصد سلطنت قائم کرنا ہے اور افرادِ ملت سلطنت کے ایسے اجزا سمجھے جاتے تھے جیسے اعضائے انسانی جزوِ بدن ہوتے ہیں اور جس طرح اعضائے بدن جسم کی خدمت کرکے خود بھی فائدہ حاصل کرتے ہیں اسی طرح افرادِ ملت کا فرض صرف سلطنت کی خدمت کرنا ہے اسی وجہ سے اُنکے ذاتی حقوق کی اتنی پرواہ نہیں کیجاتی تھی جتنی کہ موجودہ زمانہ میں ہے افراد کو سلطنت کی اغراض کے لئے اپنی ہستی کو قربان کر دینا پڑتا تھا اور اُنکی ہستی و بقا کا صرف اس وقت تک خیال کیا جاتا تھا جبتک کہ وہ سلطنت کی بہتری اور خدمت کیلئے کارآمد ہو سکتے تھے اس طرح انفرادی آزادی ملی آزادی کا جزو تصور کیجاتی تھی۔

نظریۂ جدید موجودہ امریکن اور انگریز مدبرین کا تخیل متذکرہ بالا اصول کے قطعی خلاف ہے وہ سلطنت کو افراد کی سلامتی اور ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں مسکالے نے اپنے مضامین میں متواتر لکھا ہے کہ عہد قدیم کے مدبرین خصوصاً شیاملی کی یہ غلطی ہے کہ وہ اس اصول کو کہ سوسائٹی اور قانون صرف انفرادی مسرت کی ترقی کی غرض سے ہے نہیں مانتے موجودہ مدبرین سلطنت کو مشین کے مانند سمجھتے ہیں جو اُن کی جان و مال آزادی اور مسرت کی محافظ ہے اگر سلطنت کو صرف افراد کا فرض سمجھتے تو اس خیال سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اسکے لئے انکا خیال ہے

مانا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں نظریہ کے ذریعے سے ترقی ہوئی۔

نظریات بالا کی یکطرفگی

اس میں شک نہیں کہ نظریات بالا میں حقیقت کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے مگر دونوں تصویر کے ایک ہی رخ کو دیکھتے ہیں دوسرے رخ کا خیال نہیں کرتے یہ سوال کہ سلطنت اصل مقصود ہے یا ذریعہ مقصود خود ہی غلط ہے اور اسی کی وجہ سے یکطرفہ رائے قائم ہوتی ہے ایک نقطۂ نظر سے وہی چیز ذریعہ مقصود ہو سکتی ہے اور دوسرے نقطۂ نظر سے اصل مقصود کسی مصور کے لئے تصویر کشی ذریعہ مقصود بھی ہو سکتی ہے (یعنی اس کے معاش کے حصول کا ذریعہ) اور اس کی محنتوں کا اصل مقصود بھی یہ ہی تصویر ہو سکتی ہے یعنی یہ ممکن ہے کہ بذات خود تصویر ہی اسکے تخیلات کا مرکز وحید ہو یہ ہی سلطنت کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے یعنی سلطنت ملت کے بہتری کا ذریعہ بھی ہے اور بذات خود سلطنت اصل مقصود بھی ہے جس کے لئے افراد ملت ماتحت کارگذاروں کے مانند ہیں۔

نظریہ قدیم نے افراد قوم کی کچھ پرواہ نہ کی اور انکی آزادی و سلامتی کو خطرے میں ڈالکر سلطنت کو رفتہ رفتہ شخصی حکومت کے مانند ظالم بنا دیا۔ موجودہ تخیل نے سلطنت کی عظمت کی پرواہ نہ کی اور اسے افراد کا مجموعہ سمجھکر بغاوت اور انقلاب پسندی میں ترقی دی۔

عہد قدیم کے خلاف موجودہ زمانہ کی سلطنت نے انفرادی آزادی کی ذاتی نشوونما میں بہت مدد دی ہے۔ اور حکام کی مرضی افراد ملت کی مرضی کے

خلاف عمل نہیں کر سکتی۔ عوام الناس کے بہتری کے لئے کثیر تعداد میں مختلف محکمے قائم ہوتے جاتے ہیں مگر ایک منطقی اور سیاسی غلطی یہ ہے کہ سلطنت کے قیام کو صرف انفرادی ہستی کے قیام اور ترقی کے واسطے سمجھا جاتا ہے۔

ہر قوم میں ایسے افراد کی تعداد کثیر ہوتی ہے جو اپنے ذاتی مفاد کو ملی اغراض کیلئے قربان کردیتے ہیں گویا یہ اپنی ہستی کو سلطنت کی ہستی پر مقدم سمجھتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت محض مجموعہ افراد نہیں ہے بلکہ اس سے بالاتر درجہ رکھتی ہے لہذا ملی سلامتی انفرادی سلامتی کے مجموعہ کا مترادف نہیں ہو سکتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ افراد اپنی سلامتی کے لئے سلطنت سے امداد طلب کرتے ہیں اور سلطنت اُن کی سلامتی کو قائم رکھنے کے لئے افراد ملت سے سخت محنت اور ایثار کا کام لینے پر مجبور ہوتی ہے مختصر یہ کہ سلطنت بعض اوقات انفرادی فوائد کا سبب ہوتی ہے اور بعض اوقات افراد ملت سے اُنکی خدمت طلب کرتی ہے مقالات آئندہ میں ان دونوں۔ وجوہ کے اسباب سے بحث کیجائے گی۔

مقالہ دوم سلطنت کے غلط العین نصب العین

۱۔ سلطنت کا نصب العین حاکم کے اقتدار کو قایم رکھنا ہے

بعض مدبرین کا یہ خیال ہے کہ بادشاہوں کے اقتدار کو قائم رکھنا اور اُن کے واسطے انفرادی مسرّت اور آزادی کی قربانی سلطنت کا حقیقی نصب العین ہے اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ صرف شخصی حکومت کا قیام انسانی کوششوں کا مطمح نظر ہے۔ ایسی صورت میں ملی آزادی اور انفرادی خصوصیات کا نشوونما ہونا ناممکن ہے۔ بادشاہ بھی مثل دیگر انسانوں کے ایک انسان ہے اور جتنے دلائل بالا خیال پوری ملت کی غلامی کو جائز سمجھتا ہے۔ وہ کل دلائل جو غلامی کے خلاف استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اس تخئیل کے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہ تخئیل فطرۃً ناقابل تسلیم ہے کسی قوم وملت کا سردار درحقیقت اُسکا سردار نہیں ہوتا۔ بلکہ عربی مثل کے مطابق اُسکا خادم ہوتا ہے۔ اور یہ بات اسوقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جبتک کسی حاکم یا بادشاہ کے اقتدار ہی کو قائم رکھنا اور صرف اُسکی قوت کے لئے ذاتی وملی مفاد کی قربانی جائز رکھی جائے

۲۔ سلطنت کا نصب العین الٰہی حکومت کا قیام ہے

زمانہ وسطیٰ کی بعض سلطنتیں اور زمانہ قدیم کی

ہندو اور جاپانی حکومتیں بادشاہ کو خدائی قوتوں کا شریک اور دیوتا سمجھتے تھے۔ اُسکی دنیاوی حکومت کو ایسا ہی سمجھا جاتا تھا جیسا کہ خدا کی حکومت ہے اور خدائی احکام کی مانند بادشاہی احکام میں چون وچرا کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہ تخیل عیسائی اور مغل اقوام میں رائج تھا اور اس امر کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا کہ خدا اپنی مخلوق پر حکومت کرتا ہے اور بادشاہ جن لوگوں پر حکومت کرتا ہے وہ اُس کی مخلوق نہیں ہیں بلکہ ایسے انسان ہیں جو بالکل اُسی کی مانند ہیں۔ کسی بادشاہ کو خدا کی مانند سمجھنا اُسکو مغرور، خود رائے، اور غیر ذمہ دار بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ موجودہ زمانہ میں مذہب کی وقعت قائم رکھتے ہوئے اس غلط اصول کو چھوڑ دیا گیا ہے اور مذہبی حکومت اُسی حد تک قابل تسلیم سمجھی جاتی ہے جس حد تک بادشاہ یا حاکم بحیثیت ایک خادم ملت وانسانیت کے کام کرے۔

مقالہ سوم سلطنت کے ناکافی یا مبنیٰ آمیز نصب العین

۱۔ ذاتی حقوق اور مال کی حفاظت

جرمن فلاسفر کانٹ اور انگریز فلاسفر لاک ایک دوسرے سے اس امر پر متفق ہیں کہ سلطنت کا نصب العین یہ ہے کہ وہ بیرونی دشمنوں اور اندرونی فسادات سے انسانی آزادی کو محفوظ رکھے۔ اگرچہ موجودہ زمانہ میں بھی سلطنت کا یہ فرض ہے کہ افراد قوم کے قانونی حقوق کی حفاظت کرے مگر صرف اسی حد تک محدود رہنا گویا انسانی بلند خیالی اور قوت ارتقا کو محدود کرتا ہے۔

اس خیال کے تاریک پہلو

موجودہ زمانہ میں اس تخیل پر عمل کرنا تہذیب و ترقی کو محدود کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس اصول کو ماننے والی سلطنتیں معاشی و تمدنی ترقی نہیں کر سکتیں کیسی قوم کے قانونی حقوق کی حفاظت اُس قوم کے ذرائع معاش کو وسیع نہیں کر سکتی۔ معاشرت کے لئے ریل۔ تار۔ سڑکیں نہریں وغیرہ ضروری ہیں۔ اور قانونی حفاظت کا اس معاشی ترقی سے کوئی سروکار نہیں ہے علاوہ بریں ملت کو اپنے دماغی نشوونما کے لئے علوم فنون کے مرکز۔ تعلیمی مدارس۔ حفظان صحت کے محکمے قائم کرنے پڑتے ہیں جنہیں انفرادی کوششوں تک محدود کر دینا ملی تنزل

کا باعث ہو سکتا ہے ان باتوں کو سلطنت ہی بہتر انجام دے سکتی ہے اور اس اصول کو اگر عملی جامہ پہنایا جائے تو مندرجہ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(الف) معاشی مقاصد سے لاپرواہی ہو جاتی ہے۔

(ب) دماغی نشوونما سے لاپرواہی ہو جاتی ہے

(ج) جذبات عامہ کو فنا کر کے ملی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔

(د) مقدمہ بازی کی عادت پڑ جاتی ہے جس سے سلطنت کی وقعت کم ہو جاتی ہے

(ہ) یہ امر فراموش ہو جاتا ہے کہ ملت اس سیاسی ہستی کا نام ہے جو صرف نفاذ قانون اور حقوق ذاتی کی محافظت ہی کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ بلکہ بلند ترین سیاسی حکومت اور ارتقائے حریت سے تعلق رکھتی ہے

مسرت عامہ جس طرح متذکرہ بالا اصول نہایت محدود ہے اسی طرح یہ اصول کہ سلطنت کا نصب العین مسرت عامہ کا حاصل کرنا ہے نہایت ہی وسیع اور مبالغہ آمیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی دماغی اور جسمانی قوتیں اور تخیلات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ہر شخص کا معیار مسرت جداگانہ ہے اور حکومت و سلطنت ہر شخص کی مسرت میں ترقی نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے اسکا تعلق صرف انفرادی کوششوں پر ہے جس طرح تمام مادی و روحانی فوائد صرف انسان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور سلطنت میں یہ قوت نہیں ہے کہ اسمیں وہ جذبات و محسوسات

پیدا کرسکے جن سے وہ فطرۃً محروم ہے مثلاً نہ تو سلطنت کسی انسان کو شاعر بنا سکتی ہے نہ محبت و مذہب کے جذبات پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح سلطنت کا نصب العین گوناگون انفرادی مقاصد کا مترادف نہیں ہو سکتا اور نہ سلطنت کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اُنکے حصول کی ذمہ دار بن سکے۔

اس اصول کے خطرناک نتائج

اس اصول سے متعدد نتائج بد پیدا ہو سکتے ہیں جن میں سے چند خاص اثرات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(الف) سلطنت کو اپنا دائرہ اثر اتنا وسیع کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی مقررہ حد سے باہر ہو جاتی ہے۔

(ب) چونکہ سلطنت گوناگون انفرادی مقاصد کے حصول کا بار نہیں اٹھا سکتی لہذا اس سعی لاحاصل میں بجائے ترقی مسرت کے تنزل مسرت ہوتا ہے

(ج) چونکہ سلطنت اپنی قوتوں کو ان مقاصد کے حصول میں صرف کرتی ہے جو اسکے دائرہ اثر سے باہر ہیں یا جن کے لئے اُس کی قوتیں ناکافی ہیں لہذا اسکا لازمی نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی اور جائز مقاصد کے درپے ہو جاتی ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی سے قاصر ہو جاتی ہے۔

مقالہ چہارم سلطنت کا حقیقی نصب العین

صرف ایک نصب العین ہوسکتا ہے

سلطنت کا صرف ایک ہی تخیل ہوسکتا ہے اگرچہ مختلف قوام نے مختلف زمانوں میں اسپر مختلف طریقوں سے عمل کیا ہے ہمیں ایسے نصب العین کی تلاش ہے جو ہر سلطنت کے لئے موزوں ہو یعنی عالمگیر بھی ہو اور فطرت انسانی کے منافی بھی نہ ہو ہمارا اعلیٰ و ارفع مقصد وحید کیا ہوسکتا ہے؟

انصاف نہایت محدود ہے

اگر یہ کہا جائے کہ سلطنت کا نصب العین انصاف[۹۱] (عدل) ہے تو یہ مقصد نہایت محدود ہو جاتا ہے[۹۲]۔ اس میں شک نہیں کہ قانون ایوان سلطنت کا ایک زبردست ستون ہے۔ مگر مقصود سلطنت نہیں ہے یعنی

---

۹۱ انصاف کے اس جگہ وہ معنی لئے گئے ہیں جو قانون عامہ اور قانون ملل میں لئے جاتے ہیں۔ اگر انصاف (عدل) کو ہم اس فلسفیانہ تخیل کا مترادف سمجھیں جو افلاطون و ارسطو نے بتایا ہے تو انصاف کل اخلاقیات کا بنیادی اصول ہو سکی۔ تب اخلاقیات کا مترادف ہو جاتا ہے اسکا مفصل بیان آگے ہے۔

۹۲ مقالہ دوم دیکھئے۔

ملی زندگی قانونی زندگی کو نہیں کہتے بلکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ملی زندگی معاشی، دماغی اور تمدنی زندگیوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔

اخلاق نہایت وسیع ہے

سب مدبروں سے پہلے افلاطون نے یہ بتایا ہے کہ سلطنت کا نصب العین اخلاق ہے۔ غالباً اس تخیل سے متاثر ہو کر عموماً تمام مسلمان سلطنتوں نے اخلاق کو سلطنت کا نصب العین قرار دیا تھا۔ مگر اخلاق کو درست کرنے اور قابو میں رکھنے والی دو قوتیں ہیں۔ (۱) خدا (۲) انسانی قوتِ ارادی۔ اور یہ دونوں قوتیں سلطنت کے حلقۂ اثر سے باہر ہیں اسی وجہ سے اخلاقیات کے حدود سیاسیات سے وسیع تر ہیں۔ اور سلطنت کے لئے اس اصول پر کاربند ہونا ناممکن ہے اور اگر اخلاقیات کو اپنے دائرۂ اثر میں محدود کرنا چاہے تو اس پر خراب اثر پڑنا ضروری ہے۔

سلطنت کے نصب العین کو عموماً اس وجہ سے غلط سمجھا گیا ہے کہ زیادہ توجہ یا تو افراد کے مجمع پر دی گئی ہے یا حکام کے مظالم پر اور اس طرح ملت کی ہستی کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے اور یکطرفہ یا مبالغہ آمیز خیالات قائم کر لئے گئے۔

بہبودی عامہ

اہل روما نے سلامتی اور بہبودی کو سلطنت کا نصب العین قرار دیا۔ یہ خیال بہت کچھ صحیح ہے۔ ہر مدبر کو اپنی ملت کی بہبودی کا خیال ہوتا ہے اور ہر فرد ملت کو سلطنت کی بہبودی مدنظر ہوتی ہے۔ لہذا بہبودیٔ عامہ سیاسی حکمت عملی کا جزو لاینفک ہے اور اسی کی ترقی سلطنت کا فرض اولین ہے اس تعریف میں نہ صرف قانونی ترقی بلکہ انسانی قوتوں کا نشوونما شامل ہے۔ رومیوں کا یہ اصول

بجائے محدود ہونے کے اتنا وسیع ہو سکتا ہے کہ سلطنت اپنے فرائض کی انجام دہی سے قاصر رہ سکتی ہے۔

بہر حال یہ اصول ایک نقطۂ نظر سے ناکافی ثابت ہوتا ہے یعنی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سلطنت کو اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے بہبودیٔ عامہ کو اس پر سے قربان کر دینا پڑتا ہے۔ اور ایسی صورت میں انفرادی آزادی و مسرت کو (جو عزت کے ساتھ ہرگز قائم نہیں رہ سکتی) ملک و ملت پر قربان کر دینا سب سے بڑا ایثار سمجھا جاتا ہے۔

اگرچہ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی سلطنت کے زیر اثر رہ کر یہ سلطنت تھوڑی سی آزادی قائم رکھ سکے۔ مگر اس آزادی کے مقابلہ میں مرنا بہتر سمجھا جاتا ہے۔

دنیا میں اس قسم کی لاکھوں مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ اکثر سلطنتیں اور قومیں اس طرح سے لڑ کر فنا ہو گئیں یا بعد مصیبت و ایثار کے بعد فاتح اور آزاد سلطنت قائم کر سکیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض سلطنتیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ وہ کسی طرح اپنی آزادی کو قائم نہیں رکھ سکتیں اور اُن کو یا تو فنا ہو جانا پڑتا ہے یا مجبوراً کسی بڑی سلطنت کا جزو بننا پڑتا ہے۔ مثلاً جرمنی کی متعدد سلطنتیں فنا ہو کر ایک وسیع سلطنت کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ مندرجہ بالا صورتوں میں اگر سلطنت کا نصب العین بہبودیٔ عامہ کو مانا جائے تو وہ یقیناً ناکافی ہے۔

حقیقی تعریف

یہ کل اعتراضات اُس وقت دور ہو جاتے ہیں جب ہم سلطنت کے نصب العین کو مندرجہ ذیل طریقہ پر ترتیب دیں۔ کہ سلطنت کا حقیقی نصب العین ملی قوتوں کا ارتقا۔ ملی زندگی کی ترقی اور تکمیل ہے۔ بشرطیکہ یہ ترقی اصول انسانیت کے منافی نہ ہو۔

اس نظریہ میں سلطنت کا ہر جائز فعل شامل ہے اور وہ تمام افعال جو سلطنت کے دائرہ سے باہر ہیں خارج کر دئے گئے ہیں یہ نظریہ نہ تو محدود ہے۔ نہ بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس اصول سے سلطنت کے مقصد کی توحید قائم رہتی ہے مگر اس کی ترقی کے مختلف ذرائع نہ تو فنا ہوتے ہیں نہ اُن کے استعمال سے مقصد میں خرابی اور دورنگی پیدا ہو سکتی ہے۔

جس طرح ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ اپنی خداداد قابلیتوں کو ترقی دیکر اپنے جوہر ذاتی کو ظاہر کرے اسی طرح سلطنت کا فرض ہے کہ اپنی ملی خصوصیات کو ترقی دے کر اپنے مخفی اور اصلی جوہر کو ظاہر کرے۔ لہذا اس اصول کے مطابق سلطنت اپنے دونوں فرائض نہایت اعتدال کے ساتھ انجام دے سکتی ہے۔ یہ دو فرائض یہ ہیں کہ اپنی ملی قابلیتوں کو قائم رکھنا اور ان کو حتی الامکان ترقی دینا اور وسائل ترقی مہیا کرنا

باب دس

اقسامِ حکومت

مقالہ اول حکومت کی تقسیم

دو ہزار برس سے زیادہ ہوئے جب ارسطو نے حکومت کی وہ تقسیم کی تھی جو ابتک مانی جاتی ہے۔ ارسطو نے اس تقسیم کو اس تخیل سے شروع کیا کہ سلطنت میں ایک مرکز حکومت ہوتا ہے جسکے ماتحت سلطنت کا ہر ایک شعبہ ہوتا ہے یہ مرکز حکومت سلطنت پر خاص اثر ڈالتا رہتا ہے اور حکومتوں کی تقسیم قدرتاً اسی بنیاد پر ہوتی ہے۔

اصلی صورتیں ارسطو نے اُن سلطنتوں کو جو جماعت و قوم کی بہبودی چاہتی ہیں اصلی یا حقیقی بتایا ہے اور اُن سلطنتوں کو جو صرف حکام کے فوائد کو مدنظر رکھتی ہیں معکوس یا منقلب قرار دیا ہے۔ لہذا ارسطو کے خیال کے مطابق تین اصلی شکلیں ہیں اور انکی تین معکوس صورتیں ہیں۔ حکومت یا تو ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے یا چند آدمیوں یا بہت سے آدمیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یعنی:-

(۱) شاہی سلطنت جو فردِ واحد کی حکومت ہوتی ہے۔

(۲) حکومت الاشراف (یا حکومت امرا) جو چند بہترین افراد ملت کی حکومت کا نام ہے

(۳) جمہوری حکومت۔ جو عوام کی حکومت کو کہتے ہیں۔

معکوس صورتیں | مندرجہ بالا اقسام حکومت کی تین معکوس صورتیں ہیں۔

(۱) خود مختار شخصی یا استبدادی حکومت جو صرف بادشاہ کے ذاتی مفاد کے لئے ہوتی ہے

(۲) حکومت خواص یا چند مالداروں کی حکومت محض اپنے فائدے کی غرض سے ہوتی ہے۔

(۳) حکومت عوام۔ یہ حکومت غریب اور جاہل عوام الناس کی حکومت ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا تقسیم میں ارسطو نے اُن انسانوں کی تعداد پر زیادہ زور دیا ہے جو حکومت میں حصہ لیتے ہیں لیکن دوسری جگہ وہ ایک ضروری اصول بتاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ حکومت کی تقسیم میں زیادہ توجہ حکومت کرنے والوں کی صفات پر رکھنی چاہیئے اور تعداد حکام کو اتنا ضروری نہ سمجھنا چاہیئے یعنی حکام کی صفت کو اُنکی کمیت پر ترجیح دینی چاہیئے۔ تاہم اُس نے کہیں اس اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا۔

حکومت الٰہیہ | تاریخ بتاتی ہے کہ ارسطو کی تقسیم غیر مکمل ہے۔ دنیا میں ایسی سلطنتوں کا بھی وجود پایا جاتا ہے جو ان تینوں قسموں میں سے کسی میں داخل نہیں ہیں تقسیم بالا میں حکومت کی قوت صرف انسانوں کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے۔ مگر ایسی سلطنتیں بھی موجود

ہیں جنہیں یہ قوت یا تو خدا سے منسوب کیجاتی ہے یا کسی مافوق الفطرت ہستی یا ایسے انسانوں سے جنہیں حکومت کا حق کسی نہ کسی طرح خدا سے پہنچا ہے ایسی حکومت کو الٰہی حکومت اور اس کی معکوس صورت کو حکومت شیطانی یا ملحدانہ کہہ سکتے ہیں

حکومت مخلوط | یہ تقسیم درحقیقت خیالی ہے۔ عملی دنیا میں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ بعض اوقات شاہی حکومت جمہوری حکومت کی مانند ہوتی ہے اور شاہی حکومت کسی قدر جمہوری حکومت سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ تاہم یہ قدیم تقسیم بے معنی نہیں ہے اور اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ نظام حکومت پر طرز حکومت کا کافی اثر پڑتا ہے لہٰذا ہم ایسی حکومت کو جمیں شاہی آئینی۔ اور جمہوری حکومتیں دوسرے سیاسی اثرات سے اپنے اختیارات محدود کرلیں حکومت مخلوط کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً انگلستان کے بادشاہ کی شاہی حکومت دارالامرا اور دارالعوام کے زیر اثر ہے۔ اس قسم کی محدود حکومت شخصی آئینی اور جمہوری حکومتوں سے بہتر ہوتی ہے۔ بشرطیکہ یہ حکومتیں اپنے اختیارات کا بیجا استعمال نہ کریں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایسی مخلوط حکومت کوئی نئی حکومت نہیں ہوتی اسلئے ایسی حالت میں بھی حکومت یا تو شاہی یا آئینی یا جمہوری کہی جاسکتی ہے۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر قوت حکومت کو بادشاہ۔ اشراف اور جمہور میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ انکی حکومتیں پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے سے آزاد رہیں۔ تو اس قسم کی مخلوط حکومت اول تو نہایت ہی خراب ثابت ہوگی اور دوسرے

بلکہ اسکا جاری رہنا ناممکن ہو جائیگا۔ یہ خیال حکیم طیسیطوس کا ہے

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی قوت کی تقسیم ایسی سلطنت پیدا کر دے گی جسمیں دورنگی ہوگی اور یہ سلطنت کے تخیل کے منافی ہے جسے بحیثیت ذی روح ہستی ہونیکے اس امر کی ضرورت ہے کہ یہ واحد ہو یعنی اسمیں یکرنگی پائی جائے ہر ایک جاندار ہستی کے مختلف اعضا اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں" اسمیں بعض کا اعلیٰ اور بعض کا ادنےٰ درجہ ہوتا ہے۔ اور اُن سب میں ایک عضو ایسا ہوتا ہے جسمیں قوت حکومت کا مرکز ہوتا ہے اسی طرح سلطنت کے لئے ایک ایسے عضو کی ضرورت ہے جو اُس کی قوتوں اور شعبوں کے اختلاف کو یکرنگ کرکے توحید پیدا کر دے۔ یہ مرکز حکومت کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس امر کی ضرورت ہے کہ سلطنت کی یکرنگی اور توحید کو قائم رکھنے کے لئے مرکز حکومت کئی حصوں میں تقسیم نہ ہو بلکہ واحد ہو

اقسام حکومت بلحاظ صفت کمیت یا تعداد حکام پر اگر زور نہ دیا جائے اور صرف حکام کی صفت کا لحاظ رکھا جائے تو سلطنت کی چار مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ حکومت الٰہیہ پہلی قسم حکومت الٰہیہ (یا مذہبی حکومت) ہے اسمیں حاکم یا بادشاہ کو یا تو مافوق الفطرت انسان (دیوتا یا اوتار) سمجھا جاتا ہے جو قدرتاً اور سب انسانوں سے بلند پایہ رکھتا ہے یا کسی اور کسی صورت میں خدا کو سلطنت کا اصلی حکمراں مانا جاتا ہے

۲۔ حکومت جمہوریہ | مذہبی یا الٰہی حکومت کی ضد جمہوری حکومت ہے

مذہبی حکومت میں انسان ایسی قوت کا ماتحت ہوتا ہے۔ جو اس سے الگ اور ممتاز درجہ رکھتی ہے حکومت جمہوری میں انسان خود اپنا حاکم ہوتا ہے یعنی بحیثیت مجموعی کل ملت حاکم ہوتی ہے انفرادی حیثیت سے ہر فرد ملت محکوم ہوتا ہے

۳۔ حکومت الاشراف | حکومت الاشراف میں ایک جماعت بالا حاکم بنجاتی ہے اور دوسری جماعتیں رعایا ہوجاتی ہیں لیکن جماعات ادنیٰ کو اگرچہ حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ تاہم جماعت اشراف کا ہر شخص علیحدہ علیحدہ بحیثیت رعایا کے سمجھا جاتا ہے اور یہ لوگ صرف مجموعی حیثیت سے حاکم ہوتے ہیں۔

۴۔ شاہی حکومت | شاہی حکومت میں بادشاہ اور رعایا کا فرق اظہر من الشمس ہے ایسی حکومت میں ایک ہی شخص بادشاہ یا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے جو خود رعایا میں شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ قوم کی تمام قوتوں کا مرکز وحید ہوتا ہے اور بادشاہ اپنی پوری سلطنت کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔

اقسام بالا کا امتیاز | حکومت الٰہیہ اور حکومت شاہی ایک نقطۂ نظر سے حکومت اشراف اور حکومت جمہوری سے بالکل الگ ہوتی ہیں اُن حکومتوں میں حکمران افراد اپنی سلطنت وملت کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا مرکز ہوتے ہیں اور خود محکوم یا رعایا کی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ سراسر سلطنت کے مفاد کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے۔ بخلاف اسکے حکومت الاشراف اور

حکومت جمہوری میں رعایا اور حاکم کا فرق اتنا صاف نہیں ہوتا۔ اور وہی لوگ بعض اوقات حاکم ہوتے ہیں اور بعض اوقات محکوم اسی وجہ سے وہ نہ صرف سلطنت کے مفاد کا خیال کرتے ہیں بلکہ اپنے مفاد کو بھی مدنظر رکھتے ہیں جمہوریت میں یہ کام تمام افراد ملت کا ہوتا ہے اور حکومت الاشراف میں صرف حکومت کرنے والی جماعت تک محدود رہتا ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر سے حکومت الاشراف اور حکومت شاہی ایک دوسرے سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں اور انکی ترتیب اس طرح سے ہوتی ہے کہ حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں اور حکومت اُن کے نام سے ہوتی ہے۔ یہ صفات شاہی حکومت میں زیادہ واضح اور روشن ہوتی ہیں۔ بخلاف اسکے مذہبی (یا الہی) اور جمہوری سلطنتوں کی حکومت ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ الہی حکومتوں میں ایک درمیانی طبقہ کے ذریعہ سے حکومت ہوتی ہے۔ یہ طبقہ کاہنوں یا مُلاؤں کا ہوتا ہے جمہوری سلطنتوں میں یہ درمیانی طبقہ قاضیوں اور مفتیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مُلّا اور قاضی بذات خود رعایا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انکو حکمرانی کی قوت صرف بحیثیت وکیل کے ہوتی ہے۔ یہ طبقہ بادشاہوں اور اشراف کی طرح اپنے نام سے حکمرانی نہیں کرتا۔ بلکہ ہمیشہ اس بات پر مجبور رہتا ہے کہ اپنی کارروائی کا استصواب اپنے سے بالاتر قوت (خدا یا ملت) سے کرتا رہے

سلطنت اور انسان کا مقابلہ

بعض مدبر یہ خیال کرتے ہیں کہ سلطنت کی ترقی

و تنزل اسی طرح ہوتا رہتا ہے جس طرح بچہ جوان ہو کر بڈھا ہو جاتا ہے ۔ اعتبار سلطنت کی چار عمریں ہوتی ہیں جو انسانی عمر کے متوازی بھی جاتی ہیں اور جس طرح ہر انسان حد عمر سے کچھ نہ کچھ امتیاز رکھتا ہے ۔ اسی طرح ہر سلطنت میں ایک صفت ذاتی ہوتی ہے بعض انسانوں کی طبیعت میں خواہ وہ بڈھے ہی ہو جائیں لڑکپن باقی رہتا ہے اور بعض لڑکپن ہی کی حالت میں پُر تمکنت اور باوقار ہوتے ہیں ۔ اسی طرح بعض اقوام اگرچہ نہایت قدیم ہیں مگر ان میں بچپن پایا جاتا ہے جیسے افریقہ کی سیاہ نسل ۔ اور بعض اقوام اگرچہ ابھی عالم ارتقا کے پہلے درجوں میں ہیں مگر ان میں وقار و تمکنت موجود ہے جیسے افغان

اقسام حکومت بلحاظ حقوق رعایا

نظام حکومت سلطنت کے جسم کا گویا سر ہوتا ہے اسی لحاظ سے اسکا اثر ملت کے پورے طرز عمل پر پڑتا ہے لیکن رعایا کا بھی خاص اثر حاکموں کی جماعت پر پڑتا ہے جس طرح حکومت کے معاملہ میں حاکموں کی صفات پر نظر کیجاتی ہے اسی طرح رعایا کے معاملہ میں اس بات پر نظر کیجائیگی کہ رعایا کو حکومت اور قانون سازی میں کہاں تک دخل ہے اور رعایا کی صفات کے لحاظ سے سلطنت کی تقسیم کس طرح ہو سکتی ہے ۔ اس طرز تقسیم کے مطابق حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں جو تقسیم بالا کے لحاظ سے جو حاکموں کی صفات پر مبنی تھی (یعنی اقسام اصلی) اقسام ثانوی کہی جا سکتی ہیں

استبداد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ محکوم قوم مجہول گروہ کی مانند حکمران قوت کی

قطعی تابعدار ہوتی ہے۔ تو انہیں قانون سازی کا اختیار ہوتا ہے نہ انہیں کسی قسم کا دخل ہوتا ہے اس قسم کی سلطنت کو رعایا کے لحاظ سے غیر آزاد کہا جا سکتا ہے

۲۔ نیم آزاد | ایسی حکومتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں رعایا کے بعض خاص افراد کو جو جماعات اعلیٰ سے متعلق ہوتے ہیں قانون سازی میں کچھ دخل ہوتا ہے لیکن قوم کے باقی ماندہ افراد کو نہ کارہائے عامہ میں دخل ہوتا ہے نہ انہیں کسی قسم کے سیاسی حقوق اور آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کی سلطنتیں نیم آزاد کہی جا سکتی ہیں

۳۔ آزاد | اُن سلطنتوں کو جنہیں تمام جماعتوں کو مساوی سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور پوری ملت قانون سازی میں حصہ لے سکتی ہے اور اپنے اختیار سے حکومت کرتی ہے آزاد سلطنت کہتے ہیں۔ اس قسم کی سلطنت کا دوسرا نام سلطنت جمہوری ہے۔

تقسیم ہذا کا اقسام اربعہ سے تعلق | اگر ہم اقسام ثانوی کو جو اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن چار قسموں سے مقابلہ کریں جنکا پہلے بیان کیا جا چکا ہے تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

(۱) الٰہی حکومت کا رجحان زیادہ تر غیر آزاد سلطنت کی طرف ہوتا ہے۔ مگر اس حکومت کا مطلق العنان ہونا ضروری نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ یہ نیم آزاد یا آزاد سلطنت سے زیادہ قربت حاصل کرے۔ یہ اسوقت ہوتا ہے جب احکام الٰہی کی تعمیل جماعت اشراف کے متعلق ہوتی ہے یا پوری ملت کی امداد اور شرکت سے یہ حکومت کیجاتی ہے اسلامی حکومت اس لحاظ سے مذہبی جمہوریت تھی۔

(۲) حکومت اشراف عموماً نیم آزاد سلطنت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات جماعت اشراف کے حقوق بالکل سلب کر لئے جاتے ہیں اور رعایا میں سے کوئی شخص حکومت میں دخل نہیں دلسکتا تو وہ غیر آزاد ہو جاتی ہے۔

(۳) حکومت جمہوری قدرتاً آزاد حکومت ہوتی ہے مگر یہ حکومت بھی قلیل التعداد اقوام کے لئے شخصی حکومت کی طرح پیش آسکتی ہے بعض اوقات جمہوری حکومت نیم وحشی رعایا کے مقابلہ میں نیم آزاد سلطنت کا درجہ رکھتی ہے (مثلاً امریکہ میں حبشی اقوام کے مقابلہ میں جمہوریہ ریاستہائے متحدہ)

(۴) شاہی حکومت کا اقسام ثانوی سے کئی طرح کا تعلق ہے مطلق العنان شخصی حکومت بالکل غیر آزاد ہوتی ہے۔ ایسی شخصی سلطنتیں جو مذہبی یا قومی اثر کے ماتحت کام کرتی ہوں نیم آزاد ہوتی ہیں۔ اور موجودہ زمانہ کی وہ شاہی حکومت جو نمایندگان ملت کی مجالس سے محدود ہو جاتی ہیں آزاد سلطنت کہے جانے کا حق رکھتی ہے۔

مقالہ دوم - حکومت الٰہیہ (مذہبی حکومت)

زمانہ قدیم کی الٰہی حکومت

سب سے پہلی اور سب سے قدیم سلطنتیں ایشیا اور شمالی افریقہ میں قائم ہوئیں۔ سلطنتیں مذہبی تھیں۔ اسکی وجہ پہلے بیان کی جا چکی ہے[۱] ابتدائی زمانہ کے انسانوں پر قدرت کی مخفی قوتوں کا خوف بہت غالب تھا اور قدرتی اثرات بہ نسبت زمانہ موجودہ کے اُس زمانہ میں زیادہ مہیب اور دلفریب تھے ان اقوام میں ایسے انسانوں کی کافی تعداد ہوتی تھی جو جادوگر، کاہن، یا دیوتا کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ خدا سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی اقوام میں ایسی جماعت ضرور موجود ہوتی تھی جنہیں پجاری کہتے ہیں اور وہ خدا کے محبوب یا اُس کی خدائی کے حصہ دار اور شریک مانے جاتے تھے سوائے ان لوگوں کے نہ تو کوئی شخص خدا کی مرضی و خواہش معلوم کر سکتا تھا اور نہ اُسکے احکام سمجھ سکتا تھا۔

بعض سلطنتوں میں براہ راست پجاری خدا (یا دیوتاؤں) کی قائمقامی کرکے حکومت کرتے تھے۔ بعض میں ایک بادشاہ ہوتا تھا جو پجاریوں یا کاہنوں کی مجلس کے زیر اثر ہوتا تھا (ہندوستان) اور بغیر اُن کی اجازت کے کوئی حکم نہیں دے سکتا تھا نہ قانون بنا سکتا تھا۔ اس قسم کی سلطنتوں کے اقسام مندرجہ ذیل تھیا

---

[۱] ملاحظہ کیجئے باب مقالہ اول وحشی اقوام کا مذہب

میرو حبشیوں کی خالص مذہبی حکومت میرو میں قائم تھی۔ اسمیں کاہنوں یا پجاریوں کی جماعت کو اختیار اعلیٰ حاصل تھا یہ اپنی جماعت سے چند اشخاص کو نامزد کر دیتے تھے اور ایک نہایت سنجیدہ اور موثر دعا کے بعد اُنہیں سے ایک شخص کو خدا پسند کر لیتا تھا۔ اور عوام الناس اسکو خدا کا جانشین یا نمائندہ سمجھکر اُسکی اطاعت اور تعظیم کرتے تھے لیکن اس سردار کی قوت قوانین الٰہیہ سے نہایت محدود ہو جاتی تھی۔ اور یہ قوانین خدا کی طرف سے پجاریوں اور کاہنوں پر نازل ہوتے تھے جنکو وہ عوام کے سامنے پیش کرتے تھے پجاریوں کے سردار کو (جو بادشاہ سمجھا جاتا تھا) کسی رائے کے قائم کرنے یا اپنی مرضی سے کوئی حکم جاری کرنیکا اختیار نہ تھا۔ ہر جگہ پجاری اُسکے گرد و پیش رہتے تھے۔ اور بادشاہ کو خدائی احکام کے مطابق مشورہ دیتے رہتے تھے۔ بادشاہ کو اپنی زندگی پر بھی کوئی اختیار نہ تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پجاریوں کے ذریعے سے خدا کی ناراضگی ظاہر ہوتی تھی۔ اور اُس وقت بادشاہ کو خدا کی ناراضگی دور کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا تھا۔

مصر مصر میں کاہنوں کی مخلوط سلطنت پائی جاتی تھی۔ روایات قدیمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پہلے یہ خیال تھا کہ خدا براہ راست حکومت کرتا ہے چند صدیوں کے بعد خدا کے جانشین بادشاہ ہونے لگے لیکن یا تو وہ دیوتا یا دیوتاؤں کی اولاد سمجھے جاتے تھے۔ اور اُن کی قوت خدائی قانون سخت رسوم اور مذہبی یا پجاریوں کی ذات کے زیر اثر ہوکر نہایت محدود ہو جاتی تھی حتیٰ کہ انکی خوراک

بھی ہمیشہ کے لئے خدا کی طرف سے مقرر ہو جاتی تھی اور وہ اپنی پسند سے کوئی چیز نہ کھا سکتے تھے مگر پجاریوں کو یہ اختیار نہ تھا کہ اُنکی زندگی میں اُن سے بازپرس کر سکیں مرنیکے بعد البتہ اُن کی زندگی پر فیصلہ صادر کیا جاتا تھا جس پر اُنکی عزت کا دارومدار ہوتا تھا اور اسی فیصلہ پر اُنکی نجات کا انحصار تھا۔ مصریوں کو زندگی بعد الموت کا اتنا یقین تھا کہ وہ مردہ لاش کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھتے تھے اور ہر طرح سے اُسکو مزین کرتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پجاریوں کا فیصلہ بعد الموت ہر حکمران کو نہایت ہی امید و بیم کی حالت میں رکھتا تھا اور اسی پر پجاریوں کی دولت و اقتدار کی بنا تھی۔

ھندوستان | قدیم ہندوستانی سلطنتیں مصری سلطنتوں کے مشابہ تھیں ذات کے اعتبار سے بادشاہوں کا درجہ برہمنوں سے کم تھا۔ اگر کوئی برہمن اپنی لڑکی کی شادی کسی راجہ سے کرتا تو وہ اور اُسکی لڑکی دونوں یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا رتبہ کم ہو گیا تاہم بادشاہی عزت و وقار اتنا کیا جاتا تھا کہ کسی نہ کسی دیوتا کو راجہ کا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ قوانین منو کے مطابق بادشاہ کا جسم پاک اور متبرک ہے۔ جو اُن عناصر سے مرکب ہے جنکا منبع دنیا کے آٹھ محافظ دیوتاؤں سے ہے جس طرح سورج آنکھوں اور دل کو اندھا کر دیتا ہے اور کوئی شخص اُس پر نگاہ نہیں قائم کر سکتا۔ چونکہ خدا نے اُس کو کل مخلوقات کی حفاظت کے لئے پیدا کیا ہے، اسی طرح راجہ سے کسی شخص کو نہ چاہئے کہ اُسکے بچپن میں بھی اُسے نظر حقارت سے دیکھکر یہ کہے کہ وہ ایک فانی انسان ہے چونکہ اُس میں ایک زبردست خدائی قوت رہتی ہے۔

ہندوستانی راجہ کے پاس اکثر پجاری رہتے تھے۔ اور راج مذہبی پرچار کی رسوم برہمن ہی ادا کرتے تھے۔ برہمن ہی زیادہ تر مشیر و وزیر ہوتے تھے اور بغیر انکی رائے اور مشورہ کے راجہ کوئی نیا کام نہیں کرسکتا تھا وہ سخت رسوم کا پابند رہتا تھا اور اگرچہ منو نے صراحت کے ساتھ اصول حکومت نہیں بتائے تھے تاہم یہ صاف صاف بتایا تھا کہ "بیوقوف راجہ جو اپنی رعایا پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ وہ بہت جلد نہ صرف اپنا راج بلکہ اپنی اور اپنے پورے خاندان کی جان ضائع کردیگا"

ہندوستانی سلطنتوں کا ماخذ آریہ نسل سے تھا۔ اور اسی وجہ سے یہ نسبت میرو اور مصری سلطنتوں کے زیادہ آزاد تھیں۔ اور بادشاہی شان و شوکت ان سلطنتوں میں زیادہ ترقی یافتہ تھی لیکن ذات پات کی سختیاں قومی ترقی کی مانع تھیں اور برہمنوں کے ہاتھ میں زیادہ طاقت تھی۔ مصر میں اس مذہبی گروہ کا ایک ثلث زمین پر قبضہ تھا اور ہندوستانی قانون کے مطابق ہر راجہ پر فرض تھا کہ اگرچہ وہ خود تنگدستی سے مر رہا ہو پھر بھی نہ تو کسی برہمن پر ٹیکس عائد کرسکتا تھا۔ اور نہ اسکو فاقے سے مرنے دے سکتا تھا۔ البتہ نیچ ذاتیں نہایت خراب حالت میں رہتی تھیں اور انکو اپنی حالت درست کرنیکا کوئی موقع نہ تو ملتا تھا نہ دیا جاتا تھا برخلاف اسکے مصری دہقان تقریباً غلاموں کی مانند تھے اور وہ بادشاہوں اور فوجی سرداروں اور پجاریوں کی زمینوں کو جوتتے تھے اور زراعت کرتے تھے۔ مگر دستکار اور حرفت پیشہ اس امر پر مجبور تھے کہ اپنے آبائی پیشہ انجام دیتے رہیں

ان لوگوں کا کوئی حصہ سیاسی امور میں نہ تھا اور ان ممالک میں جبر سے مزدوری (بیگار) عام طور سے رائج تھی۔

سیکڑوں برس سے یہ الٰہی سلطنتیں اور طرزِ حکومت شرق میں رائج ہے لیکن اب بادشاہوں کی دنیاوی قوت زیادہ بڑھ گئی ہے اور مذہبی طبقہ کا قدیم اثر باقی نہیں رہا۔ سب سے پہلے یہ خیال تھا کہ خدا خود براہ راست حکومت کرتا ہے اور حکام (پجاری) اُسکے قائم مقام یا وکیل سمجھے جاتے تھے۔ اسکے بعد یہ حکومت خدا سے منتقل ہوکر مذہبی جماعت کے ہاتھوں میں آگئی جس میں یا تو کوئی پجاری یا آخر زمانہ میں جنگجو سردار حکومت کرتا تھا اور سب سے آخیر میں بادشاہ خود دیوتا کی مانند سمجھا جانے لگا اور مافوق الانسانی حکومت شخصی کی بنیاد پڑی۔ ایسی حکومت ایران۔ ہندوستان اور چین میں رائج تھی بعض مسلمان بادشاہ مثل اکبر بھی اسی طرح دیوتا سمجھے جاتے تھے۔

ایران حضرت مسیح سے ایک ہزار برس پہلے ایران میں ایک شخص زردشت نامی ظاہر ہوا اور اُس نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا اور ہر قسم کے احکام خواہ مذہبی ہوں یا دنیاوی جاری کرنے شروع کئے۔ اسکا مذہب عام طور سے ایران میں رائج ہوگیا۔ ژنداوستا قدیم ایرانی زبان میں اُنکی مذہبی کتاب ہے۔ اس میں ہندوستان کے خلاف بادشاہوں کو فوجی طبقہ میں نہیں رکھا بلکہ مذہبی پجاریوں کی خدمات اُنکے سپرد ہوگئیں۔ یہاں سیاسی تنظیم پورے طور

مذہبی احکام کی پابندی میں تھا۔ اور قانون و اخلاق میں کوئی فرق نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بادشاہوں کی حیثیت تبدیل ہوگئی اور مذہبی طبقہ کے علاوہ اور جماعتوں سے بھی بادشاہ ہونے لگے۔ اسوقت ایران کی مذہبی سلطنت مطلق العنان شخصی حکومت کی صورت میں تبدیل ہوگئی اور پجاریوں اور کاہنوں کی طاقت بہت زیادہ گھٹ گئی۔ شاہی دربار یزدانی دربار کی نقل سمجھا جاتا تھا اور بادشاہ کی عزت ہرمزد کی عبادت کی طرح کیجاتی تھی عوام الناس بادشاہ کو سجدے کرتے تھے اور اُس کے سامنے نذرانے اور قربانیاں (جو صرف خدا کے لئے مخصوص ہیں) پیش کرتے تھے۔ یہ رسوم ساتویں صدی عیسوی تک ایران میں جاری رہیں اور اسی اثر سے ردی بادشاہ بھی انکی نقل کرنے لگے تھے مگر اسلام نے ان سب مشرکانہ رسوم کو مٹا دیا۔

بہرحال یہ مطلق العنان شخصی حکومت مذہبی حکومت سے اس لحاظ سے بہتر تھی کہ جو احکام نافذ کئے جاتے تھے وہ کسی بیرونی طاقت یا توہمات و نجوم وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہوتے تھے بلکہ انسانی عقل کو (خواہ وہ قطعی خودغرضی کی حالت میں استعمال میں لائی گئی ہو) استعمال کرنے اور حکومت کی بنیاد انسانی قوت ارادی پر رکھنے کا باعث ہوتی تھی۔ اس طرح انسانی ضروریات کے مطابق سیاسی حالات تبدیل ہونے لگے اور مذہبی احکام جو مشکل سے تبدیل ہوسکتے تھے صرف مذہب کے لئے محدود کردئے گئے ایران نے اسی وجہ سے نہایت قدیم زمانہ میں ذات پات کی بندشوں سے نجات حاصل کرلی۔

یہودی سلطنت | حضرت موسیٰ کی شریعت کے مطابق یہودی خدا کی وحدانیت کے قائل تھے اور انکی حکومت بھی خالص مذہبی حکومت تھی۔ یہودی خدا کو بادشاہ سمجھتے تھے جسکا نام یہوا یا یہوواہ ہے وہ فانی مگر برگزیدہ بندوں کا غیر فانی بادشاہ تھا۔ موسوی قانون درحقیقت خدا کی وحی سمجھی جاتی تھی جو اس نے کوہ سینائی اور کوہ طور پر حضرت موسیٰ پر وقتاً فوقتاً ظاہر کیا۔ الٰہی قانون کی پابندی اور اس خدائی حکومت نے بنی اسرائیل کو اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا۔ اس سے قبل ملک مصر میں انکی حالت نہایت ذلیل تھی مگر اب وہ اپنے آپکو خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے سمجھنے لگے اور انکے مختلف قبائل نے (جو حضرت ابراہیمؑ حضرت یعقوب اور حضرت اسحٰقؑ کی اولاد میں سے تھے) ایک برادری قائم کر دی۔

ملک میں انصاف یہوا کے نام سے کیا جاتا تھا اور خدائی قانون کے سامنے امیر غریب یکساں درجہ رکھتے تھے۔ ملک یہوا کا تھا اور مختلف قبائل اسکا استعمال مثل اسامیوں کے کرتے تھے اور [illegible] کا دسواں حصہ مذہبی خرچ کے لئے معبدوں میں جمع کرتے تھے۔ ہر ساتواں برس زمین کے آرام کا ہوتا تھا اور زراعت نہیں کیجاتی تھی جس طرح ساتواں دن آرام کا ہوتا ہے۔ اسی طرح سات گنا سات (یعنی ۴۹) برس کے بعد عام مسرت کا سال (جبلی یا یوبلی) ہوتا تھا جس میں زمین نئے سرے سے تقسیم کیجاتی تھی اور جو لوگ زیادہ مالدار ہو جاتے تھے انہیں زمین سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ کوئی غلام نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اگر اپنے نفس کو فروخت کر دیتا تھا تو محض ملازم کی حیثیت

رکھتا تھا اور سرت کے سال میں آزاد کر دیا جاتا تھا۔ یہودیوں میں غلام ہمیشہ اجنبی شخص ہوتا
بہر حال آخر کار یہ مذہبی حکومت شاہی حکومت میں تبدیل ہو گئی لیکن یہ حکومت بھی
سے مذہبی طبقے کے اثر میں تھی

تبت | اسی طرح تبت میں بودہ مذہب کی بدولت ایک خالص مذہبی سلطنت قائم ہوئی۔ اسمیں مذہبی گرو (دلائی لاما) حاکم ہوتا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں چند عیسائی پادری اس ملک میں گئے اور انہیں معلوم ہوا کہ پوپ کی مذہبی حکومت اور رسوم کی طرح لاما گردبھی لمبی ٹوپیاں پہنتے اور خوشبوئیں جلا کر دیویں اڑاتے ہیں اور دلائی لاما سفید پوشاک زیب تن کئے ہوئے ہے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ رومی عیسائیوں کی بہت سی رسمیں مشرق ہی سے ماخوذ ہیں۔

چین | چینی اپنے مذہبی خیال میں بہت پکے ہوتے ہیں۔ ان میں مادہ تحقیقات وتنقید موجود ہے مگر تجارتی زندگی میں یہ لوگ اتنے محو ہیں کہ تخیلات میں بلند پروازی بہت کم ہو گئی ہے تاہم توہمات کی مضبوط رسی میں پوری قوم جکڑی ہوئی ہے۔ لاکھوں آدمی اپنے آپکو ایک ہی خاندان کے افراد خیال کرتے ہیں اور اپنے بادشاہ کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔

مسلمان | مسلمانی سلطنتیں ہر ملک میں نئے رنگ میں نظر آتی ہیں۔ مگر ہر سلطنت میں مذہبی رنگ غالب اور رہ چکا ہے۔ ابتدائی زمانہ اسلام میں خلافت کی بنیاد بالکل مذہب پر تھی اور وہ حقیقی مذہبی حکومت کہی جا سکتی ہے مگر خلافت راشدہ

کے زمانہ کے بعد سوائے چند خلفا کی حکومت کے جنکا زمانہ حکومت ایک دوسرے سے قریب نہ تھا یہ حکومت مذہبی نہیں ہی اگرچہ عام طور پر اکثر اسلامی سلطنتوں میں مذہب کے زیر اثر حکومت کیجاتی تھی مسلمانوں کا کبھی یہ اعتقاد (مثل یہودیوں کے) نہیں رہا کہ خدا براہ راست اپنے بندوں پر حکومت کرتا ہے۔ نہ اُس کی قوت میں اُس کے پیغمبروں کو شریک کیا جاتا تھا مسئلہ جبر و قدر کی وجہ سے اگرچہ فرقہ بندی ہوگئی تھی اور نہایت گرما گرمی سے مباحثے ہوتے تھے مگر اس خیال سے کسیکو انکار نہ تھا کہ انسان مجبور محض نہیں ہے مسلمانوں کو دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی آزادی اسوقت حاصل تھی جبتک کہ اُنکے افعال اخلاق و مذہب کے خلاف نہوں مسلمانوں کی مذہبی حکومت نمونہ کی حکومت تھی یعنی یہ حکومت مذہبی جمہوریت تھی۔ اور انتخاب عام سے سردار قوم چنا جاتا تھا اس قسم کی جمہوریت کی ابتدا رسول عربی کی وفات کے بعد ہی شروع ہوگئی۔ جسے خلافت کہتے ہیں

خلافت خلافت رسول عربی کی نیابت و جانشینی کا نام ہے اور یہ جانشین کل دنیائے اسلام کا سیاسی۔ مذہبی اور کل دینی و دنیاوی تعلقات کا مرکز سمجھا جاتا ہے قیام و بقائے خلافت کے لئے رسول عربی نے اپنی زندگی میں احکام نافذ کر دئے تھے۔ اور فرمایا تھا کہ خلافت کا قائم رہنا اور ہر مسلمان کو خلافت سے تعلق واثق رکھنا اتنا ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی خلیفہ کی بیعت یا اطاعت کئے ہوئے مر جائیگا تو وہ ایسا ہے کہ گویا جاہلیت کی موت مرا۔ یعنی اُسے کفر کی موت نصیب ہوئی۔ اسی طرح

دوبارہ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی مسلمان نے ایک رات بھی ایسی بسر کی جس میں وہ کسی خلیفہ کے ماتحت نہ تھا تو اُس نے وہ رات معصیت و نافرمانی میں بسر کی۔

ابتدا میں خلفا کا تقرر بذریعہ انتخاب ہوتا تھا اور خلیفہ کو کتاب اللہ سنت رسول اور سنت خلفاء کے مطابق حکومت کرنی پڑتی تھی۔ مگر زمانہ کے تغیرات نے جمہوریہ اسلام کو شاہی سلطنت میں تبدیل کر دیا۔ یہ شاہی سلطنتیں امرا اور علما کے اثر سے محدود رہتی تھیں اور بہت کم مطلق العنانی کی صورت اختیار کر سکیں۔ اور عموماً کوئی حکم اسلامی قانون کے خلاف رائج نہیں کیا جاتا تھا

خلافت کی خصوصیات

(۱) خلیفہ رسول عربی کا نائب سمجھا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کا دینی اور دنیاوی پیشوا سمجھا جاتا ہے اور اسکی اطاعت ہر مسلمان پر لازم ہے۔

(۲) خلافت ناقابل تقسیم ہوتی ہے یعنی ایک وقت میں دو خلیفہ نہیں ہو سکتے

(۳) خلیفہ کے لئے شرع اسلامی کے مطابق عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

(۴) چونکہ مختلف اسلامی سلطنتوں کا مرکز وحید خلیفہ رسول ہی ہوتا ہے لہذا اسلامی نقطۂ نظر سے اگر کوئی بادشاہ خلیفۂ وقت کی نافرمانی کرے یا اُس کی ماتحتی سے آزاد ہو جائے تو اُسکی حکومت ناجائز ہو جائیگی اسی بنا پر ہندوستان۔ افغانستان اور دیگر ممالک اسلامی کے بادشاہ خلیفہ وقت سے اجازت حکومت حاصل کرتے تھے اور خلیفہ ہی کے نام سے حکومت کرتے تھے۔ اکثر بادشاہوں کے

سکوں پر خلیفہ وقت کا نام بھی کندہ ہوتا تھا اور کل ممالک اسلام میں اُسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا

(۵) خلیفہ کے لئے خادم حرمین الشریفین ہونا ضروری تھا۔

اتحاد اسلامی خلیفہ کو کل دنیا کا مرکز وحید بنا دینے سے شارع اسلام کا یہ مقصد تھا کہ نہ صرف مسلمان بلکہ کل دنیا کے انسان ملک و نسل۔ قوم و رنگ کی تفریق کو بھولکر باہمی اختلافات کو چھوڑ دیں اور دنیا آزاد انسانوں کا متحدہ گھر بنجائے خداوند قرآن میں فرماتا ہے کہ "دنیا میں مرد عورت۔ نسل اور قبیلہ صرف ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے بنائے گئے ہیں ورنہ امتیاز تو اسی کو ہے جو پاکبازی زندگی بسر کرتا ہے" اسی وجہ سے مسلمانوں کا عالمگیر اتحاد محض اس وجہ سے نہیں کہ سید جلال الدین افغان مرحوم یا دیگر سیاسی چالبازوں کی چالاکی (بقول مدبران فرنگ) سے دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے بلکہ خدا کے حکم کے مطابق کہ "بیشک تمہاری ملت ایک ہی ملت ہے اور ہم ہی تمہارے پروردگار ہیں" ہر مسلمان کا فرض ہے کہ عالمگیر اتحاد اسلامی میں کوشش کرے اور کل مسلمانوں کا مرکز اتحاد خلیفۂ وقت ہو۔ اسی طرح قرآن کریم میں دوبارہ ارشاد ہوتا ہے کہ "دین الہٰی کی رسی کو سب ملکر پکڑلو۔ اور متفرق نہو"

اسی سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے چند فقرے درج کر دینا نہایت ضروری ہے کہتے ہیں "ہم میں سچا پان اسلامزم بالفاظ دیگر رشتۂ اخوت دینی باقی

سلہ خلافت اور ہندوستان از سید سلیمان ندوی صاحب ملاحظہ کیجئے ۱۲

نہیں رہا...... اس کا افسوس ہے...... تمام دنیا کے مسلمانوں سے ہمارا صرف ایک ہی رشتہ ہے یعنی دینی اخوت اور پان اسلامزم کا۔ مگر ترکوں سے ہمارے دو رشتے ہیں پہلا اخوت دینی کا کہ وہ بھی مسلمان ہیں اس لئے خدا نے ہمکو ہمیشہ کے لئے اُن کے رنج و راحت کا شریک بنا دیا ہے۔ دوسرا اس سے بھی قوی تر رشتہ قرابت دینی اور اسلام کے آخری سیاسی مرکز ہونیکا کہ آج کلمۂ اسلام کی حفاظت کی آخری تلوار صرف اُنکے ہاتھ میں ہے اگر کسی اور حصے سے اسلام کی حکومت مٹتی ہے تو ہم روتے ہیں کہ ہمارا ایک عضو کٹ گیا لیکن ترکوں پر جب کوئی آفت لائی جاتی ہے تو تڑپ جاتے ہیں کہ ہمارا دل دو نیم ہو گیا ہم جب ترکوں کے لئے مضطرب ہوتے ہیں تو ہمارا اضطراب مسلمانوں کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اسلام کے لئے ہوتا ہے،،

موجودہ زمانہ میں احیائے اتحاد اسلامی کی دنیائے اسلام میں کوشش بلیغ کی جارہی ہے لیکن یہ کوششیں براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہیں اگر بجائے سنہ ہلکی جمعیت خلافت، انجمن اتحاد ترقی وغیرہ کے جمعیت اتحاد اسلامی ہر دیار و امصار میں قائم ہوئے ہوتا تو زیادہ مناسب ہوا اور اتحاد اسلامی میں کافی ترقی ہو جاتی جو خلافت کا اصلی اصول ہے۔

مذہبی حکومتاں کی خصوصیات

عموماً مذہبی سلطنتوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہوتی ہیں

(۱) مذہب اور قانون عموماً مخلوط ہوتا ہے اور مذہبی عنصر غالب ہوتا ہے اور حیات بعد ممات کا خیال واقعی اتنا غالب ہوتا ہے کہ

(۲) بعض اوقات عیسائی حکومتوں کی طرح مذہب کی آڑ میں عوام کو دنیاوی ترقی کا

ہو تو نہیں سکتا اور تحقیقات سائنس و قانون کی ترقی محدود ہو جاتی ہے۔

(ب) اور بعض آزاد خیال مذاہب (مثلاً اسلام) مذہبی جمہوریتوں کے قیام کا باعث ہوتے ہیں اور دنیاوی ترقی کو دینی ترقی کا ایک جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔

(۲) علاوہ اسلامی سلطنتوں (جس میں شرک کی قطعی گنجائش نہیں) مذہبی حاکم کی طاقت کو مافوق الانسان اہمیت دیجاتی ہے۔ اور تمام سیاسی اور اجتماعی زندگی کا اسی پر انحصار ہوتا ہے۔ اور رعایا کا حاکم میں انسانی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے قومی اتحاد اور وطن پرستی نہیں پیدا ہوتی۔ اور حاکم کی شان نہایت ارفع اور اعلیٰ سمجھی جاتی ہے حتیٰ کہ اُسے خدا کا نائب یا دیوتا سمجھنا شروع کیا جاتا ہے

(۳) ایسی حکومتوں میں جو وقتی ضروریات کے لحاظ سے تبدیل قوانین نہیں کرسکتیں اور مثل یہودیوں کے ایک آسمانی کتاب (توریت) پر عمل ہوتا ہے قانون کی ترقی ناممکن ہو جاتی ہے اور سلطنت ایک خاص درجے سے آگے ترقی نہیں کرسکتی بخلاف اسکے مسلمان اگرچہ آسمانی کتاب (قرآن) پر عمل پیرا ہوتے ہیں مگر اُنکو اس امر کا اختیار ہے کہ اگر امت کثیر تعداد میں کسی مسئلہ پر (جو اخلاقیات و مذہب کے خلاف نہو) اجماع کرے تو نیا مسلک اختیار کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی اور نظام عمل زمانہ کے لحاظ سے تبدیل ہوسکتا ہے

(۴) تعزیری سزائیں نہایت سخت ہوتی ہیں اور عموماً معمولی جرائم بھی خدائی قانون کی خلاف ورزی ہونے کی وجہ سے سخت سزاؤں سے روکے جاتے ہیں۔

(۵) عموماً تعلیم مذہبی پیشواؤں اور پجاریوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور علوم و فنون کو اسی حد تک ترقی دیجاتی ہے جہانتک کہ اُن کا فائدہ مدِنظر ہوتا ہے اُن کی قدر و عزت اس وجہ سے نہیں کیجاتی کہ انسانی دماغ کے ماحصل ہیں۔ بلکہ مذہب کی خدمت کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔

مقالہ سوم حکومت شاہی

دنیا میں زیادہ تر ایسی سلطنتیں ہیں جو شاہی حکومت کے ماتحت ہیں ابتدائے عالم سے اس وقت تک اسی قسم کی سلطنتیں موجود رہی ہیں لیکن شاہی حکومتوں کی اقسام اتنی جداگانہ ہیں اور انکی اشکال اتنی مختلف ہیں کہ ان کی باقاعدہ تقسیم اور خاص قسموں کی تنظیم نہایت دشوار ہے

مطلق العنان شخصی حکومت ایشیا میں مطلق العنان شخصی حکومتوں کا زور تھا۔ مذہبی حکومت جب شاہی حکومت میں تبدیل ہوتی ہے تو اکثر حکومت مطلق العنان قائم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی حکومت میں عموماً بادشاہ کا درجہ مافوق الانسان سمجھا جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے اختیارات کو مطلق العنانی کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مطلق العنان حکومت شخصی کی شناخت یہ ہے کہ کل حقوق اور طاقت کا مرکز بادشاہ بنجاتا ہے اور کسی شخص کو بادشاہ کے خلاف نہ تو کوئی حق اور نہ آزادی عمل کا اختیار ہوتا ہے۔ بادشاہ بذات خود مذہبی یا اخلاقی فرائض اور حدود کو مانکر انکا رعایت کر سکتا ہے لیکن اس کی قوت میں دخل دینے یا اُسے محدود کرنیکا حق رعایا کو نہیں ہوتا رعایا مثل غلاموں کے سمجھی جاتی ہے اور اُن کی جان و مال کا مالک صرف بادشاہ ہوتا ہے

ایسی مطلق العنان حکومتیں عموماً اپنی قوت کا جواز خدا کی طرف منسوب کرتی ہیں اور بادشاہ کو عوام الناس ظل اللہ یا دیوتا وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس

قسم کی حکومتیں زیادہ تر مذہبی حکومتوں سے مشابہ ہوتی ہیں اور اس میں وہی خرابیاں پائی جاتی ہیں جو عموماً مذہبی حکومتوں میں ہوتی ہیں۔ چنگیز خاں۔ نادرشاہ وغیرہ کی حکومتیں ایسی ہی تھیں۔

۳۔ مہذب سلطنت شاہی | شخصی حکومت عموماً غیر مہذب شاہی حکومتوں کو کہتے ہیں۔ وہ اقوام جو آریہ نسل سے ہیں۔ اس قسم کی حکومت کو نہایت قدیم زمانہ سے ناپسند کرتی ہیں۔ اور بادشاہوں و شاہزادوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ مختلف جماعتوں اور افراد کے حقوق کو بھی مانتی ہیں اور رعایا کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتیں کہ مثل غلاموں کے سمجھیں بلکہ انکو آزاد سمجھا جاتا ہے۔ اور جب کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ شاہی حکومت کا طرز عمل بدلکر شخصی حکومت کی طرف رجوع ہوا تو رعایا نے اس کو ناانصافی اور ظلم سمجھکر جہانتک جلد ممکن ہوسکا بادشاہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اُن کے حقوق کی عزت کرے۔ لہذا مہذب سلطنت شاہی بہ نسبت شخصی حکومت کے بہت زیادہ محدود ہوتی ہے اور رعایا کے مجموعی جذبات سے مؤثر ہوکر مطلق العنانی سے باز رہتی ہے۔ اس قسم کی حکومت میں بادشاہ کا درجہ زیادہ بلند ہوجاتا ہے۔ چونکہ بہ نسبت غلاموں اور بے وقوفوں کی حکومت کے آزاد اور عقلمند انسانوں کی حکومت زیادہ معزز اور قابل تعریف ہے کسی قوم کے افراد جتنے زیادہ آزاد ہوکر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو اتحاد عمل کے ساتھ کام میں لائیں اتنا ہی اسکا نظام زیادہ مکمل اور زیادہ نطرتی ہے۔ مہذب سلطنت شاہی میں اس قسم کی آزادانہ ترقی ممکن ہے جیسا کہ

ہندوستان کی شاہی سلطنتوں میں رعایا کو آزادیٔ عمل حاصل تھی لیکن یہ ترقی شخصی حکومتوں میں اکثر ناپید ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ افراد قوم بادشاہ کے اصولوں سے اسوقت تک متحد نہیں ہوتے جب تک کہ وہ آزاد نہوں اور جب اتحاد عمل نہیں ہوتا تو ترقی کا مسدود ہو جانا ضروری ہے

ازمنہ مختلفہ میں انسانی دماغ نے اکثر یہ کوشش کی ہے کہ مختلف اقوام میں شاہی حکومت کی۔ اُن حدود کو دریافت کرے جو اسپر عاید ہونی ضروری ہیں

پدری بادشاہی

ان میں سے ایک نہایت ہی قدیم طرز سلطنت۔ پدری بادشاہی ہے۔ بادشاہ (یا رئیس) خاص خاندان کا سردار مانا جاتا ہے۔ اور وہ نسل کا بزرگ یا باپ سمجھا جاتا ہے۔ یہ طرز حکومت جو ہندوستان قدیم اور جرمن قبیلہ کوننگ میں پایا جاتا تھا اور اُن تعلقات اور رسوم کے زیر عمل قائم رہتا تھا جو کسی ایک خاندان کے قیام کے لئے ضروری ہیں اسی طرح ذاتی مال اور ذاتی سلامتی و حفاظت کے متعلق ازمنہ وسطی میں وہ بادشاہت تھی جو یا تو مقاطعجی صورت میں ہوتی تھی یا نوابی و تعلقہ داری کی صورت میں۔ اس طرز حکومت میں خاندانی حقوق اور نسلی خیالات کا اثر مثل مندرجہ بالا طرز حکومت (یعنی پدری بادشاہی) کے غالب ہوتا ہے لیکن اسمیں نئی بات یہ ہوتی ہے کہ سلطنت (یا بادشاہ) کا قبضہ زمین اور مال پر بھی ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا دو اقسام حکومت ایسے ہیں کہ اُن میں سیاسی حس کا نشوونما پورے طور پر نہیں ہوا۔ اور انکو بادشاہی حکومت کے غیر مکمل درجوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

۲- فوجی حکومت شاہی حکومت شاہی متعلق بہ قضاءت

حکومت شاہی میں جب سیاسی بیداری درجہ کمال تک پہنچی اور حکومت کے صرف ایک شعبہ پر زیادہ توجہ دیجاتی ہے تو اس وقت یکطرفہ بادشاہی حکومت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس قسم کی سلطنتوں میں دو قسمیں قابل ذکر ہیں:۔

(الف) فوجی حکومت اس سلطنت میں فوجی یا جنگی قوت پہ زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اسی پر حکومت کی بنا ہوتی ہے۔ یہ حکومت زیادہ مطلق العنان اور زور دار ہوتی ہے۔ اسکی مثال کوروؤں اور پانڈوؤں کی حکومت ہندوستان قدیم میں تھی یا ایران قدیم میں اس قسم کی سلطنت قائم تھی جس میں جنگی عنصر غالب ہوتا تھا اور بادشاہ یا تو خود پہلوان ہوتا تھا یا فن سپہگری میں کامل ہونے کی وجہ سے سپاہیوں کا سردار مان لیا جاتا تھا۔

(ب) حکومت متعلق بہ قضاءت۔ ایسی حکومت میں قاضی یا منصف کی حکومت ہوتی ہے۔ یہ طرز حکومت زیادہ محدود اور پُر امن ہوتا ہے۔ یہ طرز حکومت حضرت موسیٰ کے بعد فلسطین میں قائم ہوا۔ اور تقریباً چار سو برس تک قائم رہا جس میں قاضی حکومت کرتے تھے۔ یہ حکومت کسی قدر مذہبی حکومت بھی ہوتی تھی۔

۳- مہذب مطلق العنان حکومت شاہی

جب بادشاہ میں سیاسی بیداری درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے اور مرکزی قوت اسکے ہاتھوں میں آجاتی ہے تو رعایا کے سیاسی حقوق باقی نہیں رہتے۔ غیر مہذب مطلق العنان حکومت شخصی کے مقابلہ

جس میں مہذب مطلق العنان حکومت ہوتی ہے۔ لیکن اسکا فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بادشاہ کے ماتحت محکمۂ قضاءت قائم ہوتا ہے اور وہ اس محکمہ کی عزت و وقعت کو برقرار رکھتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ حکومت زیادہ مطلق العنان تھی مگر موجودہ زمانہ میں یہ طرزِ حکومت زیادہ محدود ہوگئی ہے

۵۔ محدود حکومت شاہی

شاہی حکومت کی مختلف قسموں میں محدود حکومت زیادہ معزز اور بہتر ہوتی ہے۔ اس میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ مرکزی قوت کا اتحاد اور اُسکی بزرگی قائم رہتی ہے اور دوسرے یہ کہ قوم کے جملہ طبقات و جماعات و افراد کی آزادی مرکزی قوت سے وابستہ رہتی ہے گذشتہ زمانہ میں یہ حکومتِ امرا اور طبقات خصوصی کے حقوق کی وجہ سے محدود ہو جاتی تھی۔ موجودہ زمانہ میں اصول نمائندگی اور آئینی صورتوں نے اس حکومت کو محدود کر دیا ہے اس قسم کی مثال موجودہ زمانہ میں سلطنت برطانیہ اور جاپان وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔

۶۔ بادشاہی اور شہنشاہی

بادشاہی حکومتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں شہنشاہی حکومت کو دیکھنا ضروری ہے۔ بادشاہی حکومت کا تخیل ملتِ واحد سے متعلق ہے شہنشاہیت کا تعلق انسانیت سے ہے۔ بادشاہی حکومت صرف ایک ملی سلطنت کا اعلیٰ ترین نظام ہے شہنشاہیت تمام دنیا کا بہترین نمونۂ حکومت ہے جس طرح مختلف ملتوں کا درجہ انسانیت کے درجے سے کم ہے اسی طرح بادشاہت

کا درجہ شہنشاہیت سے کم ہے۔ شہنشاہ کا تخیل ہمیشہ ایشیائی اقوام میں یہی رہا ہے کہ وہ کئی بادشاہوں کا بادشاہ ہوتا ہے لیکن اس تخیل کی تکمیل اسوقت تک پورے طور سے نہیں ہوسکتی جبتک کہ دنیا نظام انسانیت کی درستگی میں عالمگیر ترقی نہ کرلے۔

موجودہ زمانہ میں شہنشاہیت نے اپنی بنیاد انسانیت پر رکھنے کے بجائے خود غرضی پر رکھی ہے۔ اور مرکزی حکومت یعنی شہنشاہی قوت کا اب صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ اُن ملکوں پر قبضہ کیا جائے جہاں سے اُنکو خام اشیاء مل سکیں اور جن کی صورت بدل کر وہ پھر اُن ہی ملکوں میں دس گنی اور بیس گنی قیمت پر فروخت کرسکیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے محکوم اقوام کو ایسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کیجاتی ہے اور ہر ظلم کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ جو زمانہ قدیم کی وحشی سے وحشی قوم بھی ہرگز جائز نہ رکھ سکتی۔ بہرحال ہم شہنشاہیت کے روشن وتاریک پہلوؤں پر آئندہ بحث کریں گے اس وقت صرف اتنا جان لینا کافی ہے۔ کہ شہنشاہیت کی بنیاد اگر انسانیت پر نہ ہو تو وہ نہایت ذلیل سبعیت و درندگی و خود غرضی کا نمونہ ہوگی۔

مقالہ چہارم۔ آئینی حکومت شاہی

(۱)

آئینی حکومت موجودہ زمانہ میں نشو و نما پاکر ایشیا و یورپ کے اکثر ممالک میں جہاں مقبول ہوئی ہے۔ حکومت مطلق العنان کا نام و نشان دنیا سے تقریباً مفقود ہوگیا ہے لیکن اس کی ابتدا آج سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اور زمانہ قدیم و زمانہ وسطیٰ میں بادشاہوں کی طاقت کبھی نہ کسی قوت سے محدود ہوتی تھی۔ اکثر اوقات نہایت ہی جابر و ظالم بادشاہ بھی اپنے ظلم کے خوف اور اسکے اثرات و انقلاب کے ڈر سے ایسی حکومت کرتا تھا جسمیں ایک فریق کثیر اُس کا ہمنوا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ حکومت الاشراف کی بنا پڑی اور بادشاہ کی طاقت امرا میں تقسیم ہوگئی۔ یا شاہی قوت و اقتدار امرا کے اثر سے محدود ہوگیا۔ ایسی صورت میں رعایا کی بہبودی کا خیال کم ہوگیا۔ اور سلطنت کی مصالحت دیگر بھی غائب ہوگئی۔ اسکے بعد دوبارہ ملی اتحاد کی روح پیدا ہوئی اور موجودہ جمہوری اور آئینی حکومتوں کا دور شروع ہوا۔

انگلستان میں آئینی حکومت کی ابتداء

آئینی حکومت کی ابتدا انگلستان سے ہوئی۔ یورپ کے کسی ملک میں بادشاہوں کو اتنی قوت حاصل نہ تھی جتنی انگلستان میں زمنہ وسطی میں تھی۔ مگر حق یہ ہے کہ امرا اور عوام کے حقوق کی نگہداشت بھی کسی ملک میں انگلستان سے زیادہ ہمت و مضبوطی سے نہیں کی گئی۔ تیرہویں صدی کے وسط میں امرا نے یہ کوشش کی کہ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں اسکا نتیجہ ہوا کہ دار العوام کی بنیاد پڑی اور قصبوں سے وکلا کا انتخاب شروع ہوا۔ دوسرا انقلاب ۱۶۸۸ء میں ہوا جس کی وجہ سے آئینی حکومت شاہی قائم ہوئی۔

آئینی حکومت کی خصوصیت

آئینی حکومت کل اقسام سلطنت کا مجموعہ ہے۔ یہ حکومت بڑے سے بڑے اختلاف کو قائم رکھتے ہوئے سلطنت کے اتحاد و یکرنگی کو قائم رکھتی ہے۔ اگرچہ امرا (اشراف) کو ایسی سلطنت میں اپنی قوتوں کے استعمال میں کامل آزادی ہوتی ہے۔ تاہم عوام کے جذبۂ حریت و جمہوریت پر کوئی دست اندازی نہیں کیجاتی۔ قانون کی اتنی وقعت و عزت کیجاتی ہے کہ گویا انسان نہیں بلکہ خدا براہ راست حکومت کر رہا ہے لیکن کل قومیں بادشاہ کے اثر میں رہکر اپنے اپنے جائز تعلقات کو قائم رکھتی ہیں۔ جو نظام سلطنت کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔

یورپ

یورپ کی آئینی سلطنتوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی بادشاہی حکومت ایک مضبوط امرا کی طاقت سے محدود ہے اور زیادہ تر پارلیمنٹ کی کثرت پر بادشاہ کو عمل کرنا پڑتا ہے لیکن روز بروز مزدوری پیشہ

جماعت کی قوت گھٹتی جاتی ہے اور غالباً جلد امراء کی قوت کا زوال ہو جائیگا۔ باقی یورپ میں (جسے عموماً بر اعظم کہتے ہیں) اتنی مضبوط اور معزز جماعت امراء نہیں ہے یہاں جمہوری عنصر زیادہ غالب ہے اور روز بروز ہوتا جاتا ہے۔ جنگ کے بعد سے آدھی حکومت اشتراکی اور مشرق قریب کے اثر سے کل سلطنتیں آئینی یا جمہوری ہوگئی ہیں اور ہر ایک سلطنت اپنے رقیب کو زیر کرنے کی فکر میں ہے۔ جذبہ ملی کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور نمائندگان و وکلائے قوم پر رائے عامہ کا اثر بڑھتا جاتا ہے۔ اشتراکی ریشہ دوانیاں نہ صرف ہر ملک میں جاری ہیں بلکہ اسکا اصل الاصول عملاً روسی حکومت نے جاری کر کے ایسی حکومت کا منطقی اور عقلی ہونا ثابت کر دیا ہے۔ اور اب جمہوریت سے بتدریج اشتراکیت کی طرف میلان شروع ہو گیا ہے۔ عوام کی طاقت کا اس سے بہتر اور ثبوت نہیں ہو سکتا۔

افریقہ افریقہ میں مراکش کے اعراب نے سخت کشمکش کے بعد ہسپانیوں سے گلو خلاصی کی ہے۔ اور جمہوری حکومت کا قیام کرنا چاہا ہے۔ باقی اور ممالک افریقہ یورپ کی شہنشاہیت پسند سلطنتوں کے ماتحت ہو کر ان کی تجارتی غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ مگر امید کیجاتی ہے کہ عرصہ دراز کے بعد جب نو آبادیوں میں سفید اقوام کے اثر سے جمہوریتوں کا قیام ہو تو شاید سیاہ باشندوں کو بھی کچھ آزادی مل جائے۔

ایشیا ایشیا میں ایک عام بیداری ہوگئی ہے اور صبح امید طلوع ہو چکی ہے۔

سوائے اُن ممالک کے جو یورپین اقوام کے زیر حکومت ہیں۔ ہر ملک میں یا تو آئینی حکومت قائم ہو گئی ہے یا جمہوریت کا علم بلند ہو چکا ہے۔ اور ترکوں اور اشتراکیوں کے نصب العین کے مطابق بہت جلد عالمگیر مغربی اثرات سے نجات ملنے والی ہے۔

امریکہ امریکہ میں ممالک متحدہ کی وجہ سے جمہوری حکومت بہت زیادہ مقبول ہو گئی ہے۔ اور ہر ملک میں اس قسم کی حکومت قائم ہونے کی وجہ سے انسانی ترقی میں کافی مدد مل رہی ہے مگر افسوس ہے تو یہ کہ سیاہ اور سرخ نسل کے اصلی باشندوں کو ابتک بہت کم حقوق آزادی دیئے گئے ہیں اور بعض ممالک میں اُن کو قطعی مٹا دیا گیا ہے۔

(۲)

حکومت آئینی کے متعلق غلط خیالات

غلطیاں تقریباً ہر مہذب سلطنت نے آئینی حکومت شاہی کو پسند کر لیا ہے اور حکومت مطلقہ یا کمزور اور غیر متحدہ سلطنتوں پر اس طرز حکومت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس وجہ سے اس نظام حکومت کے بنیادی اصولوں کو بیان کرنا نہایت ضروری ہے لیکن پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم کچھ غلطیوں اور مغالطوں سے جو اس مضمون سے متعلق ہیں بچ جائیں۔

۱۔ بادشاہ صرف قوتِ اجرائی رکھتا ہے انقلاب فرانس نے روسو کے اس تخیل کو نمایاں کر دیا کہ سلطنت میں دو قوتیں ہوتی ہیں (۱) قوتِ

ارادی یا قانون سازی کی قوت اور (۲) جسمانی قوت یا قوتِ اجرائی تھیں اسمیں آئینی حکومت کا اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ رعایا ارادہ کرتی ہے اور بادشاہ اس ارادہ کا اجرا کرتا ہے۔ اسی خیال نے رعایا کو بادشاہ کے خلاف کھڑا کر دیا اور بادشاہی حکومت کو قطعی رعایا کی خواہش کے تابع فرمان بنا دیا۔ بخلاف اسکے اگر بادشاہی قانون سازی کی قوت کو رعایا کی قوت ارادی کے برابر درجہ یا جائے تو ایسی صورت میں ایک حکومت دو گونہ قائم ہو جاتی ہے۔ جو سلطنت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور یا تو صرف سلطنت شاہی قائم رہ سکتی ہے یا جمہوریت باقی رہجاتی ہے

۲۔ بادشاہ مجہول محض ہے — اس خرابی کو دور کرنیکے لئے سائنس نے ایک نئی تجویز پیش کی کہ آئینی نظام کی بنیاد اس پر رکھی جائے کہ بادشاہ مجہول محض سمجھا جائے۔ نپولین نے جو پیدائشی بادشاہ تھا اس اصول کو نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا اور کہا کہ ایک معزز اور عقلمند انسان کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ ایک ناپاک جانور کی طرح بیس لاکھ آدمیوں کی دولت پر پرورش پائے۔

۳۔ شاہی قوت کا استعمال وزرا کے ہاتھ میں ہے — ایک اور عام اصول یہ بتایا جاتا ہے کہ بادشاہ حکومت کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن اس طاقت کا استعمال وزرائے سلطنت کے ہاتھ میں ہے۔ بعض ممالک میں یہ تعلق قائم رہ چکا ہے اور ابتک ہے لیکن اگر یہ اصول مستقل طور سے مانا گیا تو ایک زمانہ وہ آئیگا کہ بادشاہ کو مستعفی ہونا پڑے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر وہ بادشاہ ہیں کا حق ہے کہ وہ

اپنی طاقت استعمال کرے اس سے مستقل طور سے محروم کر دیا جائے اور دوسرے لوگ اُس طاقت کو استعمال کریں تو یقیناً بادشاہ کی طاقت ان اشخاص کے ہاتھ میں بہت جلد چلی جائیگی جو اسکو استعمال کرتے ہیں جب حکومت کی اصلی قوت اس طرح منتقل ہو کر وزرا کے ہاتھ میں ایک دفعہ چلی جاتی ہے تو وہ بادشاہ صرف نام کا بادشاہ رہجاتا ہے۔

۴۔ بادشاہ کا ذاتی طرزِ عمل غیر ضروری نہیں ہے

لہٰذا یہ کہنا کہ آئینی حکومت میں بادشاہ کا ذاتی طرزِ عمل غیر ضروری ہے قطعی مہمل ہے اور یہ کہ اُس کی ہستی کا ہونا نہ ہونا اُس کا عقلمند ہونا یا کم عقل ہونا نیک طینت ہونا یا بدمعاش ہونا سلطنت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا مگر آئینی حکومتِ شاہی کا مقصد یہ ہے کہ بادشاہ جہانتک ممکن ہو کم مضرت رساں ہو اور زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکے انہیں معنوں میں اُس کی طاقت محدود سمجھی جاتی ہے نہ کہ وہ صرف وزرا کے ہاتھ میں مثل ایک کٹھ پتلی کے ہو۔ یہ نہایت بیہودگی ہے کہ سلطنت کے اعلیٰ حاکم کو سب سے کم سیاسی آزادی دیجائے۔ ایسے نام نہاد بادشاہ سے نہ تو لوگ محبت کر سکتے ہیں اور نہ اظہارِ وفاداری۔ اس اصول کے ماننے کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسا مخبوط الحواس بادشاہ تخت نشین ہو کر جس میں نہ تو عقل ہو اور نہ ذاتی قوتِ ارادی پائی جاسکے۔ کیا اس قسم کی سلطنت زندہ ملتوں کی خواہشات کو پورا کر سکتی ہے؟

۵- بادشاہ سلطنت کرتا ہے مگر حکومت نہیں کرتا

یہ ایک مشہور کلیہ ہے کہ بادشاہ سلطنت کرتا ہے مگر حکومت نہیں کرتا۔ آئینی حکومت کے لئے بھی یہ کلیہ سراسر غلط ہے۔ لفظ "سلطنت" سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ بادشاہ عظمت اور شان کا حق رکھتا ہے اور لفظ "حکومت" سلطنت کی حکمت عملی کے عاملانہ شعبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دونوں حقوق سلطنت کے اعلیٰ حاکم کے لئے مخصوص ہیں اگر حق حکومت سے وہ محروم کر دیا جائے تو گویا وہ ایک بت بیجان ہے۔

۶- بادشاہ کو جمہور کی رائے پر عمل کرنا چاہئے

دوسرے لوگوں نے رعایا کے حقوق کا لحاظ رکھتے ہوئے اس اصول کو مانا ہے کہ آئینی حکومت میں بادشاہ کو رعایا کی کثرت رائے کا لحاظ رکھکر حکومت کرنا ضروری ہے۔

ایسی حکومت جسمیں رعایا کی کثرت رائے پر حکومت ہو جمہوری حکومت کہتے ہیں ایسی صورت میں بادشاہ کا وہ حق چھن جاتا ہے جو شاہی حکومت کے لئے قابل فخر ہے کہ بادشاہ کا یہ حق اور فرض ہے کہ وہ قلیل التعداد جماعت کی حفاظت کثیر التعداد طبقے کے بیجا دست درازیوں سے کرے اگر بادشاہ اپنی رعایا کی کثرت رائے پر عمل کرنا شروع کر دے تو ایسی صورت میں بہت جلد وہ زمانہ بھی آسکتا ہے جب وہ اپنے حقوق سلطنت سے اُن کی رائے کی خلاف ورزی کرتے پر برطرف کر دیا جائے۔

(۳۷)

اصول شاہی کا آئینی حکومت شاہی سے تقابل

آئینی حکومت حقیقی حکومت ہونی چاہئے نہ یہ کہ صرف اس حکومت کا ایک خاکہ ہو۔

شاہی سلطنت کی خصوصیات

شاہی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ سلطنت کی عزت و شان کو فرد واحد میں جمع کردے مذہبی حکومت سے اسکا فرق یہ ہے کہ یہ حکومت کرنے کے حق کو بادشاہ کی طرف منسوب کرتی ہے بجائے اسکے کہ خدا کے کسی نمائندے کی طرف منسوب کرے۔ جمہوری حکومت سے اس کا یہ فرق ہے کہ اس میں رئیس الجمہوریہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے آپکو امراء یا عوام کا خادم یا نمائندہ سمجھے بخلاف اسکے بادشاہ ان قوتوں کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ ایک آزاد حاکم ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت میں سیاسی قوت کا اظہار مجموعی حیثیت سے ہوتا ہے اور بادشاہی حکومت میں انفرادی حیثیت سے بادشاہ گویا سلطنت کی روح سمجھا جاتا ہے اس تخیل میں دو پہلو ہیں جن کا بادشاہ میں ہونا ضروری ہے۔

(۱) سلطنت کے حاکم اعلیٰ کی ذاتی عظمت بحیثیت نمائندہ واحد اور قوت اعلیٰ کے استعمال کنندہ کے ہوتی ہے

(۷) سلطنت کی قوت اعلیٰ اور اعزاز کا بادشاہ میں مرکوز ہونا باضرور ی ہے مندرجہ بالا خصوصیات کی مفصل کیفیت حسب ذیل ہے۔

(۱) اول الذکر اُصول کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں بھی ملائی جا سکتی ہیں۔

(الف) بادشاہ کو قوم کے دیگر عناصر کی نمایندگی سے قانون سازی میں رد کا جاسکتا ہے۔

(ب) بادشاہ کو اپنے حقوق اور فرائض کی ادائیگی وزرا کے مشورہ سے کرنے پر زور دیا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طریقے سے اُس کا کام آسان ہو جاتا ہے اور اس کی قوت کو زوال نہیں ہوتا لیکن یہ اُصول بالکل اس خیال کی ضد ہے جس میں

(الف) بادشاہ کو صرف ایک کٹ پتلی سمجھا جاتا ہے اور زندہ ہستی نہیں سمجھا جاتا ہے یا۔

(ب) بادشاہ قومی نمایندگان اور وزرا کا ماتحت سمجھا جاتا ہے اور جس میں اُسکو اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ سلطنت کی اعلیٰ قوت بادشاہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے لہذا اُسکو اپنی آزادی اور ذاتی حقوق کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ بادشاہی سلطنتوں میں بادشاہ کی بیداری اور محنت پر سلطنت کا انحصار ہوتا ہے اور یہ عجیب اور بیہودہ بات ہوگی اگر اُسکو اعلیٰ ترین حقوق دیکر دوسروں کی رائے کی ماتحتی میں

رکھا جائے۔ وزراء بادشاہی احکام کی قوت زور کو نہیں بڑھا سکتے بلکہ اُنکو خود بادشاہ سے اس قسم کا اختیار حاصل ہوتا ہے اور بادشاہ کے زیر حکم کام کرنا انکا فرض ہوتا ہے۔ جبتک آئینی طور پر بادشاہ کو وزرا کی رائے پر عمل کرنے پر مجبور نہ کردیا جاوے وہ اپنی آزادانہ رائے دیکر اُسپر آزادی سے عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ بخلاف اس کے آئینی بادشاہ بذات خود نہ تو قانون بنا سکتا ہے اور نہ بغیر وزرا اور مجلس وکلاء کی رائے کے حکومت کرسکتا ہے۔ تاہم آئینی بادشاہی میں بادشاہ اگر اپنے فرائض ادا کرنا چاہے تو وہ وزرا کے مشوروں اور مجلس وکلا کے فیصلوں کو قومی بہبودی کے نقطۂ نظر سے دیکھکر اپنی ذاتی رائے دے سکتا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے جھوٹ بولنے پر یا اپنے جذبات کے خلاف رائے دینے پر مجبور کرسکے۔

آئینی بادشاہوں کی قوت اور حقوق

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ بادشاہ کا وقار اور سلطنت میں اُس کی قوت سب سے اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہئے۔

اس اصول سے مندرجہ ذیل نتائج پیدا ہوسکتے ہیں۔

(الف) آئینی بادشاہی متفرق حقوق کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ بادشاہی کے کل حقوق اُس میں بدرجۂ اتم اس طرح موجود ہوتے ہیں کہ گویا ایک ہیں مطلق العنان شاہی حکومت نہ تو حقوق حکومت نہ آزادی عمل کو کسی سیاسی مجلس کے سپرد کرسکتی ہے۔ آئینی حکومت کا طرز عمل اسکے خلاف ہوتا ہے اور وہ سیاسی مجالس اور رعایا کی آزادی کو تسلیم کرتی ہے

(ب) بادشاہ قانون سازی میں شریک ہوتا ہے جو عموماً قانون کے مقصد کے لحاظ سے ہمیشہ اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہے۔ اور کل قوانین اُسکے نام سے جاری کئے جاتے ہیں۔

(ج) حکومت کا مرکز بادشاہ ہوتا ہے۔ اور یہ حق صرف بادشاہ کا حق سمجھا جاتا ہے اور اُسی کے نام سے حکومت کیجاتی ہے۔

آئینی بادشاہی میں وزرا اور دیگر عمال اپنے نام سے حکومت نہیں کر سکتے اور اُن کی کل طاقت اور حقوق بادشاہی قوت سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اور ان حقوق کو وہ لوگ صرف سلطنت کے اغراض کو پورا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگرچہ بادشاہ بغیر اُنکی رائے اور مشورہ اور اتحاد عمل کے حکومت نہیں کر سکتا گویا حکومت مرکز سے شروع ہو کر دائرہ کی طرف پھیلتی ہے یعنی بادشاہ سے درجہ بدرجہ نیچے تقسیم ہوتی ہے اور کل ارکان حکومت بادشاہ کے ماتحت ہوتے ہیں۔ آئینی شاہی حکومت مطلقہ کو نہیں کہتے۔ یہ حکومت ملّت و ملک کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا صرف انگریزی حکومت کو بہترین آئینی حکومت تصور کر کے نتائج اخذ کئے جائیں تو سخت غلطی ہو گی۔

مندرجہ ذیل خصوصیات ہر قسم کی آئینی سلطنتوں میں پائی جاتی ہیں۔	آئینی بادشاہی کی عام خصوصیات

(۱) بادشاہ کی عظمت و قوت آئین سے محدود ہوتی ہے اور بادشاہ آئین

سے بالاتر نہیں ہوتا بلکہ اسکے حدود کے اندر سمجھا جاتا ہے۔ یہ کسی حد تک ضروری ہے کہ آئین صورت تحریر میں موجود ہو مگر یہ حکومت کے تخیل کے لئے ضروری نہیں ہے[۵]

آئینی بادشاہت دونوں طرح ممکن ہے۔ خواہ آئین تحریر شدہ ہو یا نہ ہو۔ اگرچہ غیر مرقوم قانون نہایت ضروری ہوتا ہے تاہم سیاسی حقوق کا صفحۂ قرطاس پر آجانا نہایت ہی ضروری خیال کیا گیا ہے۔ اور موجودہ طرز زندگی کے لئے یہی صورت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۲) آئینی بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف آئین کی عزت کرے بلکہ سلطنت کے قوانین کی پابندی بھی کرے۔ وہ قانون و قواعد کے مطابق افراد سلطنت کو فرمانبرداری پر مجبور کر سکتا ہے۔

(۳) مجالس ملی کے ساتھ ساتھ پوری قانون سازی کی قوت بادشاہ کو حاصل ہوتی ہے کسی قانون کے جاری کرنے کے لئے اُن کی اجازت و مشورہ ضروری ہے

(۴) اسی طرح مالی انتظامات اور ٹیکسوں کا منظور کرنا بھی مجلس وکلاء کے مشورہ اور اتحاد عمل پر منحصر ہوتا ہے۔

[۵] شہنشاہ جرمنی ولیم چہارم نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ بعض "آئین قرطاس" ہوتے ہیں اور اُن کا تباہ کرنا ویسے ہی آسان ہوتا ہے کہ اُنکی بنا صرف خیال پر ہوتی ہے۔ قوم پر اُنکا انحصار نہیں ہوتا۔ تاہم تحریر شدہ آئین قرطاس اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ وہ لکھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ زیادہ محفوظ اور مضبوط ذریعہ ہے۔

(۵) حکومت اور اجرائے احکام کے لئے وزرا کا اتحاد عمل ضروری ہے۔ یعنی کوئی بادشاہی حکم یا قانونی یا فیصلہ کسی شخص پر عاید نہیں ہو سکتا جبتک کہ بادشاہ کے دستخط کے بعد کوئی وزیر بھی اپنے دستخط ثبت نہ کرے۔

(۶) وزرا اور دیگر عہدہ دار اس نظام کے ماتحت اپنی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے۔

(۷) محکمہ قضا کا مجلس وکلا کے حلقہ اثر سے باہر ہونا ضروری ہے۔ اس طرح حکومت پر خاصا دباؤ پڑتا ہے۔ اور رعایا کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہو جاتی ہے۔

(۸) جماعات اور افراد کے نہ صرف ذاتی حقوق ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ حقوق عامہ بھی رکھتے ہیں۔ اور جس طرح شاہی حقوق محفوظ ہوتے ہیں اسی طرح رعایا کے یہ حقوق بھی چھینے نہیں جا سکتے۔

اس طرح آئینی سلطنت شاہی گویا آزاد ملت کی قومی بادشاہت ہوتی ہے۔

مقالہ پنجم حکومت الاشراف

حکومت الاشراف کا اصل الاصول ۔

کہا جاتا ہے کہ حکومت الاشراف کا اصل الاصول اعتدال ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی سلطنت اُسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب اعتدال و آشتی سے کام لیا جاوے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رعایا کی تعداد اور اُن کی قوت حکام کی تعداد و قوت سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جمہوری حکومت اس خیال سے کہ وہ محدود نہیں ہوتی اپنی طاقت کا انتہائی استعمال کر سکتی ہے۔ مگر حکومت اشراف رعایا کی بغاوت کے خوف سے سختی کے ساتھ حکومت نہیں کر سکتی۔ چونکہ بغیر اعتدال کی ایسی حکومت قائم نہیں رہ سکتی لہذا عموماً ایسی سلطنتیں تنگ خیال ہوتی ہیں یعنی رفتار ترقی و رستے خیالات کی ترویج نہایت دشواری اور دیر کے ساتھ کیجاتی ہے۔

اس بات کے ساتھ یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ حقیقی حکومت الاشراف وہی سلطنت کہی جا سکتی ہے جس میں قوم کے بہترین افراد حکومت کریں۔ نیز یہ لوگ اخلاقی و دماغی حیثیت سے عوام سے بدرجہا بالا ہوں اگر یہ بات نہ رہے تو اُنکی قوت کا زائل ہونا اور اُن میں تکبر و ذلالت کا پیدا ہونا ضروری ہے ان کے

زوال کا ایک اور سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ عوام بھی امراد اشراف کے درجہ تک پہنچ جائیں اور امرا تکبر و غرور یا نفرت وحقارت کیوجہ سے ان لوگوں کو اپنے زمرہ میں نہ شامل کریں۔ امرائے روما جس درجہ جلیلہ پر تھے اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ عوام الناس کے طبقہ سے ہمیشہ اپنی جماعت کو مضبوط کرتے رہتے تھے اور اُن کو اپنے اندر شامل کر لینے میں کوئی عذر نہ کرتے تھے۔

اسکی بیگانگی وعلیحدگی اکثر مہلک ثابت ہوتی ہے

تاہم یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اشراف عامرا کا طبقہ عوام سے علیحدہ اور بیگانہ وشی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے یہ ایک ایسا قصور ہے جو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اُنکو حکومت کرنیکا حق صرف اس وجہ سے ملا تھا کہ وہ اتنی قابلیت رکھتے تھے کہ عوام پر اُنہیں ترجیح دیجائے۔ موجودہ ہندوستان میں جتنے تعلقہ داران اودھ ہیں اُن میں سے شاذ و نادر کوئی ایسا تعلقہ دار ہوگا جسکے آباؤ اجداد میں سے سب سے پہلا تعلقہ دار نہایت قابل تدبر یا نبرد آزما نہ ہوا ہو۔ اسی وجہ سے وہ اتنے آدمیوں پر حکومت کرنے کے اہل سمجھے گئے۔ مگر عموماً یہ ہوتا ہے کہ جماعت امرا اس صفت خاص کو جو اُن کی حکومت کے جواز کے لئے ضروری ہے بھولکر صرف اس حق کو میراث کے طور پر حاصل کرتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اتنے نالائق ہو جاتے ہیں کہ حکومت کی اہلیت باقی نہیں رہتی۔ ایسی جماعت چھوٹے پیمانہ پر اپنی حکومت قائم رکھ سکتی ہے۔ مگر جب اُن کی حکومت کا دائرہ وسیع ہو جائے تو وہ اس کام کے لئے ناموزوں ہو جاتے ہیں۔ سپارٹا اور وینس میں حکومت اشراف

قائم تھی۔ مگر فتوحات کے ساتھ ساتھ دائرہ حکومت وسیع ہوتا گیا اور اُن کی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ دور کیوں جائے خود ہندوستان کے صوبہ اودھ میں اُمرا اور جاگیردار طبقے کے ناجائز اور متکبرانہ برتاؤ نے رعایا کو اس بات پر آمادہ کر دیا تھا کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں وہ اُن کی حکومت کے ناجائز دباؤ کو اپنے سروں سے اُتار کے پھینک دیں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومت کی قابلیت نہ ہونے اور کارندوں پر کام چھوڑ دینے کی وجہ سے روز بروز کسانوں کا طبقہ اپنے پرانے محسنوں اور آقاؤں کو نفرت وحقارت سے دیکھنے لگا ہے۔ یہ حالت جب ہی درست ہو سکتی ہے جب عوام کو انسان سمجھکر اُنکے حقوق نہ چھینے جائیں اور امرا کا طبقہ اُنکی جماعت کو ترقی کے موقعے بہم پہنچا کر اپنی مانند سمجھنے لگے۔

حکومت الاشراف کی قسمیں

حکومت الاشراف ایسی جماعت حکام کا نام ہے جو کسی نہ کسی خاص صفت کی وجہ سے عوام کے طبقے سے بہتر سمجھے جاتے ہیں یہ صفت قومی خصوصیت کے اعتبار سے ہر ملک میں الگ ہوتی ہے بعض ممالک میں صرف پیدائش کے اعتبار سے یہ جماعت بنائی جاتی ہے جسمیں خاندانی حقوق کا نظام حکومت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح قابلیت وعلم کی صفت کے لحاظ سے بعض جگہ علما یا کاہنوں کی جماعت اشراف بنجاتی ہے۔ اگر عمر کا لحاظ کیا جائے تو بہت زیادہ ضعیف اور بڈھے آدمیوں کی جماعت اشراف ہو جاتی ہے اور قوت وفوجی قابلیت کا خیال کیا جائے تو جنگ آزمودہ اور فوجی آدمیوں

کی جماعت بنتی ہے۔ بقول حکیم سسرو "بدترین اقسام حکومت الاشراف کی یہ ہے کہ دولت و مال (خواہ وہ زمین کی صورت میں ہو یا خزانہ کی حالت میں) کے خیال سے اشراف کی جماعت بنے اور حکومت کرے"

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حکومت اشراف میں مندرجہ بالا صفات میں سے متعدد صفات جمع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ جماعت اُس جماعت سے زیادہ قوی اور حکومت کی اہلیت رکھنے والی ہوتی ہے۔ جو صرف ایک ہی صفت کی وجہ سے حکومت کرنے اور جماعت اشراف میں شامل ہونیکی مستحق ہوئی ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسی جماعت طبقہ عوام کی ترقی و عزت کے دعووں کا زیادہ آسانی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔

حکومت الاشراف کی خصوصیات (۱) ظاہری شان و شوکت	حکومت اشراف اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے ظاہری شان و شوکت سے سلطنت کی عزت قائم رکھتی ہے۔

حکومت رعایا کی محبت کی اتنی پرواہ نہیں کرتی جتنا یہ چاہتی ہے کہ وہ اس شان و شوکت دیکھکر مرعوب ہو جائیں اور سلطنت آئین و قوت کا دبدبہ اُن کے دلوں میں بیٹھ جائے جمہوری حکومت اور حکومت اشراف میں یہ امتیاز قا... توجہ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جمہوریت میں سلطنت اتنی پست ہو جا... کہ عوام کے مساوی ہونے کی وجہ سے اُن کے دلوں سے اس کی ع... ہو جاتی ہے۔

۲۔ حکومت کی سختی

لیکن مندرجہ بالا طرزِ عمل کا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اشراف اتنے مغرور اور خود پرست ہو جائیں کہ عوام اور رعایا کی ذرہ برابر بھی پروا نہ کریں۔ ایسی حکومتوں میں عموماً طبقۂ ادنیٰ کے انسانوں سے ایسا حقارت آمیز سلوک کیا جاتا ہے اور اتنی سخت گیری سے حکومت کی جاتی ہے کہ اُن کی جانوں پر بن جاتی ہے۔ اس کی شہادت اہلِ سپارٹا کے طرزِ عمل سے جو ادنیٰ طبقہ (ہیلاٹ) کے ساتھ تھا یا ہندوستان کے جاگیرداروں اور آئرلینڈ کے انگریز رئیسوں کے برتاؤ سے کافی و وافی مل سکتی ہے نیز اور جنوبی افریقہ میں ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ اس زمانہ میں جو ذلت آمیز سلوک کیا جا رہا ہے وہ انگریز امرا کی سخت گیری کی بیّن شہادت ہے۔

۳۔ انتہائی جمود

جمہوری حکومت جتنی تغیر پذیر اور قابلِ تبدیل ہوتی ہے اُتنا ہی حکومتِ اشراف سختی کے ساتھ اپنے آئین و نظامِ حکومت پر قائم رہتی ہے۔ جمہوریت یہ جانتی ہے کہ میری طاقت غیر محدود ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنے قیام کے اسباب پر غور نہیں کرتی بخلاف اس کے حکومتِ اشراف اپنا نظامِ حکومت قائم رکھنے کی غرض سے اس غلطی میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ نہایت سختی سے ہر نئی بات اور تبدیلی کو روکتی ہے چونکہ ایسی حکومتیں اپنے آئین کی سختی بلکہ تنگ خیالی سے پابند ہوتی ہیں۔ لہٰذا بمقابلہ جمہوری حکومتوں کے عرصہ دراز تک قائم رہتی ہیں۔ یہ حکومتیں سیاسی تجربات کو حتی الامکان ٹالتی اور ترقی کے میدان میں نہایت آہستہ اور پھونک پھونک کے قدم رکھتی ہے۔ خاص خطروں کی حالت میں وہ فیصلہ کن طاقت کا اظہار کرتی ہے۔

اور کچھ عرصے کے لئے اس کا طرز عمل مثل شاہی سلطنتوں کے ہو جاتا ہے۔ یہ صفت اگر اعتدال کے ساتھ موجود ہو تو قابل تعریف ہے۔ چونکہ احتیاط و حفاظت نفس کی فطرتی حس ایسے طرز عمل پر ہر جاندار کو مجبور کرتی ہے مگر اسکا انتہائی استعمال (یعنی اعتدال کی حدود سے باہر ہو جانا) سخت خطرناک غلطی ہے۔

۴۔ موروثی حقوق | یہ حالت جمود لازمی طور پر نظام حکومت کے ہر شعبہ کو موروثی بنا دیتی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس اصول پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اصول موروثی سے نفرت کا اظہار روز افزوں ترقی پر ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں خیال اگر حد سے تجاوز کر جائیں تو مضر ثابت ہونگے۔ دونوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے۔ آجکل نئی ضروریات اور ترقی کے لحاظ سے موروثی حقوق کے خلاف جنگ کرنا بیجا تصور نہیں کیا جاتا اور انفرادی قابلیت کے لحاظ سے وہ حقوق تقسیم کئے جانے پر اصرار کیا جاتا ہے جو خاص خاص خاندانوں کی میراث بن گئے ہیں۔ لیکن یہ سخت غلطی ہوگی اگر موروثی اصول کے قیام سے جو رابطہ حال اور زمانہ ماضی کا تعلق قائم ہے توڑ دیا جائے۔ روایات قدیم کی بجائے غیر مستقل اور کمزور تبدیلیاں پیدا کرنا اور ان حالات کو بلا ضرورت تبدیل کرنا جاز قا[illegible] پائداری کا باعث نہیں غلطی ہے۔ انگلستان میں ابتک موروثی حقوق [illegible] جاتا ہے مثلاً ہم برک کے وہ خیالات جو اس نے "انقلاب فرانس" میں اور درج ذیل کرتے ہیں:۔

"تم دیکھوگے کہ مگنا کارٹا کے زمانہ سے "اعلان حقوق" کے زمانہ تک نظام حکومت کا یہ نصب العین رہا ہے کہ ہماری آزادیوں کا دعویٰ کرے اور اُن کی حفاظت کرے۔ یہ حقوق ہمارے آباؤ اجداد سے مثل میراث کے ہمارے پاس پہنچے ہیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو منتقل کر دئے جائیں گے۔..... ہمارا تاج بطور میراث کے ہم تک پہنچا ہے ہمارے تعلقہ دار موروثی ہیں۔ اور دارالعوام اور قوم کو حقوق اور آزادیاں وغیرہ آباؤ اجداد کے لمبے سلسلے سے ورثہ میں ملی ہیں۔ نئی باتوں کی ابتدا کرنا خود غرضی اور محدود خیالات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نہ تو قوم آئندہ نسلوں کا خیال کریگی نہ گذشتہ بزرگوں کی پرواہ ہوگی۔ اسکے علاوہ انگلستان کے باشعور اسکو بخوبی جانتے ہیں کہ میراث کا تخیل اُن کی حفاظت کا بہترین اصول ہے.......
یہ قدرتی طریقہ ہے..... اور اس طریقہ کو محفوظ رکھنے کی وجہ سے نہ تو ہم بالکل نوجوانی کی حالت میں رہتے ہیں نہ بالکل بڑھاپے کی حالت میں..... اس موروثی تخیل سے ہمارے سیاسی ڈھانچہ میں رشتہ داری کا عکس موجود ہے۔ جو ہمارے نظام حکومت کو ہماری گھریلو (جن سے ہم بیحد محبت کرتے ہیں) وابستہ کرتا ہے اور قوانین کو خاندانی ملکیتوں سے مربوط کر دیتا ہے"

سلطنتوں کی پابندی | سلطنت اشراف جب ہی محفوظ رہ سکتی ہے جب امن کا میابی سے قائم رہے۔ اسی وجہ سے قانون اور قانونی ضروریات کی انتہائی حفاظت قدم رکھتی ہے۔ سوائے اسوقت کے جب اس سلطنت کی ہستی معرض خطر میں ہو

یہ سلطنت اس بات کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ جمہوریت کے مقابلہ میں عدل و انصاف کی زیادہ قدر کرتی ہے۔ دنیا میں شاید سب سے بڑی حکومت اشراف رومیوں کی تھی اور اس کو اتفاقیہ بات نہ سمجھنا چاہئے کہ علم قانون کی ترقی اس قوم نے اپنی سلطنت کے اثر سے کی۔ اسی طرح اہل وینس بھی سختی سے قوانین سلطنت کے پابند تھے۔

حکومت اشراف کا تنزل۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی حکومت کو قطعی ناپسند کیا جاتا ہے فی زمانہ یا تو جمہوری حکومتیں ہیں یا آئینی شاہی سلطنتیں باقی ہیں۔ روستہ الکبریٰ کی حکومتہ الاشراف جمہوریت کے ترقی پذیر ہونے ہی فنا ہوگئی۔ اسی طرح اور سلطنتیں بھی آئینی حکومتوں میں تبدیل ہوگئیں۔ موجودہ زمانہ میں طبقہ امرا یا اشراف ملت کا ایک جزو خاص سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا مرتبہ بادشاہ سے کم ہے مگر عوام سے بدرجہا بلند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہر جگہ وہ سلطنت کے ماتحت ہیں۔ اگرچہ وہ بادشاہی سلطنتوں میں اعتدال اور جمہوریتوں پر دباؤ ڈال کے ان کو ملا کر سکتے ہیں لیکن کسی سلطنت میں اس کی قوت کو اپنے قبضہ میں کر لینے کا نہیں رکھتے۔

حصّہ اول

مقالہ ششم سلطنت جمہوری

(الف۔ بلاواسطہ)

قدیم و جدید جمہوریت کا فرق

جمہوریت کے متعلق قدیم و جدید تخیل میں بڑا فرق ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ قاعدہ تھا کہ سلطنت سے ابتدا کی جاتی تھی اور ہر فرد واحد کی آزادی کی حفاظت اس طرح کیجاتی تھی کہ حکومت ہر شخص پر مساوی طور پر تقسیم ہو جاتی۔ موجودہ زمانہ میں انفرادی آزادی سے ابتدا کیجاتی ہے اور سلطنت کو یہ آزادی جہانتک ممکن ہوتا ہے کم تر دینے کی کوشش کیجاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کوشش کیجاتی ہے کہ جہانتک ممکن ہو سلطنت کی حکومت کم ہو جائے۔ جمہوریہ قدیم ایسی سلطنت ہوتی تھی جس میں ہر شخص براہ راست حکومت و سلطنت میں حصہ لیتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں عموماً جمہوریت کا قیام اصول نمائندگی پر ہوتا ہے۔ اور وکلائے قوم حکومت کرتے ہیں۔ لہذا یہ صاف ظاہر ہے کہ پرانے طرز کی جمہوریت نہایت چھوٹی سلطنتوں میں رائج ہو سکتی تھی۔ اور موخر الذکر طرز حکومت بڑی سلطنتوں میں قائم ہو سکتا ہے

جمہوریہ یونان قدیم ملک یونان نہایت چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم تھا۔ اور وہ لوگ خصوصیت سے جمہوری طرز حکومت کو زیادہ پسند کرتے تھے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یونان کی قدیم شاہی اور اشراف کی سلطنتوں میں بھی جمہوری عنصر پایا جاتا ہے۔ جو موجودہ شاہی اور رومی حکومت الاشراف سے ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ یونان کے جلیل القدر حکما (مثل افلاطون، ارسطو۔ اور زنوفان) اگرچہ اس امر پر متفق ہیں کہ اثانیہ کی جمہوریت مطلقہ ناموزوں ہے تاہم جمہوریۂ معتدل کو بہتر طرز حکومت بتاتے ہیں اور اسکا نام آئینی حکومت (خاص معنوں میں POLTEI ، پالٹی) بتاتے ہیں[۱]۔

ہندوستان قبل اسکے کہ اثانیہ (یونان کی ایک سلطنت قدیم) کا مختصر نظام حکومت تحریر کیا جائے ہندوستان کے اس اجتماعی نظام کا ذکر کرنا ضروری ہے جو ذاتوں کی تقسیم کی وجہ سے قائم ہو گیا تھا۔ ہر ذات کے آدمیوں کا ہر شہر و قصبہ میں خواہ وہ کسی سلطنت یا کسی راجہ کی حکومت میں ہوں الگ الگ ایک ایسا مضبوط اجتماعی نظام قائم تھا جو سلطنتوں کے عروج و زوال اور ہندوستان

نوٹ[۱] صرف ارسطو پالٹی کو ان معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ (دیکھو اخلاقیات ارسطو کتاب ۸ مقالہ اول اور سیاسیات کتاب ۳ مقالہ ۷) لیکن اس طرز حکومت کو نسبتاً بہترین سلطنت بتاتا ہے۔ افلاطون "جمہوریہ" میں حکومت جمہوری کو حکومت خواص کے بعد کا درجہ بتاتا ہے لیکن (سیاسیات ۳۰۲-۳۰۳) میں اپنا خیال تبدیل کر کے دو قسم کی جمہوری حکومتیں بتاتا ہے۔ ایک اچھی دوسری خراب۔ اچھی قسم کو ارسطو پالٹی کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

کے سیکڑوں انقلابوں سے بھی تبدیل نہ ہو سکا اور ابتک اُسی اُستواری کے ساتھ قائم ہے۔

الف۔ پنچایت اس اجتماعی نظام کا نام پنچایت ہے۔ ہر ذات کی پنچائت الگ الگ ہوتی تھی اور اگر مدعی اور مدعا علیہ دونوں ایک ہی ذات کے ہوں تو اُن کے کل سیاسی۔ اجتماعی اور تمدنی امور کا فیصلہ پنچایت پر منحصر ہوتا تھا۔ یہ فیصلہ قطعی ہوتا تھا اور اسکا مرافعہ کسی عدالت بالا میں نہ ہو سکتا تھا۔ اور جو سزا یا فیصلہ تجویز ہوتا تھا اسکو ذات سے اُٹھا دینے کے خوف سے جاری کیا جاتا تھا اور جو شخص اُس فیصلہ کو منظور نہ کرتا تھا وہ برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا اور اُس کی زندگی اتنی تلخ ہو جاتی تھی کہ موت کو ایسی زندگی پر ترجیح دیجاتی تھی۔ اس پنچائتی انقطاع کی سیکڑوں نظیریں موجودہ زمانہ میں بھی مل سکتی ہیں۔ بنگال میں ایسور چند ودیا ساگر نے جب بیواؤں کی شادی پر زیادہ زور دیا اور اپنے خاندان میں جاری کرنا چاہا تو اُن کی کل برادری نے اُنکو اپنی ذات سے باہر کر دیا۔ اُن کی بیوی روتی تھیں اور وہ بھی اگرچہ نہایت مستقل مزاج و صابر اور ہمدردِ بنی نوع انسان تھے لیکن وہ بھی اس اجتماعی انقطاع کی تکلیف کو برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ پنچایت کا فیصلہ سلطنت کے اعلیٰ حکام ہیانگ کر اصلیہ بھی جاری ہوتا تھا اور وہ بھی اس کے اثر سے باہر نہ تھا اس اصول نے ایک ذات کو دوسری ذات سے بالکل علیحدہ کر دیا تھا اور راجہ صرف اُنہی باتوں کا فیصلہ کرتا تھا جو یا تو براہ راست اُسکے منصفوں سے فیصلہ کرائی جائیں یا دو ذاتوں

کے آدمیوں میں فیصلہ کرنے کی ضرورت ہو۔ قانون بھی اسی وجہ سے ہر ایک ذات کے لئے علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔

(ب) انتخاب | کسی ذات کے پنچوں (وکلا) کا کوئی باضابطہ انتخاب نہیں ہوتا۔ بلکہ عموماً ایک سرپنچ۔ چودھری۔ یا صدر بالاتفاق منتخب ہو جاتا ہے جس کا عہدہ دائمی ہوتا ہے اور ہر شخص کو جو اُس برادری یا ذات کا ہو پنچایت میں بحث کرنے اور اپنی رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔

پنچایت کی خصوصیات | (۱) پنچایت کو امور سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ صرف اجتماعی نظام تھا جو جماعت کے اندرونی تعلقات کو ہموار کرتا تھا۔ پنچایت گویا مختلف ذاتوں کی عدالت عالیہ تھی۔ اور ہر قسم کے قانونی، مذہبی، و اجتماعی معاملات کا اجتماعی انقطاع کے خوف سے فیصلہ کر کے احکام جاری کرتی تھی۔

(۲) علاوہ جسمانی سزاؤں کے جو سزائیں جرمانہ کی صورت میں دی جاتی تھیں وہ کل روپیہ ممبران پنچایت کے کھانے میں صرف کر دیا جاتا تھا اور اُس سے کوئی قومی مستقل خزانہ نہ جمع کیا جاتا تھا۔ اگر یہ روپیہ کھانے وغیرہ میں نہ صرف ہوتا تو اُس کو کوئی ایسی چیز خرید کر لیجاتی تھی جس سے اُس پنچایت کو فائدہ حاصل ہو۔

(۳) پنچایت کے قیام سے سلطنت کا کام تقسیم ہو جاتا تھا اور اس طرح اندرونی انتظام میں بادشاہوں اور راجاؤں کو بہت زیادہ وقت نہ اٹھانی پڑتی تھی اور چونکہ منصف (پنچ) مقامی واقعات سے اس وجہ سے زیادہ واقف ہوتے تھے کہ

اسی مقام کے باشندہ ہوتے تھے لہذا فیصلے نہایت اعتدال و انصاف و صلح پسندی پر مبنی ہوتے تھے اور اجتماعی پیچیدگیاں بہت آسانی سے سلجھ جاتی تھیں۔

(۴) ایک ذات کی پنچایت دوسری ذات کے آدمی کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی اس وجہ سے مختلف ذاتوں کی تفریق روز بروز پختہ ہوتی جاتی تھی اور رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُسکا دور کرنا اور مختلف ذاتوں کی ایک پنچایت بنانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی اگرچہ قدیم نظام پنچایت قائم ہے مگر سلطنت کی سرپرستی نہونے کی وجہ سے یہ نظام کسی قدر کمزور ہو گیا ہے اور عدالتوں اور وکیلوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ کل معاشی اور اجتماعی معاملات نہایت پیچیدہ طریقوں سے عدالتہائے انگریزی میں پیش ہوتے ہیں۔ اور پنچایت کا نظام درہم برہم ہوا جاتا ہے

اثانیہ کا نظام حکومت جمہوری حکومت کا بہترین نظام حکومت اثانیہ میں موجود تھا۔ کسی سلطنت میں قوم کے افراد کی حکومت اتنی وسیع نہ تھی جتنی اثانیہ میں تھی۔ تقریباً ہر ضروری کام اُن کی مجلس (جسکا نام اکلیزیا تھا) سرانجام دیتی تھی اور اتنی جلد اُسکے اجلاس ہوتے تھے کہ تعجب ہو سکتا ہے۔ جب ہم اسے یاد رکھیں کہ مزدوری پیشہ جماعت اُسی طبقہ کے نہ ہوتی تھی بلکہ یہ کام غلاموں سے لیا جاتا تھا۔

اکلیزیا مجلس قوم کا نام اکلیزیا تھا اور اسمیں سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے [illegible] مدنی حقوق کو کسی جرم کی پاداش میں کھو دیا ہو ہر شخص حصہ لیتا تھا

ن سال ہ سن عمر کی قید تھی۔ اس طرح ہر شخص اپنے آپ کو سلطنت کا حاکم سمجھتا تھا
جمہوریت کی خصوصیت یہ ہے کہ باشندگان سلطنت کی تعداد کثیر کی را
سے حکومت کیجائے۔ یہ بات اثنا نیہ میں کامل ترین طریقہ پر موجود تھی۔ اور ہر شخ
کو تقریر کرنیکا حق حاصل تھا اور خطابت و فصاحت کا جتنا دور دورہ اس زما
حکومت میں تھا آجکل صحافت اس درجہ کو ہرگز نہیں حاصل کر سکتی۔ حکومت کا ہر ض
کام یہی مجلس کثرت رائے سے کرتی تھی۔ اور انسانی زندگی کا ہر شعبہ اسی مجلس
احکام کے زیر اثر تھا۔ اس حکومت میں عوام کی قابلیت خصوصیت سے بڑھ جاتی
اور بہترین مقرروں کی تقریروں کے اثر سے قومی و ملی جذبات کو ہمیشہ فر
ہوتا رہتا تھا تاہم ایک خرابی یہ تھی کہ امرا کا طبقہ عوام کی کثرت رائے کے د
ہمیشہ خستہ حال کر دیا جاتا تھا

جمہوریہ بلا واسطہ کا حسن و قبیح۔

باشندگان یونان نے بلا واسطہ جمہوریت (یعنی جم
کل افراد قوم شریک ہوں) کا نمونہ دنیا کے سا
پیش کرکے یہ بتا دیا کہ جمہوریت حکومت کی بجائے آزادی کو زیادہ پسند کرتی
لیکن جمہوری آزادی کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد ملت حکومت میں حصہ لے سکے ا
جب ہی ممکن ہے جب افراد ملت کو کاربار سلطنت پر غور کرنیکا موقع ہو ا
سلطنت بھی بہت وسیع نہ ہو۔ یا ایسی جماعت مزدورین موجود ہو جو سلطنت
کاموں سے الگ رکھی جائے۔ مہذب اقوام میں بلا واسطہ جمہوریت قیام

نام کو ہوتا ہے وجہ صرف یہ ہے کہ مزدوری پیشہ باشندوں کو لا محال سلطنت میں دخل دینے سے رکنا پڑتا ہے۔

عوام کے جذبات کے مشتعل ہونیکا خطرہ

عوام کی اتنی وسیع مجالس ملیہ میں غیر محدود طاقت رکھنے کا خیال آسانی سے ترقی پا جاتا ہے۔ اکثر قوانین پر اُن کے جذبات کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اکیلا شخص کتنا ہی سنجیدہ اور دیانتدار کیوں نہو مگر عوام کے جذبات کے مشتعل ہونے کے بعد اکثر ایسی باتیں کرگزرتا ہے جنکو وہ ہرگز پسند نہ کرتا۔

ملت کے طرز عمل کی خاص ضمادرسا

جمہوریت جب ہی بہترین سلطنت کہی جاسکتی ہے جب قوم کا کثیر حصہ سیاسی قابلیت اور تیز فہمی و بصیرت کے زیورات سے آراستہ ہوں۔ ورنہ خالص جمہوریت قائم نہیں رہ سکتی بلکہ سلطنت کے بہترین و قابل ترین اشخاص کے زیر اثر ہوکر باقی رہتی ہے۔ عوام میں سیاسی قابلیت و بصیرت زیادہ عرصہ تک اس وجہ سے باقی نہیں رہ سکتی کہ وہ طاقت کے نشہ میں جلد مخمور ہوجاتے ہیں اور اُن کی جمہوریت صرف اُس وقت تک قائم رہ سکتی ہے جبتک کہ وہ خدائی انصاف کا خوف۔ رسم و رواج اور قوانین کی عزت اور اپنی ملت کے بہترین افراد کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ حکومت میں خود حصہ لینے سے عوام کی بیدار مغزی و تعلیم میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ مگر اپنی غیر محدود قوت کے [illegible] سے آئین و قوانین کا خوف اور قابل ترین افراد کی عزت کا خیال الم [illegible]

کم ہو جاتا ہے۔ اور برے جذبات سے جلد اثر پذیر ہو کر ان بہتر افراد کو من کی تعا
ہوتی ہے پریشان کیا جاتا ہے۔ اور غرور۔ نخوت۔ تلون مزاجی اور ظلم و تعدی کی کثر
ہو جاتی ہے۔ فرقہ بندی ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے نفرت اور بیجا
شروع ہو کر سلطنت کی پائداری میں فرق آجاتا ہے اور وہ تباہ ہو جاتی ہے رسول
کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد جو جمہوریہ اسلام قائم ہوئی اس میں خلیفہ ثالث
زمانہ سے فرقہ بندیوں کی وجہ سے مسلمانوں کی وہ تلوار جو ہمیشہ دشمنوں کے
واسطے تھی آپس میں ایسی چلی کہ ابتک نیام میں نہیں گئی۔

مساوات ہر جمہوریت کی یہ خصوصیت ہے کہ مساوات کی محبت کیجاتی۔
ارسطو کا قول ہے کہ جمہوریت میں تعداد کے مساوی ہونے کی قدر کیجاتی ہے یعنی
شخص دوسرے شخص کی مانند ہوتا ہے اور ہر شخص کی قدر و منزلت اس کی قابلیت
کے لحاظ سے نہیں کیجاتی۔

جمہوریت بلا واسطہ کی صرف چھوٹی اور غیر ترقی قسم یا سلطنتوں میں ترقی ہو سکتی ہے

مندرجہ بالا تفصیل کا یہ اجمال ہے کہ ایسی جمہوریت جو
واسطہ اور براہ راست ہو صرف ایسی قوموں کے قا
ہے جو یا تو زراعتی درجہ پر ہوں یا چھوٹی اور قلیل التعد
ہوں اور اپنی ضروریات زندگی میں نہایت سادہ ہو
بڑی سلطنتوں میں ایسی حکومت کچھ عرصہ کے لئے جوش و ترقی پیدا کر سکتی ہے مگر
مضرت رساں ثابت ہوتی ہے۔ آزادی کا استعمال بیجا شروع ہو جاتا ہے اور
بہتر عنصر کو ناانصافی سے دبا دیا جاتا ہے۔

حصہ ثانی

سلطنت جمہوری

(ب) بالواسطہ (پنچائتی)

موجودہ زمانہ میں سلطنتیں نہایت وسیع ہیں اور اثانیہ قدیم کی طرح ایسی جمہوریت کا قیام ناممکن ہے جس میں کل افراد ملک حصہ لے سکیں اور شریک ہو کر قوانین وغیرہ پر بحث اور غور کریں۔ آجکل جمہوری سلطنتیں بالواسطہ ہوتی ہیں یعنی چند وکلائے ملت پوری ملت کی طرف سے انتظام سلطنت کرتے ہیں۔ اور ہر شخص براہ راست مجالس ملیہ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ایسی جمہوریت جس میں وکلائے ملت کے ذریعہ سے حکومت کیجائے بالواسطہ (یا پنچائتی) جمہوریت کہلاتی ہے اور اس کی ابتدا موجودہ زمانہ میں امریکہ میں ہوئی ہے

۱- امریکہ میں جمہوریت کی ابتدا

امریکہ میں جمہوریت کی ترقی اور قیام کئی وجوہ سے ہوا پہلے اس ملک کے وسیع حصوں پر بادشاہی سلطنتوں کا قبضہ ہوا لیکن یہاں آزاد خیال یورپین اقوام کی نوآبادیاں قائم ہوئیں۔

نوآبادیاں رفتہ رفتہ اسی قسم کی نوآبادیاں جنوبی امریکہ تک پھیل گئیں۔ لوگ جو اپنے وطنوں کو چھوڑ کر تلاش معاش (زیادہ تر سونا) میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ نہایت محنت و جانفشانی سے ان زمینوں کو زراعت کے قابل بنانے میں سرگرم ہوگئے۔ اس محنت کی وجہ سے ان لوگوں میں جفاکشی۔ دلیری۔ ہمت اور خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ اور ملکی وسعت نے انکو آزادی سے ترقی کے وسائل مہیا کئے۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جمہوریت کا قیام اس باعث سے ہوا کہ اس سرزمین کا یہی خاصّہ ہے بلکہ اس کی وجہ زیادہ تر اُن لوگوں کی فطرت میں مضمر تھی جو وہاں جاکر آباد ہوئے تھے اور اپنے ساتھ آزادی اور حکومت خود اختیاری کے خیالات لیتے گئے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر متوسط طبقہ کے تھے اور امرا کے مظالم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ لہذا اصول مساوات و حریت کو مان کر آپس کے اتحاد سے ایسا نظام حکومت قائم کیا جو اگرچہ یوروپین سلطنتوں کے زیر اثر تھا مگر اندرونی طور پر بہت زیادہ آزاد تھا۔ شمالی اور جنوبی نوآبادیوں کے لوگ بوجہ مسافت بعیدہ کے ایک دوسرے سے بہت کم مل سکتے تھے۔ لہذا اُنہوں نے اپنے نمائندوں (وکلا) کے ذریعہ سے حکومت کرنی شروع کی۔ عموماً ہر ایک نوآبادی مندرجہ ذیل خصوصیات میں ایک دوسرے سے مشابہ تھی اور ہر ایک میں تقریباً یکساں نظام حکومت تھا۔

نوآبادیوں کے نظام حکومت کے مشترک عناصر

(الف) طبقۂ امرا کو قطعی مسترد کردینے کے بعد انگریزی

قانون پورے طور پر جاری تھا۔ زمین کے قبضہ میں ہر شخص کو آزادی حاصل تھی۔ اور اقتصادی ومعاشرتی نظام کی بنا اسی اصول پر تھی۔

(ب) طبقہ اُمرا کے مفقود کر دینے کے بعد درجوں اور حقوق کی مساوات ہو گئی تھی۔ مگر سرخ نسل کے باشندوں کی وجہ سے یہ مساوات قائم نہ رہ سکی۔ اور اصلی باشندے حکومت میں نہ تو شریک کئے جاتے تھے نہ سفید نسل کے برابر حقوق رکھتے تھے۔ اور ان میں سے نہایت ہی ذلیل درجہ پر افریقہ کے وہ سیاہ فام باشندے رکھے جاتے تھے۔ جو بطور غلام کے یہاں لاکر آباد کر دئے گئے تھے۔ اور آزاد ہونے پر بھی اُن کو سیاسی حقوق نہ ملتے تھے۔

(ج) بجائے اسکے کہ سلطنت پر بھروسہ کیا جائے نوآبادیوں کے باشندوں میں یہ خصوصیت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنی ذات پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔

(د) قومی تعلیم خود قوم ہی کے ہاتھ میں تھی اور قومی مدرسوں کے ذریعہ سے دی جاتی تھی۔

(ہ) قصبات و دیہات کا آزاد دستور العمل اور نظام حکومت قائم ہو گیا تھا

(و) افسران کی تعداد بہت کم تھی۔ گورنر کا انتخاب کرنے کے بعد تقرر ہوتا تھا ور گورنر کے بعد منصفوں کا درجہ ہوتا تھا۔ یہ دونوں قومی نمائندوں کے ساتھ ملکر کام کرتے تھے۔ (گورنر اپنی مجلس کے ساتھ اور منصف اپنی پنچایت کے ساتھ)

(ز) کوئی باقاعدہ اور مستقل فوج ہر وقت تیار نہیں رکھی جاتی تھی۔ بلکہ ہر

فوج کو ضرورت کے وقت جنگی خدمت انجام دینی پڑتی تھی۔

(ج) ہر نوآبادی میں ایک مجلس وکلا تھی۔ جو قوانین بنانے میں مدد دیتی تھی اور اسکا انتخاب آزاد باشندگان نوآبادی کرتے تھے۔

(د) عہدہ داروں کے لئے عرصہ ملازمت کم رکھا جاتا تھا تاکہ تبدیلی جلد واقع ہو۔

(ی) آخرکار رفتہ رفتہ تحریر و تقریر کی آزادی ہوگئی اور صحافت و مجالس کی قطعی آزادی ہو جانے کی وجہ سے انتظام جمہوریت تقریباً مکمل ہوگیا۔

اس طرح انگلستان سے علیحدہ ہونے سے بہت پہلے جمہوریت کا دستور تیار ہوگیا۔ اور ان نوآبادیوں کے انگلستان سے ۱۷۷۶ء میں علیحدہ ہونے پر جمہوری سلطنتیں مکمل ہوگئی تھیں۔

(۲) فرانس | سلطنت جمہوری جو امریکہ میں قائم ہوئی اُس کی نقل فرانس میں کیا گیا اگرچہ اس ملک کے رسم و رواج بالکل بادشاہی طرز حکومت کے تھے لیکن یہاں کے باشندے حریت۔ مساوات اور برادرانہ تعلقات کو نہایت جوش و خروش سے قائم اور ۱۸۷۰ء سے یہاں مستقل جمہوریت قائم ہے اور یہ اُمید بالکل نہیں ہی کہ یہاں بادشاہی حکومت قائم ہوگی۔

۳۔ سوئیٹزرلینڈ | سوئیٹزرلینڈ میں امریکہ کی جمہوریت کے اصولوں کو نہایت ترقی ہوئی اور یہاں کے ہر ایک باشندے کو آزادی مل گئی اور رائے عامہ کا طریقہ بالکل

۱۷۹۸ء میں پورے سوئٹزرلینڈ کو متحدہ جمہوریت بنانے میں ناکامیابی ہوئی لیکن
سے جو اصلاحات کی گئیں وہ ۱۸۴۸ء میں مکمل ہوگئیں اور یہاں مستقل جمہوریت قائم ہوگئی

۴۔ روس یورپ میں صرف روس میں شخصی مطلق العنان سلطنت باقی رہ گئی تھی اور وہ
حقیقت میں نہایت طاقتور مرکزی حکومت کی اس وجہ سے ضرورت تھی کہ ملک نہایت
وسیع ہے اور تہذیب و تمدن بمقابلہ دیگر اقوام یورپ کے کم ہے۔ سکندر ثانی نے ۱۸۶۱ء
میں کچھ اصلاحات کی تھیں۔ اور نیم آزاد طبقہ کو کچھ حقوق اور آزادی دی تھی۔ زار روس کی
حکومت خدا کے حکم پر مبنی سمجھی جاتی تھی اور یہ مذہبی فرض سمجھا جاتا تھا لیکن جس طرح جنگ یورپ
نے آزادی کی موجیں ایشیا میں پھیلا دیں۔ اسی طرح یورپ جو جنگ کا مرکز تھا اس سے
بری نہ رہ سکتا تھا۔ روس میں دوران جنگ ہی میں انقلاب عظیم ہوا اور اشتراکی جمہوریت
قائم ہوگئی جس میں طبقہ امرا کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

۵۔ ایشیائے وسطیٰ روس کے انقلاب نے مشرق پر بہت گہرا اثر ڈالا اور بڑی بڑی جمہوری
سلطنتوں کے قیام کا ایک سلسلۂ عظیم جاری ہوگیا ہے۔ وسط ایشیا، چین اور افغانستان کی
آئینی حکومتوں اور جمہوریتوں میں تقسیم ہوگیا ہے، اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جب عراق، مصر
وشام میں بھی آخرکار [illegible] آزاد جمہوری سلطنتیں قائم ہو جائیں

۶۔ جمہوریت کی طرز حکومت عموماً سلطنت کی اعلیٰ قوت و حکومت منتخب اور بہترین افراد ملت
کی مجالس کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ قوم کے وکلا یا نمائندے
ہوتے ہیں۔ حکومت میں افراد ملت کا براہ راست کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ملت کے نام سے

وکلائے قوم حکومت کرتے ہیں سلطنتوں میں کہیں جمہوریہ کا انتخاب براہ راست افراد
لت کرتے ہیں جس طرح امریکہ کی سلطنتوں میں عموماً رائج ہے اور بعض جگہ مجلس واضع
قوانین کو رئیس الجمہوریہ کے انتخاب کا حق ہوتا ہے یہ طریقہ سوئٹزرلینڈ میں جاری ہے
پہلے طریقہ میں حکومت زیادہ آزاد اور قوی ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں حکومت کا
نحصار زیادہ مجلس قانونی پر ہوتا ہے۔

محکمہ قضا میں قاضیوں اور منصفوں کا تقرر براہ راست حکومت کی طرف سے
ہوتا ہے۔ یا مجلس قانونی اس کام کو کرتی ہے لیکن قوم کو اس محکمہ میں اس طرح عدہ دیا جاتا ہے
وہ ان لوگوں (یعنی جوری) کا انتخاب کریں جو قاضیوں کو معاملات کے فیصلہ کرنے میں اپنی رائے دے سکیں۔

**جمہوری سلطنتوں
خصوصیات**

عوام الناس میں اخلاقی حالت کی درستگی کا ہونا جمہوری
حکومت کے قیام کے لئے ضروری ہے اور بڑی حد تک یہی
ول جمہوریت قرار دیا گیا ہے لیکن اخلاقی ترقی (خیر و فلاح یا نیکی) کو سیاسی
ول ماننے میں یہ ماننا ضروری ہو جاتا ہے کہ حکمران طبقہ کی اخلاقاً عزت کی جائے
رده لوگ ایسے ہوں جو اخلاقی حیثیت سے عوام سے برتر ہوں اور ایسے ہی
لوگ حکومت کے لئے منتخب کئے جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی کمزوری
، ساتھ ملی زوال کا ہونا ضروری ہے۔

**بہترین وکلاء کے
نتخاب کی ضرورت**

جمہوری سلطنت کا یہ اصول ہے کہ بہترین افراد ملت نمائندوں
کی حیثیت سے حکمرانی کریں لیکن اس امر میں نہایت دقت

ہوتی ہے کہ بہترین نمایندگان ملت کا انتخاب ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فرقہ ہو جاتی ہے (جو اخلاقی کمزوری کی دلیل ہے) اور ایسے لوگ منتخب نہیں ہوتے جو دماغی و اخلاقی حیثیت سے دیگر افراد ملت سے ممتاز درجہ رکھتے ہوں۔ موجودہ زمانہ میں انتخاب کی بنیاد زیادہ تر انتخاب کرنے والوں کی تعداد پر ہوتی ہے۔ اور چونکہ مساوات کا بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے اس وجہ سے ہر فرد ملت کو خواہ اُسکی دماغی و اخلاقی حالت کیسی ہی ہو برابر حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

تعداد کو صفت قابلیت پر ترجیح دینے کی خرابی

ایسا نظام جمہوریت جسمیں ہر فرد ملت کو مساوی حقوق حاصل ہوں زیادہ تر نہایت چھوٹی اور بلا واسطہ جمہوریتوں کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ وسیع سلطنتوں میں جب وکلائے ملت کے ذریعہ سے حکومت کیجاتی ہے تو یہ مان لینا پڑتا ہے کہ وہ وکیل دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ قابل ہونے چاہئیں۔ اس لئے تعداد کو قابلیت پر ترجیح دینے سے لامحالہ نہایت خراب لوگ برسرحکومت ہونگے اور سلطنت کے انتظامات میں کمزوری رونما ہوگی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دہلی کے باشندے جو زیادہ تعلیم یافتہ دولتمند اور تجارت پیشہ ہیں سیاسی حیثیت سے راجپوتانہ کے دیہاتوں کے باشندوں سے بدرجہا قابل ہیں اور اگر دونوں کے حقوق یکساں اور رائے دہندگی میں مساوات برتی جائے تو سخت غلطی ہوگی۔ یہ ضروری ہے کہ اُن افراد کو جو زیادہ قابل اور ہوشیار ہیں عوام کی نسبت زیادہ حقوق ملنے چاہئیں حقیقی نمایندگی جب ہی

ہو سکتی ہے جب انتخابات کا نظام ایسا ہو کہ ملت کا ہر ایک شعبہ اور ہر ایک عنصر اس تناسب سے انتخابات میں حصہ لے سکے جس تناسب سے اُس کا تعلق اور اثر پوری ملت پر پڑتا ہے۔ تعداد کی وقعت خاص خاص موقعوں پر ضرور کرنی پڑتی ہے۔ لیکن تعلیم۔ طرز معاشرت۔ دولت وغیرہ کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

چند اصول انتخاب (۱) جب پوری ملت کسی مسئلہ پر رائے زنی کرے تو رائے کا شمار اُسی طرح کرنا کافی ہو سکتا ہے جس طرح جمہوریہ بلاواسطہ میں کیا جاتا ہے۔

(۲) بخلاف اسکے رائے کا شمار اُس وقت کافی نہیں ہوتا جب ملت کے مختلف حصے اپنے نمایندگان کا انتخاب کریں۔ ان حصوں کی تقسیم بلحاظ قابلیت وصفت ہونا ضروری ہے۔ تاکہ بہترین افراد کا انتخاب ہو سکے۔ اور ملت کے دماغی۔ مالی اور اخلاقی عناصر کا کافی تناسب ہو سکے۔

(۳) ایسے انتخاب میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجلس وکلا کے پورے افراد کا انتخاب عام منتخب کنندگان نہ کریں بلکہ اُن کے ایک مقررہ حصہ کا انتخاب خود منتخب شدہ وکلا کی رائے پر منحصر ہونا چاہیئے۔ تاکہ اُن باقی ماندہ بہترین افراد کا انتخاب بھی ہو جائے جو عوام الناس کے ساتھ زندگی نہ بسر کرنیکی وجہ سے منتخب نہ ہو سکے ہوں۔ یا خود انتخاب میں حصہ لینے سے محترز ہوں۔ ایسے افراد ملت جو درحقیقت اعلیٰ دماغی و اخلاقی قابلیت رکھتے ہیں اس زمرہ میں داخل ہیں اور وکلائے ملت کے اثر سے ضرور سیاسیات میں حصہ لینے لگتے ہیں۔

پنچائتی جمہوریتوں کا حسن و قبیح

جمہوریت کی خصوصیت ہے کہ حکومت کثیر تعداد کی طرف سے کیجاتی ہے اور حکومت کرنے والے قلیل التعداد ہوتے ہیں جمہور کی رائے پر عمل کرانے کے لئے نمائندوں کا انتخاب مقررہ وقت کے بعد دوبارہ ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو جمہور کی رائے کے خلاف کام کرتے ہیں دوبارہ منتخب نہیں ہوسکتے۔ ایسے نظام حکومت میں یہ مان لیا جاتا ہے کہ جمہور کو امور سلطنت پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہے اور نہ عوام ایسی سلطنت کرنیکے قابل ہیں۔ تاہم یہ مان لیا جاتا ہے کہ عوام میں اتنی عقل ہے کہ وہ انتخاب میں حصہ لے سکیں (اس مسلمہ کو مان لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو انتخاب میں اپنی ذاتی رائے کا استعمال بھی نہ کرسکیں اور اسے نہ سمجھ سکیں وہ اس کے مستحق نہیں ہیں کہ وہاں جمہوری حکومت قائم کیجائے)

جمہوریہ بلا واسطہ میں عوام الناس پر سلطنت کا بار زیادہ ہوتا ہے بجائے اسکے جمہوریہ (پنچائتی) میں وکلائے ملت پر زیادہ جوابدہی کا بار ہوتا ہے۔ اور جس قوم میں فرقہ بندی یا جہالت کی وجہ سے ایسے نمائندگان کا انتخاب ہوتا ہے جنمیں قلیل التعداد اقوام کا کچھ خیال نہیں کیا جاسکتا وہاں ضرور خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اور اُسے حقیقی جمہوریہ نہیں کہہ سکتے۔ جمہوریہ میں نمائندگان ملت کو بہترین افراد سمجھکر حکومت سپرد کیجاتی ہے اور ان سے یہ اُمید کیجاتی ہے کہ وہ اچھی طرح اس امانت کو رکھینگے اور عوام الناس اگرچہ اپنی مساوات و آزادی

کو قائم رکھتے ہیں مگر اپنے وکلاء کی اپنی خوشی سے اطاعت کرتے ہیں اور اُنکو اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

حکومت کی کمزوری | چونکہ انتخابات اکثر ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے حاکموں کا انحصار محکوموں پر ہوجاتا ہے۔ اور دوران حکومت میں بھی رعایا کے ہمخیال ہوکر حاکموں کو حکومت کرنی پڑتی ہے۔ رعایا کی آزادی حکام کی حکومت سے زیادہ محفوظ بنا پر قائم ہوتی ہے۔ اور سید القوم خادمہم کے قول کے اعتبار سے جتنے قاضی اور افسران اعلیٰ ہوتے ہیں وہ خادم جمہوریت سمجھے جاتے ہیں۔ جمہوریت (پنچائتی) میں حکومت اوپر سے نہیں بلکہ نیچے سے (یعنی عوام سے) شروع ہوتی ہے اور اوپر کی طرف ترقی کرتی جاتی ہے۔ حکومت غیر مستقل ہوجاتی ہے اور وسیع و دوراندیشانہ تجاویز پر اُسی وقت عمل ہوسکتا ہے جب یہ تجاویز عوام الناس کے جذبات ملّی اور روایات تدبیر کے خلاف نہوں

شان و شوکت کی کمی | ارکان حکومت اور شعبہ ہائے سلطنت میں سادگی پائی جاتی ہے اور بادشاہی سلطنتوں کی طرح ظاہری شان عظمت اور نمود نہیں پائی جاتی نہ دربار کا رنگ جمتا ہے نہ کوئی فوج ہر وقت تیار رکھی جاتی ہے۔ چونکہ اسکا امکان ہے کہ یہ فوج جمہوریت کی آزادی کو صلب کرلے۔ اس وجہ سے کل ملّت کو فوجی خدمت کرنے پر (ضرورت کے وقت) مجبور کیا جاتا ہے۔ اور تقریباً ہر جمہوریت میں جبریہ فوجی تعلیم دینے کے بعد کچھ عرصہ تک جبریہ فوجی

خدمت پہنچاتی ہے۔

تنسیقات عامہ کی خوبی عموماً وہ محکمے جنکا تعلق عوام سے ہے عمدہ حالت میں ہوتے ہیں اور عوام الناس کی آسانی و راحت کا سامان۔ قومی تعلیم۔ سامان رسل و رسائل اور مفید وکارآمد تنسیقات کا ہونا ہمارا یک جمہوریت میں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اور اکثر علوم وفنون میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

عوام کی اخلاقی ترقی حریت ومساوات کے جذبات عوام الناس و خصوصاً درمیانی طبقے کے لوگوں کو بلند خیال اور تیز فہم کردیتے ہیں۔ معاملات عامہ سے عوام کا تعلق رہتا ہے اور اُن پر رائے زنی کرتے کرتے اُن کی ملی یکجہتی بڑھ جاتی ہے۔ اور حُبّ وطن، و ایثار کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے اور یہ جذبات خصوصاً اُس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب کسی غیر سلطنت سے جنگ شروع ہوجائے۔

مقالہ ششم مخلوط اقسام سلطنت

ایک ہی سلطنت میں کئی قسم کی سلطنتیں ہوسکتی ہیں۔ اور ہر ایک سلطنت کا نظام حکومت جداگانہ ہونا ممکن ہے مگر ایسا زیادہ تر اسوقت ہوتا ہے جب قومی تہذیب اور تاریخی حالات کے لحاظ سے ایک سلطنت دوسری سلطنت سے مختلف ہو۔ لیکن جہاں یہ حالات یکساں ہوتے ہیں اگر مختلف اور مخلوط طرز سلطنت قائم ہو تو ضرور خلاف فطرت ہے۔

ہر مخلوط سلطنت میں ایک نئی بات ہوتی ہے یعنی مرکزی (یا اصلی) سلطنت اور ماتحت (علیحدہ) سلطنتوں میں خاص فرق ہوتا ہے اس فرق کے لحاظ سے مندرجہ ذیل تقسیم کیجاسکتی ہے۔

۱۔ ایک سلطنت کی دوسری سلطنت پر حکومت مطلقہ	مرکزی سلطنت اپنی ماتحت سلطنتوں پر مطلق العنان حکومت قائم رکھتی ہے۔ دول یورپ کی یورپ کے باہر (افریقہ و ایشیا) میں اسی قسم کی حکومتیں قائم ہیں۔ مرکزی سلطنت

میں آزاد حکومت ہوتی ہے اور دیگر سلطنتیں نہایت ظالمانہ طریقے سے آزادی سے محروم رکھی جاتی ہیں۔

۲۔ ایک سلطنت کا دوسری سلطنت پر حلقۂ اثر — کمزور سلطنتوں کو طاقتور سلطنتیں اپنے حلقۂ اثر میں لا کر ان کی آزادی کو اپنی حکمت عملی سے محدود کر دیتی ہیں۔ تاہم یہ سلطنتیں کسی قدر آزادی رکھتی ہیں ایسی صورت میں ممالک محروسہ میں نام نہاد ملکی سلطنت قائم رہتی ہے اور حقیقتاً کوئی شہنشاہی حکومت اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے ان ممالک پر اپنا اثر قائم کرتی ہے۔ (مندرجہ بالا طرز سلطنت بھی شہنشاہیت کے موجودہ اصولوں پر قائم ہوئی ہے۔ اس کا بیان آئندہ مفصل طریقہ پر شہنشاہیت کے تحت میں کیا جائیگا) مصر پر انگریزوں کی حکومت اسی طرح کی تھی۔

۳۔ مرکزی حکومت کی نوآبادیوں پر سلطنت — وہ ملک جس کی قوم کے بہت سے آدمی کسی دوسرے ملک میں جاکر آباد ہو جائیں۔ اصلی یا مادری سلطنت کہی جاتی ہے۔ اور نوآبادیاں گویا مادری سلطنت کے بچے ہوتے ہیں یہ نوآبادیاں مرکزی حکومت کے چھوٹے نمونہ ہوتے ہیں۔ اور اپنی آزادی و شان کو قائم رکھنے کے لیے مرکزی حکومت سے خوشگوار تعلقات قائم رکھتے ہیں۔ گرچہ بعض اوقات یہ نوآبادیاں آزاد سلطنتوں میں شمار نہیں کیجاتیں لیکن انکا نظام سلطنت بالکل مکمل ہوتا ہے اور اکثر نوآبادیاں آزاد ہونے پر بھی بیرونی ممالک سے

کوئی تعلقات نہیں قائم کرسکتیں اور اسکے متعلق ان کا دارمدار مرکزی سلطنت پر ہوتا ہے۔ اسکی مثالیں کناڈا، نیوزیلینڈ، آسٹریلیا وغیرہ ہیں۔

۴۔ ارتباط یا ذاتی اتحاد | سلطنتوں کے اتحاد کی صورت میں ہر ایک سلطنت اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قطعی آزاد ہوتی ہے۔ اُن کی آزادی ایسے قوانین سے محدود ہوتی ہے جو وہ خود اپنی حفاظت کے لئے اپنے اوپر عائد کرتی ہیں۔ یہ اتحاد نئی سلطنت کی بنا نہیں ڈالتا بلکہ ہر ایک سلطنت اپنے مکمل نظام حکومت کے ساتھ ساتھ قطعی علیحدہ ہوتی ہے۔ اور اُنکا تعلق تقریبًا ایسا ہوتا ہے جیسا کہ قانون بین الملل سے دنیا کی مختلف سلطنتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف سلطنتوں میں ایک ہی قوم ہو مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ترقی کرکے ملّت واحد کی صورت میں ظاہر ہوں۔ ذاتی اتحاد کی صورت میں سلطنتہائے متحدہ کا ایک ہی بادشاہ ہوتا ہے۔ اور صرف اتحاد (یا ارتباط) کی حالت میں الگ الگ بادشاہ (یا حاکم اعلیٰ) ہوتے ہیں (جیسے جرمنی کا ذاتی اتحاد)

(۵) اتحاد حقیقی | ارتباط (متذکرہ بالا) کی صورت میں مختلف سلطنتیں زیادہ آزاد ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقی اتحاد اُسوقت ہوتا ہے جب مختلف سلطنتوں کے نظام حکومت کے ساتھ ساتھ متحدہ حکومت کا نظام حکومت بھی مکمل ہوتا ہے اور مرکزی حکومت کے حکمران کا خاص ملک بھی ہوتا ہے۔ اس کی مثال امریکہ

کی ریاستہائے متحدہ سے دی جا سکتی ہے یا سوئٹزرلینڈ اور روس کی جمہوری حکومتوں سے تمثیل پیش کی جا سکتی ہے۔ متحدہ سلطنت ایسی صورت میں قطعی آزاد ہوتی ہے لیکن دیگر سلطنتیں بھی مثل آزاد سلطنتوں کے ہوتی ہیں اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کل سلطنتوں کی قومیں باقاعدہ متحد ہو کر ملتِ واحد بنجاتی ہیں۔

مخلوط سلطنتوں کے لوازم

مخلوط سلطنتوں میں ایک مرکزی یا متحدہ سلطنت ہوتی ہے جس کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ بیرونی سلطنتوں سے تعلقات قائم رکھے اور اُن معاملات کو جو دیگر ملتوں سے تعلق رکھتے ہیں سلجھائے۔

وہ سلطنتیں جو آپس میں اتحاد قائم کرتی ہیں کسی بیرونی سلطنت سے کوئی تعلق نہیں پیدا کر سکتیں لیکن اندرونی انتظامات کا انحصار صرف اُن کی ذات پر ہوتا ہے اور مرکزی حکومت اُنمیں بہت کم دخل دیتی ہے۔

اس دوگونہ نظام سلطنت کو قائم رکھنے کے واسطے دو باتوں کی ضرورت ہے

۱۔ ہر ایک سلطنت (یعنی مرکزی سلطنت اور دیگر سلطنتوں) کی قوتوں کا فرق صاف طور پر ہونا چاہئے اور اُن کے فرائض کی تدوین نہایت ضروری ہے۔ تاکہ ایک دوسرے کے تعلقات میں جو باتیں عارض ہوں اُنکا تصفیہ نہایت آسانی سے ہو جائے۔

۲۔ حکومت اور مجالس کلا کا ایک دوسرے سے الگ اور آزاد ہونا ضروری ہے تاکہ سلطنت کے کاموں میں آسانی پیدا ہو۔ اور مستقل نظام قائم رہے۔

مقالہ ہشتم شہنشاہیت

تفصیل۔ شہنشاہیت ایک سلطنت کے دوسرے ممالک۔ دوسری سلطنتوں اور دوسری ملتوں پر قبضہ کا نام ہے۔ اس قبضے سے مفتوحہ ممالک کی ترقی کی باگ فاتح سلطنت کے ہاتھ میں آجاتی ہے فتح سے اس جگہ ہمارا منشا صرف بزور شمشیر ہی فتح کرنیکا نہیں ہے بلکہ کسی صورت سے بھی ایک ملت کا دوسری ملتوں پر سیاسی اقتدار قائم کرنے سے مراد ہے خواہ وہ عہد ناموں اور چارٹروں یا معاقیوں کی وجہ سے ہو یا فتح نو آبادی اور اپنی خواہش سے کوئی سلطنت مفتوح یا زیر حکومت غیر ہو جائے۔ شہنشاہیت کے متعلق دو قسم کے خیالات ہیں۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی رحمت اور تہذیب پھیلانیکا ذریعہ ہے۔ دوسرا فرقہ اسکو شیطنت اور ظالمانہ بوالہوسی سے تعبیر کرتا ہے۔

قدیم شہنشاہی

گذشتہ زمانہ میں کئی شہنشاہی سلطنتیں قائم تھیں جنکی مکمل تفصیل کرنا

فضول ہے۔ اختصار کے ساتھ چند ایسی سلطنتوں کا ذکر کر دینا اس وجہ سے ضروری ہے کہ بغیر گذشتہ شہنشاہیتوں کا مقابلہ کئے ہوئے ہم موجودہ شہنشاہیتوں کے طرزِ عمل کو نہیں سمجھ سکتے۔

یونان | یونان کی شہنشاہیت نے مفتوح اقوام کو اپنے اندر جذب کر کے ایک متحدہ ملت بنانے کی کوشش کی۔ اور جہاں کہیں بھی یونانیوں کی حکومت پھیلی وہاں انکا تمدن۔ تہذیب اور فلسفہ بھی پھیلا۔ اور محکوم اقوام پر بہت اچھا اثر پڑا۔ سکندرِ اعظم کے بعد یونانی شہنشاہیت بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی اور دور دراز کے صوبوں کو آزاد ہو جانے میں کچھ دقت نہ تھی۔ اس کے علاوہ سلطنت ایران نے یونان کی ترقی کے سیلاب کو مشرق میں بڑھنے سے روک دیا اور بہت جلد یونانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا۔

روما | رومتہ الکبریٰ نے عہد قدیم میں اپنی شہنشاہیت کو بہت زیادہ وسعت دی۔ اسی اصول پر موجودہ زمانہ میں مغربی سلطنتیں اپنی سلطنتوں کو وسیع کر رہی ہیں۔ رومیوں نے پہلے اطالیہ کے ایک ایک صوبہ کو اپنے قبضہ میں کیا اُسکے بعد اپنی آزادی کو قائم رکھنے اور اہل روما کی دولت کو ترقی دینے کے لئے ہمسایہ قوموں کو اپنے قبضہ میں لانا شروع کر دیا۔ اطالیہ کو محفوظ رکھنے کے لئے نمالیہ پر قبضہ کیا گیا اور نمالیہ کو قبضہ میں رکھنے کے لئے فرانس

اور جرمنی کی طرف فوجوں کا رُخ کر دیا گیا۔ اسی طرح رومیوں نے کارتھیج پر قبضہ کر کے اُسے محفوظ رکھنے کے لئے مصر پر اقتدار قائم کیا۔ بالکل اسی طرح سرکار کمپنی بہادر نے بنگال میں قدم جمانے کے بعد اُس کے محفوظ رکھنے کی یہ تدبیر کی کہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ پر قبضہ کیا اور اس صوبہ کو بچانے کے لئے پنجاب دبا لیا گیا اور صرف دریائے اٹک ہی تک اپنی سلطنت کو محدود نہیں رکھا گیا بلکہ وہ علاقہ بھی جو افغانستان کے زیر اثر ہے یعنی سرحدی صوبہ پر قبضہ کرنے کے بعد افغانستان کو اپنے معاہدوں سے تقریباً نیم آزاد سلطنت بنا دیا جو ۱۹۲۱ء کے معاہدے سے اب بالکل آزاد ہو گیا ہے)

رومیوں نے اپنی مفتوحہ صوبوں کے والیوں سے بہت زیادہ روپیہ طلب کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے وہ اپنی رعایا پر بہت زیادہ ظلم کر کے روپیہ وصول کرنے لگے۔ اور اپنے ذاتی خزانوں کو معمور کرنے کے بعد روما کو روپیہ روانہ ہونے کی عادت شروع ہو گئی۔ اس طرح مفتوح اقوام میں بہت زیادہ بےچینی شروع ہو گئی۔ رومیوں نے یہی نہیں کیا بلکہ اُن اقوام میں زبردستی رومی قانون اور تمدن جاری کرنا چاہا جو بہت زیادہ ناممکن تھا اس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے)

خلافت | زمانہ وسطیٰ میں اسلامی حکومت شہنشاہیت کے درجہ پر تھی اور اس کا اصول یہ نہ تھا کہ محکوم اقوام سے بالجبر روپیہ وصول کر کے مرکزی حکومت کو مضبوط کیا جائے یا خلیفہ وقت اور اُس کے مشیروں یا افواج اسلام کے لئے آرام

آسائش کے سامان محض اس بنا پر کمزور اقوام سے حاصل کئے جائیں کہ مسلمان طاقتور تھے مفتوح اقوام کو اپنا مذہبی قانون۔ اور رسم و رواج ہی نہیں بلکہ اپنی پنچایتیں بھی الگ قائم رکھنے کی اجازت تھی اور صرف اتنا ہی خراج وصول کیا جاتا تھا جتنا کہ مفتوح ہو جانے کے بعد اُس قوم سے طے ہو جاتا تھا غیر مسلم رعایا فوجی خدمت سے بری تھی اور اُس کی بجائے ایک ٹکس ادا کرتی تھی جسکو اصطلاح اسلام میں جزیہ کہتے ہیں

ہندوستان

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے جو شہنشاہیت قائم کی اُسمیں بھی ہندو اور مسلمانوں کی تفریق نہ تھی جو روپیہ ہندوستان سے وصول ہوتا تھا وہ اسی ملک کی بہبود و فلاح میں خرچ ہو جاتا تھا اور نہ ایسے قوانین کا اجرا کیا جاتا تھا۔ جو جمہور باشندگان ہند کے جذبات و خیالات کے منافی ہو یا جس سے کسی قسم کی تمدنی اور معاشی ترقی میں رکاوٹ ہو اس طرح مسلمان شہنشاہیتوں نے رفتہ رفتہ اپنے تہذیب و تمدن کو مشرق میں اپنے اخلاقی اثر سے پھیلایا اور بجائے اسکے مفتوح اقوام کو غلام بنائیں۔ اُسمیں حریت اور مساوات اسلامی کی روح پھونکدی

جدید شہنشاہی

موجودہ شہنشاہیت کے جغرافیائی حدود

موجودہ زمانہ میں یوروپین سلطنتوں کی شہنشاہیت عالمگیر ہو رہی ہے اور دنیا کے پانچ کروڑ تیس لاکھ مربع میل رقبہ میں سے صرف پچیس لاکھ مربع میل اُن کے اثر سے محفوظ ہے۔ سیاسیات

اور تاریخ کو اس عظیم الشان علمی تحریک کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ یورپ کی اس تحریک سے دنیا میں کیا اثر پیدا ہوا۔

شہنشاہیت کی بنیاد

شہنشاہیت کی ترقی اور وسعت دو وجہوں سے ہوئی ایک معاشی (یا دوسرے الفاظ میں تجارتی) اور دوسرے فوجی۔ ان دونوں وجوہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

معاشی وجوہ

دخانی قوت کے جاری ہوتے ہی ذرائع آمد و رفت۔ رسل و رسائل میں اتنی آسانی ہو گئی کہ ایک سلطنت دنیا کی دور دراز سلطنتوں پر نہ صرف تجارتی قبضہ رکھ سکتی ہے بلکہ اُن پر سیاسی قبضہ بھی کر لینا اور قائم رکھنا نہایت آسان ہو گیا اس کے ساتھ ساتھ تجارتی دنیا میں بھی انقلاب عظیم پیدا ہو گیا اور یورپ کے ممالک قدرتی طور پر بحری تجارت میں حیرت انگیز ترقی کرنے لگے اور ان کی زندگی کا دار و مدار صرف تجارت ہی پر رہ گیا فرانس۔ جرمنی۔ امریکہ۔ انگلستان اور جاپان دنیا بھر کو ہر قسم کا سامان تجارت مہیا کرنے لگے۔ اس تجارتی مقابلہ سے مندرجہ ذیل نتائج پیدا ہونے ضروری تھے۔

(ا) خام پیداوار کی ضرورت

یورپ کی تجارت گاہوں کو خام پیداوار کی درآمد کی مسلسل ضرورت محسوس ہوئی تاکہ اُس سے تجارتی اشیاء تیار کر کے پھر اُنہیں ممالک میں روانہ کر دی جائیں جہاں اُن کی ضرورت ہے۔

(ب) بازاروں پر قبضہ

اُن ممالک پر جہاں اُن کے مال تجارت کی فروخت

کی اُمید بھی قبضہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور اگر ان ملکوں میں تہذیب تمدن اتنی ترقی پا چکا ہے کہ وہ خود خام اشیاء سے اپنی ضروریات زندگی مہیا کر لیتے ہیں تو اُن کو مسلسل کمزور کرنے اور تباہ کرنے کی کوشش کی گئی ایشیا اور افریقہ کے ممالک پر کسی نہ کسی بہانہ سے قبضہ کیا جانے لگا۔ اس طرح ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۰ء تک یوروپین سلطنتوں نے اسی لاکھ مربع میل زمین پر قبضہ کر لیا انگلستان نے برما اور مصر فرانس نے انام اور ٹوکن۔ تونس۔ مداغاسکر اور افریقہ میں وسیع رقبات زمین پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح دوسری یوروپین اقوام نے بھی اپنا اپنا حصہ پا یا۔

(ج) تجارتی راستوں پر قبضہ — بحری راستوں پر قبضہ کر لینا تجارت کے لئے نہایت ضروری ہے اور اسی لحاظ سے بعض ضروری مقاموں پر دول یورپ نے اپنا اپنا اقتدار قائم کرنا ضروری سمجھا ہے۔ عدن۔ سنگا پور اور پانا ما جزیرہ یاپ نہر سوئیز اور ابنائے قسطنطنیہ نہایت ضروری مقام ہو گئے ہیں۔

جنگی وجوہ — معاشی وجوہ کے علاوہ جنگی وجوہ بھی شہنشاہیت کی ترقی کا باعث ہوئے مختلف سلطنتوں کے لئے قرب وجوار کے ممالک پر اپنا اثر و اقتدار رکھنا ضروری ہو گیا۔ انگلستان کے لئے آئرلینڈ کا آزاد ہو جانا نہایت مہلک ہے۔ اسی طرح جاپان کا کوریا پر قبضہ رکھنا اُس کی آزادی کے لئے ضروری ہو گیا۔

(۱) زبردستی قبضہ — اس حکمت عملی کی ابتدا ہندوستان سے ہوئی۔ بنگال کی حفاظت کے لئے اودھ پر قبضہ کیا گیا۔ اور اودھ کو محفوظ رکھنے کے لئے پنجاب

کو دبالیا۔ اسی طرح افغانستان پر اگرچہ قبضہ نہ رہ سکا مگر معاہدوں کے ذریعہ سے اُسے نیم آزاد ملک بنادیا اور افغانستان کو کمزور کرنے کے لئے وسط ایشیا اور خلیج فارس میں ریشہ دوانیاں شروع کردی گئیں۔ اسی طرح شاہ تھیبا کے ملک کو چھین لیا گیا اور غریب برما اپنی آزادی محض اس بنا پر کھو بیٹھا کہ اُس نے فرانس سے تجارتی معاہدہ کیا تھا۔ لہذا انگریزوں کے لئے اس بہانہ سے اُس پر قبضہ کرنا ضروری ہو گیا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کسی ملک پر قبضہ کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے مثلاً فرانس نے الجیریا پر محض اس وجہ سے قبضہ کر لیا کہ وہاں کے حکمران نے فرانسوی گورنر کی توہین کی تھی۔ اسی طرح دو پادریوں کے قتل کی وجہ سے جرمنی نے سلطنت چین کے اندر تجارتی اور ملکی فوائد حاصل کر لئے۔

(ب) فوج کی ضرورت — یورپین اقوام نے اپنی شہنشاہیت کو اس وجہ سے اور ترقی دی کہ مفتوحہ ممالک کے آدمیوں کو فوج میں بھرتی کر کے اپنے ادنیٰ غلاموں کی طرح چند سکوں کے بدلے میں اپنی اغراض کے لئے جہاں چاہتے ہیں بھیج دیتے ہیں اور ان ہی سپاہیوں کے ذریعہ سے جو خود غلام ہیں دوسرے آزاد ممالک کو بھی غلام بنانے میں مدد لیتے ہیں۔ ہندوستان کے سپاہی اس طرح عرصہ سے کام میں لائے جا رہے ہیں۔ برما۔ عراق عرب۔ شام۔ افغانستان اور یورپ میں ہندوستان کے سپاہی اس خدمت کو انجام دے چکے ہیں اسی طرح فرانس اور جرمنی نے افریقہ کے سپاہیوں سے فائدہ اٹھایا ہے

قبضہ کا نیا طریقہ مندرجہ بالا طریقوں سے قبضہ کرنے کے علاوہ سب سے شائستہ طریقہ یہ ایجاد ہوا کہ کسی ملک کے محاصل و ذرائع آمدنی پر اس قرض کے سود کے بدلہ میں قبضہ کر لیا جاتا ہے جو اُن ممالک کو دیا جاتا ہے مثلاً ایران میں تمباکو کا ٹھیکہ ایک انگریز کمپنی نے لیلیا اور تمباکو کی گرانی نے ایرانیوں کو مجبور کیا کہ وہ بغاوت کریں اور اُس روپیہ کو جو شاہ نے بطور نذرانہ کے لیا تھا واپس لائیں اسی طرح سلطان عبدالعزیز نے اپنی عیاشی کی وجہ سے مقروض ہو کر مراکش کو فرانس کے قبضہ میں دیدیا۔ اور خدیو اسمٰعیل نے مصر کو انگریزوں کے زیر اثر صرف قرض ہی لیکر بنا دیا جو رفتہ رفتہ بالکل انگریزی قبضہ میں آگیا۔ مگر اس امر کو پورے طور پر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جتنے ممالک یورپ کے قبضہ میں آتے ہیں وہ دول یورپ کے آپس کے سمجھوتہ سے فتح کئے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی قوت کا توازن قائم رکھا جاتا ہے۔ مراکش پر فرانس کو اس وجہ سے قابض ہونیکا حق ،، حاصل ہوا کہ انگریز مصر پر اپنا اثر قائم کر چکے تھے۔ اسی طرح شام اور سلیشیا پر فرانس نے اور عراق عرب وغیرہ پر انگریزوں نے قبضہ کر کے توازن قوت قائم رکھا۔ اسی طرح افریقہ کے اندر ہزاروں لاکھوں مربع میل زمین پر وہاں کے سادہ لوح سرداروں کو دہوکہ دیکر کوڑیوں کے مول خرید لیا۔

شہنشاہیت کا ارتقا بہر حال مندرجہ بالا طریقوں سے شہنشاہیت کی ترقی ہوئی اور ہر قسم کے انسانوں پر قبضہ کیا گیا۔

(الف) غیر مہذب اقوام

(۱) اول وہ اقوام جو بالکل جاہل اور غیر مہذب تھیں۔ مثلاً افریقہ کے اندرونی اور جنوبی باشندگان جو یورپین تمدن کے مقابلہ میں بالکل کندۂ ناتراش تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا جو جانوروں اور غلاموں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ غلام کا مالک اُسکو اپنی ملک سمجھکر حتی الامکان محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر اُن مفتوح حبشیوں سے اتنا کام لیا جاتا ہے جو اُن کی طاقت سے باہر ہے اور جسکا یہ منشا ہے کہ جہانتک ممکن ہو ان کے ذریعہ سے روپیہ کمایا جائے اور اگر وہ فنا ہو جائیں تو اُن کی جگہ سفید رنگ والے آباد ہو جائیں شراب خانوں کی ترقی ہو رہی ہے افیون اور اسلحہ آزادی سے فروخت ہوتے ہیں اور بدکاری کے بڑھنے سے امراض کی ترقی ہو رہی ہے۔ اور ریل تار سڑکیں وغیرہ (جو خود تجارتی اور فوجی اغراض کے لئے ضروری ہیں) جاری کرکے یہ کہا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن میں ترقی کی جا رہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غلامی کا بدترین دور دوبارہ شروع ہوا ہے۔

(ب) مہذب اقوام

مغربی تہذیب کا اُن اقوام پر بہت کم اثر تھا جو بذات خود اپنی مخصوص تہذیب رکھتی تھیں۔ ہندوستان میں ہندو قوموں کی تعزلق اور پرانا طرز عمل اب تک باقی ہے۔ مصر، عرب اور ترکی ممالک اپنی پرانی تہذیب پر قائم ہیں۔ بخلاف اس کے کل مہذب اقوام مغربی دنیا کے خلاف سخت جدوجہد میں مشغول ہو گئی ہیں اور اپنی آزادی رسم و رواج اور تہذیب و شائستگی کے

قیام کے لئے کوشاں ہیں۔ ہندوستان۔ اور تقریباً کل ممالک مشرقی میں آزادی و خود اختیاری کے جذبات موجزن ہو رہے ہیں۔ اس تجدیدی تحریک کو شہنشاہی سلطنتوں نے زیادہ تیز کر دیا ہے

شہنشاہی طرز حکومت اگر میکیاولی زندہ ہوتا تو اُسے یہ دیکھکر نہایت ہی مسرت ہوتی کہ شہنشاہیت پسند سلطنتیں کس طرح اُس کے اصولوں کی پیروی کر رہی ہیں۔ مندرجہ ذیل طریقوں سے عموماً مفتوح اقوام پر حکومت کیجاتی ہے۔

(۱) **تقسیم** کوشش کیجاتی ہے کہ کسی ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا ہو جائے چونکہ اس مسئلہ کو رومیوں نے پہلے ہی مان لیا تھا کہ محکوموں کا اتحاد سلطنت کرنے والوں کے لئے مہلک ہے۔ لہذا ہندوستان میں ہندو مسلم نفاق۔ عراق میں شیعہ سُنی نفاق اسی طرح ہر مفتوح ملک میں باشندوں کے نفاق کے ذریعے حکومت کی جاتی ہے۔

(۲) **خطابات** ایسے لوگوں کو جو شہنشاہی اصولوں کی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں خطابات تمغے اور اسی قسم کے نام نہاد اعزاز دیکر حکومت کو مضبوط کیا جاتا ہے۔

(۳) **رئیسوں کو آزادی** وہ رئیس یا قبیلوں کے شیوخ یا ملک کے سربر آوردہ اور ذی اثر مذہبی پیشوا وغیرہ جو شہنشاہیت کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں اور بے چون و چرا کل احکامات کو مانتے ہیں اپنی ریاست یا قبیلہ یا جماعت پر آزادی سے جس قسم کی حکومت چاہیں کر سکتے ہیں اور شہنشاہیت اُن کی حفاظت اپنی فوج سے

کرتی ہے۔

(۴) سول سروس | سول سروس (یا حکام ملکی) عموماً اسی قوم کے ہوتے ہیں جو حاکم ہے۔ محکوم اقوام میں سے صرف معدودے چند افراد اس عزت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اس نسلی امتیاز کو حکومت کی شوکت اور خودغرضانہ ضروریات کے لحاظ سے قائم رکھا جاتا ہے۔

(۵) تعلیم و تبلیغ | محکوم اقوام کی تعلیم ایسی ہوتی ہے کہ وہ سوائے شہنشاہی نظام کے منشی بننے کے اور کوئی کام نہیں کرسکتے۔ علاوہ ازیں اُن لوگوں میں رفتہ رفتہ مندرجہ ذیل باتوں کی تبلیغ و اشاعت کیجاتی ہے جسے وہ خود اپنے اندر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ طریقہ بالکل نفسیات اور فطرت انسانی پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی

(الف) یہ کہ تم (یعنی محکوم اقوام) سلطنت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

(ب) تمہارے دماغ نہ تو سائنس میں ترقی کرسکتے ہیں نہ تجارت اور صنعت میں۔

(ج) موجودہ حکومت ہی سب حکومتوں سے بہتر ہے اور اتنی قوی ہے کہ کسی صورت سے آزادی یا اُن کی مساوات نہیں حاصل ہوسکتی۔ لہذا سوائے خوشامد کے چارہ نہیں ہے

مندرجہ بالا مضمون اگرچہ زیادہ طویل ہوگیا ہے۔ تاہم شاہنشاہیت کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی نے سفرنامہ شیخ الہند میں اپنے ذاتی تجربے سے جو باتیں لکھی ہیں وہ تاریخی حیثیت سے نہایت دلچسپ ہیں۔ چند اقتباسات

مضمون بالا کی تفصیل کے طور پر درج ذیل ہیں۔

مصر کی حالت

جیسے کہ مشرق کی آبادیاں عموماً اور اسلام کی خصوصاً مغرب کے ناپاک ہاتھوں
سے مدتوں سے ذبح ہو رہی ہیں اسی طرح مصر بھی ہے۔ ان آبادیوں میں جو ملک
زیادہ زرخیز ہوا، تجارتی یا صناعتی حیثیت سے اس کی اہمیت زیادہ ہوئی
سیاسی وقعت اس میں کچھ زیادہ پائی گئی، وہ بہت ہی مظلوم اور نہایت ہی
بے طرح اور بیدردی کے ساتھ ہلاک کیا گیا اس کے ہاتھ پیر ناک کان دل
و دماغ سب ہی علیحدہ علیحدہ اور ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ یورپ کو مثل پادشاہان
قدیم فقط ہوس ملک گیری ہی نہیں ہے۔ اس کی طمع پہلے پادشاہوں سے
صدہا گونہ زیادہ ہے وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ملک لیوے، وہ یہ بھی چاہتا ہے
کہ ہر محکمہ کی باگ اور ہر دائرہ کا حل و عقد اسکے ہاتھ میں ہو، وہ یہ بھی چاہتا ہے
کہ جملہ تجارتیں بھی ہضم کرے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جملہ صناعتیں بھی غپ کر جائے
وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جملہ ذرائع دولت خواہ معادن ہوں یا علمی کمپنیاں
سب اسی کے پاس ہوں وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تعلیم اور تہذیب اخلاق
ہر ملک کا اسکے زیر نظر اور اس کی رائے اور اس کے مفید طریقہ پر ہو۔ خواہ
ملک کے لئے مفید ہو یا نہ ہو۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ مذہب بھی ہر ملک کا اسی
کے قبضہ میں ہو اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دولت اور زراعت بھی اسی کے زیر تحویل ہو
اس کا مقصد یہ ہے کہ جملہ طرق خوشحالی اور جملہ شعبہائے ترقی اسی کے ہاتھ
میں ہوں۔ دوسری اقوام فقط غلامی کے اس درجہ پر رہیں جس سے وہ زندہ
رہ کر چوپاؤں کی طرح اس کی خدمت کر سکیں۔ بلکہ بعض جگہوں کے معاملات کو

یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ دوسری اقوام کی زندگی بھی نہیں چاہتا

محمد علی پاشا اور اس کی اولاد نے مصر کی ترقی کی نسبت بہت زیادہ ہمت اور کوشش سے کام لیا مگر یورپین فلک کو اسلامی اور مشرقی حکومت کا عروج کب گوارا تھا۔ اس نے ہمیشہ ایسے چکر دیئے کہ انسانیت اور تمدن کے نام پر مثل ایشیا وغیرہ مصر کو بھی بھینٹ چڑھنا پڑا۔ اس کا بھاری اور قیمتی بیڑہ بندرگاہ ناورین پر نہایت عدالت اور رعایت انصاف اور کمال انسانیت کی وجہ سے تمام برطانی امیر البحر نے ڈبو دیا۔ اُس کی فوجی قوت کو برٹش گورنمنٹ نے سلطان عبد الحمید سے صلح کرانے کی پالیسی میں نہایت کم اور کمزور کر دیا۔ اُس کا بڑا حصہ سوڈان کا جسکو مصری اور غیر مصری یعنی ہندوستانی فوجوں کے ذریعہ سے سوڈانی مسلمانوں کا خون بہا کر جب کہ وہ آزادی کے لئے کوشش کر رہے تھے فتح کیا گیا تھا اُس سے جدا کر کے خالص برطانی قرار دیدیا گیا۔ ارابی پاشا اور رعایا کو ایک طرف اور خدیوی کو دوسری طرف بھڑکایا گیا۔ اور آپس میں مصالحت و نیز محافظت تختِ خدیوی کی غرض سے مصر کی حمایت اور مداخلت کی نوبت آئی۔ اب ہم ان باتوں کو دوہرانا نہیں چاہتے۔ مصر کے نظام کو بہت ہی غیر منظم دکھلایا گیا۔ ہر ہر شعبہ میں ایک مستشار برطانی رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہر وزیر اور ہر بڑے افسر کے ساتھ ایک بہت بڑی تنخواہ والا مستشار برطانی رکھا گیا جس نے تمام امور کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مصری مسلمان افسر فقط صورت کا بُت اور کاٹھ کا اُلو رہ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مصر کی اصلی آبادی ۹/۱۰ مسلمان اور ۱/۱۰ قبطی عیسائی ہیں۔ اس لئے یہاں پر مختلف پالیسیوں کی ضرورت خیال کی گئی۔ عموماً محکموں میں عیسائی داخل کئے گئے۔ قبطی یا یونانی۔ اٹالین۔ فرنچ وغیرہ وغیرہ زرد

دے دیکر مٹوا لیئے گئے چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے محکمے ایسے ہوگئے جن میں مسلمان نام تک کو باقی نہ رہ گیا۔ پھر عیسائیوں کو اشتعال دی گئی کہ وہ مسلمان ملازموں پر اس قسم کے تشددات کریں جن کی وجہ سے وہ خود خارج ہو جائیں اور اگر نہ ہوں تو اُن پر جھوٹے سچے الزامات ایسے قائم کئے جائیں جن کی بنا پر ان کو علیحدہ کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے جیلخانہ کے محافظ سپاہیوں پر بھی ہیڈ کانسٹبل تک عیسائی اطالوی تھے جن کی تنخواہیں بھی۔ بڑی بڑی تھیں۔ ہتھیار تمام سکانِ مصر سے چھین لیے گئے اور انکا رکھنا جرم قرار دیدیا گیا لیسنس کے بغیر کوئی ادنی درجہ کا ہتھیار نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے تمام سکان مصر بے دست و پا اور چوڑی پہننے والی عورتوں جیسے ہوگئے جیسا کہ اہل ہند ہیں۔

امور تجارت میں بھی یہی معاملہ ہوا یونانی یا دیگر عیسائی اقوام کو ہر قسم کے ٹھیکے وغیرہ دلوا کر اور دوسرے طریقوں سے اعانتیں کرکے انکی تجارتوں کو فروغ دیا گیا جس کی بنا پر تمام مصر میں بڑا حصہ تجارت اور نیز کارخانوں وغیرہ کا یورپین افرنجی قوموں کے ہاتھ میں ہے۔

نفاق پھیلانے کی کوشش

مصریوں کے مذہبی جذبات کے کمزور کرنے کی بھی پوری کوشش عمل میں لائی گئی۔ ان میں بد دینی مختلف طریقوں اور ہر پہلو سے پھیلائی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہری اور متمول

لوگ بہت جلد آزاد خیال ہو گئے مگر ساتھ ہی اس کے اس طبقہ میں قومیت کا خیال یورپ کی بدقسمتی سے بہت زور کا پیدا ہو گیا۔ اصحاب ثروت لوگوں پر حکومت کی جانب سے دباؤ ڈال کر ان کو قومی افکار اور ملکی ترقی سے فقط روکا ہی نہیں گیا بلکہ ان کو حب وطنی کی مخالفت پر آمادہ کیا گیا اور ہر پہلو سے ان کے ذریعے مخالف کوشش عمل میں لائی گئی۔ اہل وطن میں اختلاف پھیلانے کی اسپرٹ نہایت زور سے بکھیری گئی۔ عام کاشتکاروں سے ایسی پالیسی اختیار کی گئی جس کی وجہ سے ان کو خاندان خدیوی اور مصری حکام سے سخت نفرت ہو گئی اور اسی کی ابتک کوشش کی جا رہی ہے۔ عام اہل شہر پر مصری چھوٹے حکام کے ذریعہ سے تشددات بیجا ہر معاملہ میں کرائے گئے۔ پھر اگر شکایت برٹش افسر تک پہنچ گئی تو ان پر مراحم خسروانہ برسائے گئے۔ مصری حکام کو تنبیہ کی گئی جس کی وجہ سے عوام کو یقین ہو گیا کہ برطانی حکام نہایت رحیم و عادل ہیں۔ جو کچھ مظالم ہم پر آئے دن ہوتے اور شدائد عمل میں آ رہی ہیں۔ وہ سب مصری حکام کی جانب سے ہیں۔ اسی کے قریب ہندوستان میں عمل میں آ رہا۔

انگریزی پالیسی ہمیشہ اور ہر ملک میں یہی رہی ہے کہ اہل ملک و وطن سے ہمیشہ مظالم کرائے جاویں تاکہ قوم میں نفاق و شقاق ہو رعایا پر رعب ہے قتل و قتال میں وہی آپس میں برباد ہوں۔ انہیں پر سد الزام رہے۔ ہم پاک دامن ستھرے بنے ہوئے سب کے خون چوستے رہیں۔ اگر ہم تک شکایت پہنچے تو

ہم اس سے بتری بظاہر کردیں۔ اس لئے یہی پالیسی مصر میں بھی اختیار کی گئی علاوہ اسکے اگر بڑے حکام ستم اور جبر کے طلبگار اور عادی نہ ہوں تو ممکن نہیں کہ چھوٹے حکام بڑے بڑے مظالم کریں سہ

بہ نیم بیضہ جو سلطان ستم روادارد   زنند لشکریانش کباب مرغ ہو سیخ

الغرض طرح طرح کے جال سے وہاں مسلمانوں اور اہل وطن کی قوتوں کے ملیامیٹ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ مصارف اس قدر بڑھا دئے گئے ہیں کہ آمدنی سے قرضہ ملکی کا ادا ہونا تو درکنار اس کا سود ہی سالانہ ادا ہونا مشکل اور دشوار ہوگیا ہے۔ پھر اگر کبھی کچھ جمع ہوگیا تو دور دراز ملکوں کی جائدادیں خرید دی گئیں جن کی حفاظت ہی کرنا مصر کو دشوار ہے اُن سے نفع اُٹھانا تو درکنار۔

اس کے علاوہ سیکڑوں پیچیدگیاں ڈالی گئی ہیں اور ڈالی جارہی ہیں جن سے ہم اپنے رسالہ کو ناپاک کرنا نہیں چاہتے۔

من حال دل زاہد با خلق نخواہم گفت
کیں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ"

بہترین سلطنت کونسی ہوسکتی ہے

اقسام حکومت و سلطنت کے بیان کرنے کے بعد اسکی ضرورت ہے کہ یہ بتایا جائے کہ مندرجہ بالا اقسام میں کسی طرز حکومت کو فضیلت دیا جائے۔ طوالت کے خوف سے ہم مختصراً صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ کسی خاص نظام سلطنت کو کل دنیا کے ملکوں کے لئے فائدہ مند اس وجہ سے نہیں کہا جا سکتا کہ بعض اقوام ایسے ممالک میں رہتی ہیں جو جغرافیائی حیثیت سے دوسرے ممالک پر فوقیت رکھتے ہیں اور بذات خود وہ اقوام دوسری اقوام سے ترقی یافتہ ہیں۔ لہذا ہر ایک ملک کا نظام سلطنت اگر ملکی اور تمدنی اعتبار سے ایسا ہو کہ سلطنت حقیقی معنوں میں ذی حیات ہستی کی طرح پورے طور پر ترقی کر سکے اور ملت کو کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی رکاوٹ نہ پیدا ہو تو وہ نظام خواہ جمہوری ہو یا بادشاہی موزوں کہا جا سکتا ہے۔

باب سابع

سلطنت کا عروج و زوال

تمہید

سلطنت کے عروج کا مسئلہ دو طریقوں سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ تاریخی دوسرا طریقہ فلسفی یعنی اول تو ہم کو ان اسباب پر غور کرنا چاہیئے جن سے حقیقتاً سلطنتوں کا عروج ہوا ہے۔ دوسرے تمام سلطنتوں کے اُن بنیادی اصولوں (قانون عدل) پر غور کرنا چاہیئے جن پر سلطنتوں کی ترقی کا انحصار ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ تاریخ کے متعلق ہے اور دوسرا فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قبل اسکے کہ ہم فلسفیانہ بحث شروع کریں ہمیں ملل عالم کے تاریخی تجربات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ابتدائی سلطنتوں کی بنیاد اسوقت پڑی جبکہ علم تاریخ کا نشان بھی موجود نہ تھا چونکہ تاریخ کی ابتدا اسوقت تک نہیں ہوئی جب تک کئی ملتوں نے سلطنتیں قائم کرکے انہیں ترقی نہیں دی اور علوم کی طرف توجہ نہیں شروع ہوئی یہودیوں کی سلطنت کے متعلق انکی مذہبی کتابیں کچھ معلومات بہم پہنچاتی ہیں لیکن وہ بھی اپنی سلطنت سے پہلے مصری حکومت کا موجود ہونا بتاتی ہیں اور غالباً ہندوستان اور فونیشیا کی سلطنتیں مصریوں کے لیے

نمونہ بنی تھیں۔ مگر اس کے متعلق ہندوؤں کی مذہبی کتابیں کچھ معلومات بہم نہیں پہنچاتیں۔

اس زمانہ سے اب تک تاریخ ہزاروں ملتوں کے عروج و زوال کو دیکھا ہے۔ یورپ کی سیکڑوں سلطنتیں صدیوں پہلے فنا ہو چکی ہیں۔ ایشیا اور مصر کی عظیم الشان سلطنتوں کا نام و نشان بھی موجود نہیں ہے۔ جو سلطنتیں اب قائم ہیں وہ اس زمانہ میں شروع ہوئی ہیں جسکا علم پورے طور پر تاریخ رکھتی ہے۔ اسمیں سے بعض بالکل کم عمر ہیں اور بعض کی بالکل ابتدا ہے لہذا وہ اثرات و اسباب جنکی وجہ سے یہ سلطنتیں قائم ہوئیں اور ہو رہی ہیں ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

سلطنت کے عروج کا سوال صرف تاریخی اور نفسی دلچسپی نہیں پیدا کرتا بلکہ یہ سلطنت کی زندگی پر ایسا اثر ڈالتا ہے جو برابر قائم رہتا ہے۔ اور یہ طرز ترقی دوسری سلطنتوں پر بھی خاص اثر ڈالتا ہے۔ قانون عامہ کے لیے سلطنتوں کی ترقی اور انکے ماخذ کا نظر غائر سے مطالعہ کرنا اسی وجہ سے نہایت ضروری ہے۔ اسی کے مقابلہ میں قانون شخصی کے لیے حصول مال کے مختلف ذرائع اور انکی اقسام کا مطالعہ اتنا ضروری نہیں ہے

مقالۂ اول اشکال تاریخی

عروج سلطنت کی تین تاریخی شکلیں ہو سکتی ہیں :-

شکل حقیقی ۱۔ سلطنت کی حقیقی صورت یا شکل اول یہ ہے کہ کسی ملک کے باشندے خود ایسی سلطنت قائم کر لیں جو کسی دوسری سلطنت سے ماخوذ نہو۔

شکل ثانوی ۲۔ سلطنت کی شکل ثانوی یہ ہے کہ ایسی سلطنت باشندگان ملک کی کوششوں کا نتیجہ تو ہوتی ہے۔ مگر اُس کی بنا ایسی سلطنتوں پر ہوتی ہے۔ جو اُس سے پہلے سے موجود ہیں۔ اور یہ سلطنتیں یا تو متحد ہو کر ایک نئی سلطنت قائم کر لیتی ہیں یا ایک ہی سلطنت کے کئی حصے الگ الگ آزاد سلطنت قائم کر لیتے ہیں۔

شکل ماخوذ (۳) سلطنت کی شکل ماخوذ یہ ہے۔ کہ اسکی بنیاد اور نشو و نما بجائے اندرونی کوششوں کے اُن اثرات سے ہوتی ہے جو دوسری سلطنتوں کے ذریعے اس ملت میں پہنچتے ہیں۔

اب ہم ان تینوں شکلوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔ مگر اس امر کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اگر یہ خیال کیا جائے کہ نظام حکومت کے تبدیل ہوتے ہی نئی سلطنت قائم ہو جاتی ہے تو یہ غلطی ہوگی بلکہ نظام کی تبدیلیاں اُسی سلطنت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں جسطرح رومتہ الکبرے میں پہلے سلطنت آئینی تھی بعدہٗ سلطنت شہنشاہی ہوئی مگر سلطنت وہی رہی یعنی طرز حکومت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ سلطنت میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ پرانی سلطنت

ترقی یا تنزل کر کے نئی صورت میں آ گئی ہے۔

۱۔ شکل حقیقی یا شکل اول

(الف) قطعی نئی سلطنت کی تنظیم — نئی سلطنت کے قیام کو روحتہ الکبریٰ کے قصہ معلوم کر سکتے ہیں جہاں مختلف نسلوں کے چند سرداروں کے ماتحت ایک نئی سلطنت کی بنیاد پڑی اور ابتدا ہی سے وہ بحیثیت ایک ملت کے نمودار ہوئے۔

(ب) سیاسی تنظیم — کسی ملک و قوم میں سیاسی تنظیم سے سلطنت کا ظہور ہو سکتا ہے اور سیاسی احساس کے پیدا ہوتے ہی ایک باقاعدہ نظام حکومت مرتب ہو جاتا ہے۔ جسکی تاریخی مثال جمہوریہ آئیسلینڈ سے دی جا سکتی ہے۔ ابتدا میں اس جگہ مختلف سرداروں کی بستیاں تھیں۔ اور سب علیحدہ علیحدہ قائم تھیں۔ لیکن ایک شخص کی تجویز کے مطابق ایک متحدہ مجلس قائم کی گئی۔ اور اس پورے جزیرہ کی آبادی ایک متحدہ ملت بن گئی۔ اسی طرح امریکہ میں سلطنت کیلیفورنیا کی بنیاد پڑی اس جگہ سونے کی تلاش میں ہر ملک و ملت کے آدمی جمع تھے جو آخرکار ۱۸۴۹ء ایک متحدہ مجلس قائم کر کے ملت واحد کی صورت میں تبدیل ہو گئے۔

(ج) کسی ملک پر قبضہ — اکثر ایسا ہوا ہے کہ ملت کی ترتیب کے بعد اس ملت نے بزور شمشیر کسی ملک پر قبضہ کیا۔ اسمیں شک نہیں کہ جنگ تباہ کن ہوتی ہے مگر سلطنتوں کے قیام پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے اس قسم کی سلطنتوں کی ابتدا میں قبائل مفتوحہ کی تنظیم میں سخت دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ یہودی سلطنت جب قائم ہوئی تو انہوں نے

بزورِ شمشیر باشندگانِ مفتوحہ کو فلسطین سے نکال باہر کیا۔ تاکہ اندرونی مشکلات کا سامنا نہ ہو۔ سکندر کا قول مشہور ہے "کہ فاتح حکم نافذ کرتا ہے اور مفتوح کو ماننا پڑتا ہے" یہ خیال عموماً ہر ایک جنگی قوم میں جاری ہے۔ جنگ ایک بین الملل مقدمہ سمجھا جاتا ہے اور فتحمندی کو فاتح قوم کے حق میں خدائی فیصلہ خیال کیا جاتا ہے۔ (لیکن مشرقی تخیل خصوصاً ہندوستان و جاپان میں یہ بات شروع ہو گئی ہے کہ بجائے جسمانی فتح کے روحانی فتح زیادہ عمدہ یا اور قابلِ تحسین ہے اور یہ کہ کسی ملت کو دوسری کمزور اقوام کی تہذیب کو خواہ وہ کتنی ہی ذلیل اور ابتدائی درجہ میں کیوں نہ ہو مٹا دینے کا حق نہیں ہے۔)

(۲) نوآبادی — نئی سرزمین میں کسی ملت کی سلطنت جداگانہ نوآبادی کے ذریعہ سے قائم ہو سکتی ہے۔ غیر آباد ممالک میں نوآبادیوں کا قیام نئی سلطنتوں کے ظہور کا باعث ہوتا ہے۔ ایسی سرزمین میں اگر وہاں کے اصلی باشندے نہیں تو نوآباد باشندوں کو اتنی دقت نہیں ہوتی جتنی کہ مفتوحہ ملک میں ہوتی ہے۔ مثلاً انگریزوں کو آسٹریلیا میں اتنی دقت نہیں پیش آئی جتنی کہ جنوبی افریقہ میں بوروں سے یا ہندوستان میں ہندوستانیوں سے

۲۔ اشکالِ ثانوی

سلطنتِ مرکب — دو یا دو سے زیادہ سلطنتیں مل کر ایک سلطنت مرکب قائم کر سکتی ہیں اس کی وجہ یا تو ایک دوسرے کی کمزوری ہوتی ہے یا ایک مضبوط ملت کے قیام کا خیال غالب ہوتا ہے۔ افرادِ ملت کے باہمی اتحاد سے نہیں بلکہ سلطنتوں کے باہمی اتفاق سے اس قسم کی مرکب سلطنت قائم ہوتی ہے۔ اس قسم کا باہمی معاہدہ یونان قدیم کی مختلف سلطنتوں میں بنا اور فی زمانہ قفقاز و ممالک متحدہ امریکہ وغیرہ سے

اسکی مثال دی جاسکتی ہے۔ مگر اس مرکب سلطنت کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔

(الف) ارتباط | کئی سلطنتوں کے سیاسی ارتباط سے کم از کم ظاہری یکجہتی معلوم ہوتی ہے اور ایک بین الملل سلطنت معلوم ہوتی ہے۔ تاہم یہ سلطنت واحد نہیں ہوتی۔ ایسی مربوط سلطنتوں کا انتظام یا تو ایک سلطنت کے سپرد کردیا جاتا ہے جو حیثیت صدر کے کام کرتی ہے یا مجلس وکلا کے سپرد ہوتا ہے۔ جو ہر سلطنت سے منتخب ہوتے ہیں۔ ایسی صورت سوئٹزرلینڈ میں ۱۸۴۸ء تک رہی۔

(ب) اتحاد | سلطنتوں کے اتحاد میں نہ تو انتظام کسی خاص سلطنت کے سپرد ہوتا ہے نہ کسی مجلس وکلا کے سپرد یہ کام ہوتا ہے۔ بلکہ کل سلطنتوں کی ایک ہی متحدہ سلطنت پیدا ہوجاتی ہے اس قسم کی سلطنت ممالک متحدہ امریکہ کی ہے۔ اور ۱۸۴۸ء سے سوئٹزرلینڈ نے بھی اسی طرزِ عمل کو اختیار کرلیا ہے۔

۲۔ اتحاد | کسی ایک حاکم کے ماتحت یا بالکل نئی سلطنت کے قیام کی صورت میں دو یا دو سے زیادہ سلطنتوں کا اتحاد قائم ہوتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

(الف) شخصی اتحاد | شخصی اتحاد غیر مکمل اتحاد کو کہتے ہیں۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ایک ہی شخص کو وراثتاً دو مختلف سلطنتوں کی حکومت پہنچی ہے۔ ایسا اتحاد اسی وقت تک رہتا ہے جب تک یہ وارث تاج زندہ ہے۔ اس قسم کے اتحاد میں نہ تو نئی سلطنت پیدا ہوتی ہے اور نہ دونوں ملتوں سے ایک نئی ملت کا ظہور ہوتا ہے۔ صرف ایک بیرونی تعلق دو آزاد سلطنتوں کو متحدہ کردیتا ہے۔

(ب) اصلی اتحاد | شخصی اتحاد ایک قسم کا ارتباط ہے۔ اس سے بالاتر ارتباط کو اصلی اتحاد کہتے ہیں

اس میں نہ صرف حاکم اعلیٰ دہی شخص ہوتا ہے بلکہ کل سلطنتوں کی ایک حکومت اعلیٰ ہوتی ہے جو قانون جاری اور انتظام قائم کرتی ہے۔ شخصی اتحاد سے ترقی کرکے اصلی اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ ممالک متحدہ کی چھوٹی ریاستیں اگرچہ اپنا الگ نظام حکومت رکھتی ہیں مگر کل ریاستوں کی متحدہ سلطنت اصلی اتحاد کی صورت میں ہے اسکی مثال آسٹریا ہنگری کی متحدہ سلطنت سے دیجا سکتی ہے۔

(ج) اتحاد کامل | مختلف سلطنتوں کی علیحدگی کو دور کرکے سلطنت واحد قائم کردیتا ہے اور یہ سلطنت مرکب نہیں ہوتی بلکہ سلطنت واحد ہوتی ہے انگلستان اور سکاٹلینڈ کا شخصی اتحاد تھا لیکن ۱۷۰۷ء میں اتحاد کامل ہو گیا اور ۱۸۰۰ء میں آئرلینڈ بھی اس اتحاد میں لے لیا گیا۔

۳۔ تقسیم | متذکرہ بالا اتحاد کے مخالف نئی سلطنتوں کے قیام میں تقسیم سلطنت ہے ایک بڑی سلطنت منقسم ہو کر دو یا دو سے زیادہ سلطنتوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ اسکی تین خاص صورتیں ہیں۔

(الف) تقسیم ملی | تقسیم ملی اسوقت ہوتی ہے جب دو یا دو سے زیادہ قومیں ایک دوسرے سے اسطرح ملی ہوئی ہوتی ہیں کہ انکا ملک الگ الگ ہوتا ہے اور صرف ظاہری ارتباط ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں قوت ارتباط کی کمزوری یا حکومت خود مختاری کی خواہش ان سلطنتوں کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ اس طرح مغلیہ سلطنت کے آخری عہد میں مختلف صوبے اور ریاستیں جو ایک متحدہ سلطنت کی صورت میں تھیں الگ ہو گئیں

اسی طرح عثمانی حکومت سے عرب اور مصر نے علیحدگی اختیار کر لی اگرچہ اسمیں تھوڑا بہت نسلی امتیازات کو دخل ہے۔ اور اسی طرح ۱۸۳۰ء میں ہالینڈ سے بلجیم الگ ہوا۔

(ب) تقسیم از وراثت موجودہ تخیل سلطنت نے کسی سلطنت کو قابل تقسیم اُس صورت میں قرار نہیں دیا جب ایک ہی بادشاہ کی کئی اولادیں اُس سلطنت کو از منۂ وسطی کی طرح آپس میں تقسیم کر کے الگ الگ سلطنت قائم کرتی تھیں۔ اور اکثر ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ وراثتاً ایک سلطنت کے کئی ٹکڑے ہوجایا کرتے۔

(ج) اعلان آزادی تیسری قسم یہ ہے کہ سلطنت کا کوئی حصہ اعلان آزادی کر کے اپنی جداگانہ نئی سلطنت قائم کرلے جسطرح چین کے صوبے نے حال میں چینی سلطنت سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ مگر عموماً اس قسم کی علیحدگی طرفین کے لئے مضرت رساں ہوتی ہے۔ لیکن ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے آزاد ہو کر بہت کچھ ترقی کی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ یونان۔ بلغاریہ۔ سرویہ۔ بخارا اور وسط ایشیا کی متعدد سلطنتوں نے آزادی حاصل کر کے حیرت انگیز ترقی کی ہے لہذا اصول بالا میں یہ ترمیم کیجا سکتی ہے۔ کہ اُس حصۂ سلطنت کو علیحدگی کا حق حاصل ہے جسکے فطرتی اور لازمی حقوق کا حصول مرکزی سلطنت کے تعلق کی وجہ سے ممکن نہیں تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حصہ سلطنت آزاد ہو کر اپنی حفاظت کر سکتا ہے اور اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ حقیقی ضرورت اور بے انتہا مصیبت و ایثار کے بعد قوم آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ اور یہ حق صرف اُسوقت حاصل ہوسکتا ہے

پوری قوم بحیثیت مجموعی ہر شکل پر اخلاقی فتحیابی حاصل کرے

ذرائع آزادی | فطری حقوق انسانی کو ملتے ہوئے یعنی حیات ۔ آزادی اور اپنی مسرت کی کوشش عموماً موجودہ ذرایع انسانی اور قومی آزادی کے لئے استعمال کئے جانے ضروری ہیں ۔

(۸) معاشی ترقی | کسی قوم کو آزادی (سیاسی) حاصل کرنے سے پہلے اقتصادی و معاشی آزادی حاصل کرنی ضروری ہے ۔ جب تک صنعت و حرفت ۔ تجارت و زراعت میں کوئی ملک اپنے قدرتی ذرایع کے انتہائی درجہ تک ترقی حاصل نہ کرلے یا اُس میں اس ترقی کا عام احساس نہ پیدا کردیا جائے ۔ سیاسی آزادی ناممکن ہے لہذا معاشی آزادی سیاسی آزادی کا پیش خیمہ ہے ۔

(ب) اخلاقی ترقی | اخلاقی ترقی کسی قوم میں جب ہی ہوسکتی ہے جب وہ قوم کافی تعلیمی ترقی حاصل کرلے ۔ اور اپنی قومیت کا احساس پیدا کرنا تعلیم پر منحصر ہے ۔ تعلیم سے ہمارا مقصد کالج یا مدرسوں کی تعلیم ہی سے مراد نہیں ہے ۔ بلکہ موجودہ زمانہ میں تبلیغ واشاعت خاص درجہ رکھتی ہے ۔ تعلیم کے بعد اخلاقی و دماغی ترقی جب ہی ہوگی جب حقیقی تعلیم دی جائے اور جب قوم اس حد تک بیدار ہوگئی ہو کہ سوائے قومی رواج و رسوم کے اجنبی اقوام کی صفات ذمیمہ کو یک لخت ترک کر کے اخلاقی آزادی حاصل کرلے اس اخلاقی آزادی کو موجودہ تحریک ہند میں روحانی ترقی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

خودداری | اخلاقی آزادی کے لوازم میں دو باتیں ہیں جو خود بخود پیدا

ہو جاتی ہیں۔ اول۔ خود داری یعنی قومی عزت کا پاس و لحاظ اور حقوق کے چھینے جانے یا غصب ہونے پر اظہار نفرت و حقارت کا پیدا ہونا ضروری ہے ہر قوم و ملت میں یہ جذبۂ انسانی موجود ہوتا ہے۔ مگر عرصہ دراز کی غلامی و محکومی کے بعد یہ فطرتی جذبہ مردہ ہو جاتا ہے۔ افریقہ کی اقوام میں صدیوں کی غلامی سے خودداری و عزت قومی کو قطعی نابود کر دیا ہے۔ بخلاف اس کے آئرلینڈ۔ مصر۔ ہندوستان عرب اور وسط ایشیا کی اقوام میں یہ پاک جذبہ کم و بیش موجود ہے۔

ایثار | ایثار یعنی انفرادی آزادی مسرت اور دولت کو قومی آزادی پر قربان کرنے کا مادہ بھی اخلاقی آزادی کے لوازم میں سے ہے۔ اور بغیر قربانی و مصیبت و تکلیف اُٹھائے (کسی قوم کی آزادی تو بہت بڑی چیز ہے) دنیا میں معمولی کام بھی سر انجام نہیں ہوتے۔

جذبۂ بے غرضی | حصول آزادی کی جنگ میں پوری قوم کی یکجہتی ضروری ہے مگر یہ یکجہتی بے غرضی کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ عموماً وہ لوگ بھی جو آزادی کے مخالف ہوتے ہیں زبانی ایسی تحریکوں میں ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ اُنکا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ آزادی کے لیے ہماری ذاتی حقوق کو صدمہ نہ پہنچے۔ یا رائے عامہ کے اثر سے مغلوب ہو کر ایسا کرتے ہیں۔ عموماً یہ طبقہ اپنے آپ کو اعتدال پسند کہتا ہے اور خود غرضی سے ایسی تجاویز پیش کرتا ہے جسمیں اُسکا ذاتی فائدہ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ درحقیقت قومی آزادی میں سخت رخنہ انداز طبقہ ہے اور جب تک اپنی ذاتی اغراض و مفاد کو چھوڑ کر قومی بے غرض یکجہتی و اتحاد نہ قائم کرے اور جمہور قوم کی رائے پر عمل شروع

کیا جائے قومی آزادی کے حصول میں دیر ہوگی اور مشکلات بڑھتی جائینگی۔

اشکال ماخوذ

۱۔ نوآبادی (الف) یونان۔ قدیم یونانیوں کی نوآبادیاں ایشیائے کوچک۔ اطالیہ اور صقلیہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ نوآبادیاں بالکل نئی سلطنتیں قائم کرلیتی تھیں اور اگرچہ مرکزی حکومت سے آزاد ہوتی تھیں مگر یونانی تمدن تہذیب اور رسم ورواج کی پابند ہوتی تھیں۔

(ب) اہل روما۔ رومی نوآبادیاں سلطنت مرکزی کا ایک جزو سمجھی جاتی تھیں اور دارالسلطنت پر اُن کا دارومدار رہتا تھا یعنی رومتہ الکبریٰ مرکز حکومت ہوتا تھا یہ نو سلطنتیں نہ ہوتی تھیں بلکہ سلطنت رومی سے متعلق رہتی تھیں۔

(ج) موجودہ۔ موجودہ زمانہ میں بھی نوآبادیاں رومی نوآبادیوں کی طرح مرکز سلطنت کا ایک جزو سمجھی جاتی ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کی نوآبادیاں زیادہ تر مرکزی حکومت سے آزاد رہیں اور آزاد ہوتی جاتی ہیں۔

عطیہ حقوق شاہی۔ حکومت خود اختیاری کے حقوق کا عطیہ بھی سلطنت ماخوذ کی بنا ڈال سکتا ہے۔ اس کے حقوق ومراعات شاہانہ رفتہ رفتہ کسی ملک کو آزاد حکومت قائم کرنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔ آئرلینڈ نے اپنی جدوجہد سے رفتہ رفتہ اتنے حقوق حاصل کیے کہ اب آزاد سلطنت کے نام سے موسوم ہے اور اُمید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں قطعی آزاد سلطنت قائم کرلے۔

۲۔ اجنبی حاکم (یا بادشاہ) کی سلطنت گری۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بادشاہ اپنی خواہش کے مطابق کئی ملتوں کو ملا کر ایک سلطنت بناوے جیسا کہ نپولین نے

یورپ میں کیا تھا۔ مگر یہ صورت دیر پا نہیں ہوتی اور قوت ترکیبی کی کمی ہوتے ہی ایسی سلطنت ٹوٹ جاتی ہے۔

مقالہ دوم سلطنتوں کا زوال

تاریخ شاہد ہے کہ ہر قوم و ملت۔ عروج کے بعد زوال کا ہونا اسی طرح ضروری ہے جیسے طلوع کے بعد سورج کا غروب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح انفرادی تیں مختلف اسباب و علل کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں اسی طرح سلطنتوں کا زوال بھی مختلف وجوہ سے ہوتا ہے۔ مگر چونکہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایک سلطنت زوال پذیر ہو لہذا ممکن ہے کہ ہم عام وجہ بھی معلوم کر سکیں یہ کہنا کہ سلطنت میں نظام کی خرابی اور اخلاقی ابتری کی وجہ سے زوال پیدا ہوتا ہے ایسا موجود ہے غلط ہے کہ اکثر عرصہ دراز تک خراب حکومت اور بداخلاقی بعض سلطنتوں میں پھیلی رہی مگر اُن کا زوال نہیں ہوا۔ نہ یہ قول صحیح ہے کہ مخلوط النسل اقوام کی سلطنت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ اس اختلاط نسل سے بہت سی سلطنتیں مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ اور انگلستان وغیرہ بہت زیادہ طاقتور ہو گئی ہیں۔ حقیقی سبب زوال یہ ہے کہ زندگی کے لئے قدرتاً موت ہونا ضروری ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ شکّی سے شکّی انسان بھی اس کا منکر نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سلطنت ایک ذی حیات ہستی کی مانند ہے لہذا اُس کے لئے کبھی نہ کبھی موت یا زوال کا ہونا بھی ضروری ہے اور ہر قوم اپنا مقصد حیات پورا کر کے پردۂ فنا میں منہ چھپا لیتی ہے۔

انسان کی ترقی جاری ہے۔ لہذا کسی خاص سلطنت میں اُسے اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایسی عظیم الشان عالمگیر سلطنت جس میں کل دنیا شامل ہے قائم ہو جائے

اُسوقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سلطنت اُسوقت تک باقی رہیگی جب تک نسل انسانی کو بقا ہے۔

اکثر ایک سلطنت کے زوال پذیر سے ہی نئی سلطنت کا عروج ہوتا ہے۔ لہٰذا زوال سلطنت کے اسباب خصوصی درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ملی بدنظمی بغاوت | امن و انتظام کی ضد شورش و بغاوت ہے۔ ایسی حالت میں ہر شخص جو چاہتا ہے کرتا ہے اور قانون کی پابندی نہیں کیجاتی سلطنت موجودہ تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔ لیکن بغاوت کا زمانہ عرصہ دراز تک قائم نہیں رہتا تھا۔ آریہ نسل میں یہ خصوصیت ہے کہ جب وہ شورش و بغاوت کی حالت میں ہوتے ہیں اُسوقت بھی وہ خاص قانون کے پابند ہوتے ہیں اور اپنے سخت سے سخت رہنماؤں کی اندھا دھند پیروی کرتے ہیں۔ نشہ حریت سے سرشار انسانوں کے پیچھے کسی نہ کسی ایسے سخت دور میں تجربہ کار رہنما کی صورت نظر آتی ہے جس کی عوام پرستش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور پرانی سلطنت کی بنیاد پر نئی سلطنت کا ڈھانچا جوش و خروش سے کھڑا کیا جاتا ہے جو بعض اوقات گذشتہ نظام سلطنت سے بھی خراب ہوتا ہے۔

۲۔ ہجرت | اکثر کسی حصہ سلطنت کی آبادی کا دوسری سلطنتوں میں ہجرت کرجانا اُس سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔ ہسپانیہ سے تمام مسلمان باشندوں کے نکل جانے سے وہاں کی زراعت کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا۔ اسی طرح ایران سے پارسیوں کے چلے جانے سے وہاں کی تجارت و حرفت خراب ہوگئی لیکن ایسی مہاجر قوموں کو دوسرے ملکوں میں مشکل سے نئی سلطنت قائم کرنیکی قوت ہوتی ہے۔

۳- فتح: کسی ملک کی فتح یا کسی ملت کا مفتوح ہو جانا زیادہ تر نئی سلطنت کی بنا ڈالنے کے بجائے پرانی سلطنت کے مٹانے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ فاتح سلطنت کا رقبہ وسیع ہو جاتا ہے اور کمزور اقوام کی فرمانبرداری بظاہر انکی رضامندی کی وجہ سے سمجھی جاتی ہے۔ مگر درحقیقت یہ فرمانبرداری مجبوراً اور جبریہ ہوتی ہے۔ اور ایسے ناپاک افراد شاذ و نادر ہوتے ہیں جو اپنی ہستی کو مٹا کر یا اپنی تہذیب کے بہتر ہوتے ہوئے دوسری قوم کے مفتوح ہونے پر فخر کریں۔

۴- انجذاب بالارادہ: کئی سلطنتوں کے باہمی اتحاد سے جب ایسی نئی سلطنت قائم ہو کہ وہ سلطنتیں اپنی ہستی مٹادیں تو اس کو انجذاب بالارادہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ سلطنتیں جان بوجھ کے اپنے ارادہ سے اپنی ہستی کو بڑی سلطنت کی ہستی میں فنا کر کے اسی میں جذب ہو جاتی ہیں۔

۵- علیحدگی بالارادہ یا بجبر: انجذاب کی ضد علیحدگی ہے جس میں یا تو ایک بڑی سلطنت بالارادہ کئی حصوں میں تقسیم ہو کر زوال پزیر ہو جاتی ہے۔ یا کوئی بیرونی طاقت اس کے حصے بخرے کر دیتی ہے سلطنت عثمانیہ۔ پولینڈ اور طرابلس کے اسی طرح جبریہ حصے کیئے گئے جس سے سلطنتوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس قسم کی غیر منصفانہ قوت کا ایسے زمانہ میں استعمال سخت دلخراش اور ہولناک ہے۔ متذکرۃ الذکر صورتیں علیحدگی بالجبر کی مثالیں ہیں۔

۶- شاہی حقوق و مراعات کی واپسی: جس طرح شاہی حقوق و مراعات کے ملنے سے نئی سلطنتوں کا قیام ہو سکتا ہے اسی طرح ان سلطنتوں سے وہ

حقوق ومراعات چھین لیے جانے کے بعد اُن کی آزادی بھی جاتی رہتی ہے
اور سلطنت فنا ہو جاتی ہے ۔

مقالۂ سوم نظریات فلسفہ

۱۔ فطری حالت

(۱) من مانہ زریں — فلسفی اکثر یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کی ابتدائی حالت میں کوئی سلطنت نہ تھی۔ اور رفتہ رفتہ سلطنتیں قائم ہوئیں عوام کا گمان ہے کہ دنیا اُس قدیم زمانہ میں بہشت کا نمونہ تھی جس میں نہ تو تکلیف تھی نہ ظلم وستم کا نام ونشان تھا۔ ایک مسرت ابدی میں ہر شخص اپنی پرامن زندگی بسر کرتا تھا۔ اور چونکہ ہر شخص جتنا چاہے مال ودولت جمع کر سکتا تھا لہٰذا کوئی شخص ذاتی ملکیت رکھنے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ چونکہ ہر شخص مساوی حقوق رکھتا تھا لہٰذا نہ تو امرا کا طبقہ تھا نہ غربا کی جماعت تھی۔ نہ تو حاکم تھے نہ محکوم نہ منصف تھے نہ قاضی نہ فوج تھی نہ ٹکس۔ غرضکہ ایسی حالت تھی کہ یہ قول صادق آتا تھا ؎

"بہشت آنجا کہ آزارے نباشد۔ کسے را باکسے کارے نباشد"

ایسی حالت کے مقابلہ میں سلطنت کا قیام حرص وآز کی وجہ سے ہوا انسان مال ودولت کی طمع میں پڑ گیا اور قاضیوں کی۔ فوجوں کی۔ اور فوج کی وجہ سے ٹکسوں کی ضرورت ہوئی اور دنیا میں دولت کی وجہ سے برائیوں کی ابتدا ہوئی۔ اس طرح سلطنت ایسی بری چیز تھی جو بیان سے باہر ہے۔

فطری حالت میں جنگ ضروری ہے — ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کسی طرح فطری حالت میں انسان ایک دوسرے سے جنگ کرنے پر مجبور تھا۔ اس طرح سلطنت اگرچہ ایک خراب حالت تھی تاہم سلطنت کا نہ ہونا اس سے بھی خراب ثابت ہوتا

چونکہ انسان پر امن زندگی بسر کرنا ہی نہ جانتا تھا۔

دونوں خیالوں کی کمزوری — دونوں خیال انسانی فطرت کے سیاسی اور مدنی پہلو کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ ارسطو نے ہزاروں برس پہلے اس خیال کو اس طرح ظاہر کیا کہ انسان فطرتاً سیاسی حیوان ہے۔ سلطنت قائم کرنے سے پہلے ہم انسان کے کسی نہ کسی قسم کے اجتماع کا خیال کر سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسی حالت میں انسانی فطرت کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ سلطنت کا قیام اس لیئے ضروری ہوا اور اسطرح سلطنت کبھی باعث خرابی نہیں ہوسکتا۔

۲۔ سلطنت بحیثیت نظام الٰہی

خدا کی براہ راست حکومت — سلطنت کا الٰہی نظام ہونا ہر زمانہ میں کئی طرح سمجھا گیا ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ خدا براہ راست حکومت کرتا ہے۔ ایسی حالت یہودی حکومت کی تھی۔

خدا کی بالواسطہ حکومت — دوسرا خیال یہ ہے کہ سلطنت کا حقیقی حاکم خدا ہے اور وہ اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعہ سے اپنی مرضی حاکمان دنیوی پر ظاہر کرتا رہتا ہے۔ خواہ وہ کسی مندر کے پجاری ہوں۔ یا کسی اور طریقہ سے اس امر کا ادعا کرتے ہوں کہ انہیں الہام ہوتا ہے۔ گویا خدا حاکم حقیقی ہے۔

مگر اُس کی حکومت کاہنوں یا مذہبی طبقہ کے ذریعے سے (بالواسطہ) ہوتی ہے۔ یا خدا کسی نہ کسی طرح ان حکام یا بادشاہوں کا حامی رہتا ہے جو سلطنت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ تخیل نہایت شاندار ہے اور سلطنتوں کے عروج و زوال کو براہ راست خدائی احکام کی پابندی سے متعلق کرتا ہے لیکن ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ یہ خیال ایک خاص مذہبی طبقہ کا ہے۔ اور سیاسی فطرتِ انسانی کو فراموش کئے ہوئے ہے اس سے مندرجہ ذیل خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

۱۔ بادشاہی حکومت | چونکہ خدا مثل بادشاہ کے حکومت کرتا ہے لہٰذا دوسری قسم کی سلطنتیں مثلاً آئینی و جمہوری بُری نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اور بادشاہی حکومت پسند کیجاتی ہے۔ اور اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ انسان اپنی خواہش و ضروریات کے مطابق جیسی حکومت چاہے بنالے۔

۲۔ بادشاہ مثل خدائی نمایندے کے | بادشاہ کو خدا کا دنیاوی جانشین یا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اُس کے افعال منجانب اللہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ شرک نہایت حماقت پر مبنی ہے۔ اور خدا کی طاقت کا انسان کو شریک سمجھنا اُسکو ایسی جگہ دیتا ہے جس کے وہ ہرگز قابل نہیں ہے۔

۳۔ الٰہی احکام | جو احکام بادشاہ کی طرف سے جاری کئے جائیں وہ احکام الٰہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس صورت میں انسانی قوّت تمیز و قوّت ارادی سلطنت میں کچھ دخل نہیں رہتا۔

۴۔ غیر ذمہ داری چونکہ اُن کا حق خدا کی طرف سے سمجھا جاتا ہے لہذا بادشاہ جو کچھ بھی بھلائی بُرائی کریں اُس کے ذمہ دار خدا کے سامنے ہیں۔ انسان کے سامنے کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس قوت کے حاصل ہوتے ہی بادشاہوں میں مطلق العنانی پیدا ہوئی اور مشرقی اقوام میں عموماً مسئلہ تقدیر نے زور پکڑا۔ مسلمانوں نے اس مسئلہ کی سند قرآن شریف کی اس آیت سے کی جس میں خیر و شر کو اللہ کی طرف سے ہونا بتایا گیا ہے۔

جبر و قدر مسلمان فلاسفروں کے اس مسئلہ پر دو گروہ ہو گئے اور اس کا سلطنت اسلامی پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک فرقہ جبریہ ہو گیا اور ایک قدریہ۔ ایک فرقہ کا یہ عقیدہ ہوا کہ جب خیر و شر کا اندازہ ازل سے مقرر ہو گیا ہے تو انسان مجبور محض ہے اور جو کچھ قسمت کر دیا گیا وہی ظہور میں آئیگا اس کے خلاف لاکھ تدبیر کیجائے کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہو سکتا۔ دوسرا فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ انسان قطعی مجبور نہیں بلکہ ہر فعل پر قادر ہے اور اُس کو ہر کام کے کرنے کا اختیار ہے۔ یہ فرقہ متذکرہ بالا فرقہ کا انتہائی مخالف فرقہ ہے۔

دونوں کی کمزوری حقیقت یہ ہے کہ خدا نے ہر چیز کے متعلق ازل سے ایک اندازہ (قدر) مقرر کر دیا ہے جس سے نہ وہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ گھٹ سکتی ہے۔ آگ کے لئے جلانا۔ وزنی اشیاء کے لئے زمین کی طرف رجوع ہونا غرضکہ ہر چیز افعال و خواص خواہ طبعی ہوں یا کیمیائی ازل سے مقرر کئے جا چکے ہیں۔ جو چیز بھی

خواہ وہ بھلی ہو یا بری (یہ ہمارے خیال پر منحصر ہے) اپنی فطرت پر قائم ہے۔ اُس کو تبدیل
کرنیکا انسان کو اختیار نہیں ہے۔ مگر انسان کو یہ اختیار ہے کہ اُن کا استعمال اپنی ضرورت
و خواہش کے مطابق جیسا چاہے کرے۔ اپنے ارادوں میں انسان کا اختیار کامل حاصل ہے
مگر اشیائے عالم کے خیر و شر کے دور کرنیکا اُسکو اختیار نہیں ہے۔ لہذا اگر انسان یہ چاہے
کہ قوانین قدرت کو توڑ دے تو یہ ناممکن ہے ہاں اُن قوانین کے ماتحت جو چاہے
وہ کر سکتا ہے حضرت علیؓ نے اس کو کیا خوب سمجھایا ہے کہ انسان اگر چاہے کہ اپنا ایک پیر
زمین سے اُٹھا لے تو یہ ممکن ہے مگر دونوں پیروں کا اُٹھانا (چونکہ فطرت کے خلاف ہے)
ناممکن ہے۔ اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان کسی حد تک قادر بھی ہے اور
کسی حد تک مجبور بھی۔ مسئلہ تقدیر نے مشرقی اقوام میں ایک استقلال پیدا کر دیا ہے۔
...بھی کہہ سکتے ہیں۔ نہایت اطمینان سے (ہر شخص جو تقدیر پر بھروسہ کرتا ہے) ہیاری
... اور رنج کو برداشت کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہی قسمت میں تھا یہاں تک
...ت کی بھی پروا نہیں کیجاتی۔

۳۔ نظریہ طاقت

جسکی لاٹھی اُس کی بھینس | اکثر مطلق العنان بادشاہوں کا یہ خیال ہے اور
بعض فلاسفر بھی متفق ہیں کہ سلطنت تلوار کے زور سے قائم ہوتی ہے۔ یہ نظریہ مطلق العنان
بادشاہوں کے لئے موزوں ہے اور کمزوروں کو فنا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے

اس اصول کو سامنے رکھکر ہر قسم کا جور و ظلم جائز بتایا جاتا ہے۔

تاریخ کی شہادت کہا جاتا ہے کہ تاریخ اس خیال کی تائید کرتی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ قوت و تلوار سے جتنی سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اُتنی معاہدہ وغیرہ سے قائم نہیں ہوئیں۔ لیکن جنگ زیادہ تر کسی قوم کے حق کو قائم کرتی ہے اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ صرف قوت بہیمیہ سے نئی سلطنت قائم کیجائے اور وہ جلد فنا نہ ہوجائے لیکن جہاں کہیں صرف قوت کا استعمال کیا جاتا ہے وہاں یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ بجائے قیام سلطنت کے کسی نہ کسی سلطنت کی تباہی ضرور ہوتی ہے۔ اور جبتک اخلاقی فتح حاصل نہو کوئی قوم مفتوح نہیں ہوتی۔

اس نظریہ کو مان کر ذاتی آزادی۔حق اور قانون کا خیال قائم نہیں ہوسکتا۔ اس خیال کے ماننے کے لئے ضروری ہے کہ آقا اور غلام کو مانا جائے اس طرح آزاد آدمی سے صرف آزاد کردہ آدمی مراد ہوسکتا ہے۔ اسی طرح حق اور قانون کے لئے اخلاقی اور روحانی بنیاد کی ضرورت ہے۔صرف قوت بہیمیہ کی بنیاد پر حق و قانون جاری نہیں ہوسکتے۔

بہرحال اس خیال میں یہ ایک خوبی ہے کہ سلطنت کے ایک ضروری عنصر یعنی قوت اندرونی زندگی اور بیرونی حملوں کی مدافعت کے واسطے ضروری ہے۔ اور اسکا استعمال اگر انصاف و حق کے واسطے کیا جائے تو جائز ہے مگر بغیر حق کے کسی شخص یا قوم کے خلاف قوت کا استعمال ظلم و بہیمیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

۴- اجتماعی معاہدہ

اس نظریہ کا اثر

روسو کے زمانہ سے یہ نظریہ بہت مقبول ہوا ہے کہ سلطنت کا قیام انسانوں کے آپس کے معاہدہ سے ہوتا ہے اس خیال میں ہر شخص مست تھا اور ہر شخص کسی قدر مغرور بھی تھا کہ میں بانی سلطنت ہوں یا کم از کم میری کوشش کی کسی قدر ضرورت سلطنت گری میں محسوس ہوئی ہے۔ اس وجہ سے یہ نظریہ عام طور پر مقبول ہوا۔ انقلاب فرانس میں یہ خیال سب فرانسیسیوں کے دلوں میں جاگزیں ہوگیا تھا۔ اور اسی کی بنا پر پرانے طرز و آئین کو توڑ ڈالا گیا۔ اور ایسی سلطنت قائم کرنیکی کوشش کی گئی جو ہر شخص کی خواہش و مرضی کے مطابق ہو۔ جس طرح اس نظریہ سے انقلاب کرنا جائز ہوگیا اُسی طرح بعض فلسفیوں نے اجتماعی معاہدہ کا اصول یہ بتایا ہے کہ ایسا معاہدہ کرنیوالے صرف مطلق العنان شخصی حکومت قائم کرسکتے ہیں یعنی اپنی کل قوت اور حقوق ایک ہی انسان (بادشاہ) کے سپرد کرکے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ تاہم یہ نظریہ جور و ظلم کو جائز نہیں سمجھتا اور خصوصیت کے ساتھ قلیل التعداد اقوام کے حقوق کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔

تاریخی شہادت

اس نظریہ کی بنیاد تاریخ پر بتائی جاتی ہے لیکن سلطنت کے قیام کے بعد ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ افراد ملت کا معاہدہ مسلسل تازہ ہوتا رہے اور اسی تجدید معاہدہ پر بقا و قیام سلطنت کا انحصار ہے لیکن تاریخ سے بہت کم ایسی شہادت مہیا ہوتی ہے جو یہ بتائے کہ [illegible] کے معاہدہ سے سلطنت قائم ہوئی ہو۔ البتہ ایسا ہوا ہے

کہ ایک سلطنت دوسری سلطنت سے معاہدہ کرکے نئی سلطنت قائم کرلے ۔ یا کچھ سردار اپنے پیرووں کی جمعیت کے ساتھ آپس میں معاہدہ کرکے سلطنت کی بناڈالیں بخلاف اسکے یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر کسی سلطنت کا فرد ہوتا ہے اور اپنی قوت ارادی کے اظہار کی قابلیت پیدا کرنے سے پہلے اپنے ملک وملت کی خصوصیات کو ترقی دیتا ہے ۔ یہ خیال غلط ہے کہ کل افراد قوم وملت کی رائے سے سلطنت کا نظام بنتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر نظام سلطنت (خواہ کتنا ہی جمہوری کیوں نہو) افراد قوم کی تعداد کثیرہ کے خیال کا خاکہ ہوتا ہے ۔ اور تعداد قلیل کی رائے کی پروا نہیں کیجاتی ۔

یہ نظریہ غیر منطقی ہے | اس نظریہ سے ہر شخص آزاد اور مساوی ہے لیکن سلطنت قطعی مساوات کی حالت میں قائم نہیں ہو سکتی ۔ وجہ یہ ہے کہ سلطنت میں سیاسی مساوات اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک حاکم ومحکوم کا فرق نہ بتا دیا جائے اگر اس فرق کو مٹا یا جائے تو سلطنت کی ہستی ہی مٹ جاتی ہے ۔

علاوہ اسکے سیاسی آزادی اُسوقت تسلیم کی جاسکتی ہے جب سلطنت قائم ہوگئی ہو ۔ بغیر سلطنت کے آزادی کا دعوی سیاسی آزادی کا مترادف نہیں ہو سکتا لہذا سیاسی آزادی جب ہی مانی جاسکتی ہے جب سلطنت قائم ہوچکی ہو ۔ اور بحیثیت مجموعی آزاد ہو ۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ صرف افراد انسانی کے معاہدے سے نہ تو ملت بن سکتی ہے اور نہ سلطنت قائم ہو سکتی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ مختلف اشخاص کی انفرادی رایوں کے مجموعہ کو رائے عامہ نہیں کہتے اور افراد کے معاہدوں سے حقوق عامہ پیدا ہو سکتے ہیں ۔ اُنکے آپس کے معاہدے صرف ذاتی حقوق کی بناڈال سکتے ہیں ۔

سچائی کی جھلک اگرچہ یہ نظریہ قانون عامہ کے تخیل کو فنا کر کے غیر آئینی تحریکوں کو جائز بناتا ہے اور سلطنت کے نظام کو انسانی رائے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہنے کو برا نہیں سمجھتا بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے لیکن تاہم اس میں اتنی حقیقت کی جھلک ہے کہ یہ سلطنت کو بالکل قدرت کی کارستانی نہیں سمجھتا بلکہ انسانی قوت ارادی کو سلطنت کے نظام کے بنانے اور اس پر اثر ڈالنے کی وجہ خیال کرتا ہے۔

۵۔ انسان کی قدرتی مدنیت اور سیاسی حس کی تحریک

سلطنت کا عروج سلطنتوں کا عروج مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ مگر ہم صرف ایک ایسا سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں جو کل سلطنتوں میں موجود ہو۔ فطرت انسانی میں یہ بات پائی جاتی ہے جو باوجود اپنی نیرنگیوں کے ہر جگہ واحد ہے۔ اور ہر جگہ انسان مدنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ لہذا یہ داخلی خواہش اجتماع ترقی پا کر قوموں کو ملتوں کی صورت میں تبدیل کر دیتی ہے اور متحدہ زندگی کے خارجی نظام (یعنی سلطنت) کے بنانے کا باعث ہوتی ہے۔

سیاسی حس کا ارتقا یہ اجتماعی خواہش ابتدا میں محسوس نہیں ہوتی مگر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ کسی بہادر عقلمند اور عادل سردار کی قابلیتوں پر اعتماد کر کے افراد قوم کے سیاسی حس کو تحریک ہوتی ہے اور وہ سردار اس جماعت کی قوتوں اور قابلیتوں کا مرکز اور مظہر سمجھا جاتا ہے۔ تمدن و تہذیب کی ترقی ہوتی ہے اور ایک

ایسا زمانہ آتا ہے جب قوم کے خاص خاص افراد (یعنی سردار یا طبقہ خصوصی وغیرہ) سیاسی زندگی کو محسوس کر کے سلطنت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ حالانکہ عوام الناس جو زیادہ تر محکوم طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس سیاسی زندگی میں عملی حصہ نہیں لیتے یا اُن کو صرف احساس مجہول کے سوا کچھ زیادہ تجربہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ حس تدریج عوام الناس میں پورے طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ سیاسیات میں عملی اور مفید حصہ لینے لگتے ہیں

یہی نظریہ کامل ہو سکتا ہے

نظریات فلسفہ جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں اُن میں کوئی نہ کوئی کمی یا غلطی ضرور ہے۔ مگر یہ نظریہ حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اور متذکرہ بالا نظریات کی جتنی جائز اور حقیقی باتیں ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں اس نظریہ کے مطابق سلطنت بالواسطہ خدائی (یا مذہبی) سلطنت کہی جا سکتی ہے خدا ہی نے انسانی فطرت میں سیاسی حس پیدا کی اور اس طرح سلطنت گری کی طرف انسان کو رجوع کیا۔ گویا خدا نے خود سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح وہ لوگ جو صرف مذہب پر سلطنت کی بنا رکھتے ہیں بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں رکھتے چونکہ سلطنت کو فطرت انسانی سے متعلق ہونے میں ترقی کی زیادہ گنجائش ہے۔

علاوہ ازیں اس نظریہ میں مادی طاقت کو بھی سلطنت گری کے لئے ضروری سمجھا جا سکتا ہے۔ جو سلطنت کے قیام کے لئے نہایت ضروری ہے جبکہ یہ حقیقی قوت کی بنیاد فطرت انسانی کی خواہشات پر منحصر ہے۔

آخیر میں یہ نظریہ آزاد قوت ارادی کے عنصر کو بیکار نہیں سمجھتا بلکہ قیام سلطنت

کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اجتماعی معاہدہ کی صورت میں ہر فرد کی قوت ارادی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے مگر یہ نظریہ ملت یا سلطنت کی متحدہ قوت ارادی کو مانتا ہے۔ کسی قوم یا ملت کی عام قوتِ ارادی اُن کی انفرادی قوتِ ارادی کے مجموعہ کو نہیں کہتے۔ انفرادی ارادے خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں عام قوتِ ارادی نہیں کہے جاسکتے۔ دو آدمی ایک رائے ہو سکتے ہیں مگر اُن دونوں کی رائے کا مجموعہ دو ارادوں کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ہی ارادہ ہوگا۔ اسی وجہ سے خواہش (ارادہ) عامہ کو معاہدہ نہیں کہتے (چونکہ معاہدہ میں ہر شخص کی انفرادی خواہش علیحدہ علیحدہ رہتی ہے) بلکہ مستقل قواعد کی صورت میں اسے "قانون" کہتے ہیں۔ انتظامی پولیس کے لحاظ سے "خواہشِ عامہ" کو "حکم" اور "عدالت" کی کارروائی کے لئے "فیصلہ" کہتے ہیں۔ یہ سلطنت کے یہ مختلف شعبے جس میں اس کی مجموعی قوتِ ارادی اور خواہش عامہ کا اظہار ہوتا ہے اُس کے اعضا ہیں۔ ان اعضا کی بدولت سیاسی جسم کو حرکت ہوتی ہے اور وہ اپنے ارادوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

اس طرح سلطنت ایک ایسی چیز ہے جس سے سوائے فلاح و بہبودی کے کوئی دوسری بات نہیں پیدا ہو سکتی۔ اسی کی بدولت انسانی فطرت اپنی خواہش اتحاد و معاشرت کو پورا کرسکتی ہے اور کارہائے عامہ میں اسی کی وجہ سے نظام قائم ہو سکتا ہے۔

مقالہ چہارم انقلاب

ہر ایک ملت کو اپنے نظام سلطنت کے تبدیل کرنے اور اسمیں اصلاح و ترمیم کرنیکا حق حاصل ہے۔ اصل اصول کے ملنے سے پہلے اس امر کا ماننا ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ حکومت جو پوری ملت کے باہمی اتفاق سے قائم ہوچکی ہے ہر شخص کو اپنی اطاعت پر مجبور کرسکتی ہے۔ حکومت کی ترمیم و تنسیخ کا حق نہ تو قوم کے ایک حصہ کو حاصل ہوتا ہے نہ اس کی تعداد کثیرہ کو بلکہ یہ حق اُس ملت کامل کا ہے جو باقاعدہ اور منظم طریقے سے ملت کے درجہ تک پہنچ گئی ہو۔ اور ملی احکام کی پابندی ہر فرد پر لازم ہوتی ہے اگرچہ اس حکم سے فرد واحد کا ذاتی نقصان ہی کیوں نہو۔ ورنہ سلطنت کا اتحاد اور انتظام ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔

نظام سلطنت کی تبدیلی دو طرح سے ہوسکتی ہے۔ ایک اصلاح اور دوسرے انقلاب۔ ان دونوں صورتوں پر اخلاقی اور قانونی نقطہ ہائے نظر سے غور کرنا ضروری ہے۔

اصلاح اصلاح کا یہ منشا ہے کہ :۔

(الف) تبدیلی آئینی طریقوں کے خلاف نہیں ہوتی بلکہ قانون کی پابندی میں

کی جاتی ہے۔

(ب) تبدیلی آئین حکومت کے منشا سے مناسبت رکھتی ہے۔ (یعنی پرانے آئین صرف اس وقت بدلے جاتے ہیں جب وہ درحقیقت پرانے اور بیکار ہو گئے ہوں۔ اور نئے نظام سلطنت کو اُن کی جگہ اور اُن کے منشا کے مطابق جاری کیا جاتا ہے)

انقلاب اگر آئین کی ظاہری شکل اور منشا کو توڑ دیا جائے۔ اور ایسی تبدیلی کی جائے جو ان دونوں کے خلاف ہے تو اُسے اصلاح نہیں بلکہ انقلاب کہتے ہیں۔ اور انقلاب عموماً اُس وقت رونما ہوتا ہے جب اصلاح کے حق کو چھین لیا جاتا ہے یا اصلاحوں کے منشا کے مطابق ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔ جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ ارتقائے ملی کے فطرتی حق کو غصب کر لیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر انقلاب نہو تو یہ اُس ملت کی کمزوری کی دلیل ہے

انقلاب کرانیکا حق انتہا پسندوں کی رائے میں ہر ایک قوم و ملت کو انقلاب کرنیکا "حق" حاصل ہے۔ مگر یہ خیال قانون عامہ کے تخیل کے قطعی خلاف ہے۔ انقلاب نظام موجودہ یا اُس کے مقررہ اصولوں کے توڑنے کا نام ہے۔ لہذا قاعدہ کے مطابق انقلاب کرنا کسی کا حق نہیں ہے۔ اگرچہ یہ نہایت عظیم الشان قدرتی فعل ہوتا ہے۔ اور مختلف قومیں مشتعل ہو کر قانون مروجہ کو توڑ ڈالتی ہیں۔ اور عملی سیاسیات کے لئے ان انقلابی تحریکوں کو اپنی اصلی حالت پر لانا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

لیکن انقلاب بھی (اگرچہ کسی حق کی وجہ سے نہیں بلکہ مجبوری ہے) صرف ایک صورت میں جائز ہو جاتا ہے اور وہ صورت اُس وقت نمودار ہوتی ہے جب اصلاحات کا دروازہ قطعی بند کر دیا جاتا ہے۔ یا قلبی جذبات و خیالات کے مطابق اصلاحات نہیں کیجاتیں اور نہ اُن کے منشا کے مطابق ان پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں قومی و ملی ہستی معرض خطر میں ہوتی ہے۔ نظام حکومت اُس نظام کو کہتے ہیں جو ملت کے بیرونی نظام کو قائم رکھتا ہے اور اگر اس نظام سے خود سلطنت ہی تباہ ہو رہی ہو اور حقوق ملیہ غصب و برباد ہوئے ہوں تو انقلاب کا ہونا ضروری ہے۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ "ضرورت کسی قانون کی پابند نہیں ہوتی"

انقلاب کی خصوصیات (الف) فرقہ بندی انقلابات میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انقلابی تحریکوں کے بانی و رہنما اور اُن کے پیرو ایک ہی طبیعت کے ہوں یا عرصہ تک ایک ہی طرز عمل اختیار کرکے یکجہتی سے کام کرتے رہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ دوران انقلاب میں ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ مختلف انقلابی فرقے ہو جاتے ہیں۔ اور انقلاب کا مقصد بھی بعض اوقات تبدیل ہو جاتا ہے۔ زیادہ خرابی اُن لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو ذاتی فوائد کو مدنظر رکھکر انقلاب پسندوں کے زمرہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور اپنی بدطینتی سے تفرقہ اندازی شروع کر دیتے ہیں۔

(ب) باغیانہ خیالات سیاسی ترقی کے لئے باغیانہ خیالات کا عوام کے دلوں میں

جاگزیں ہو جانا۔ نہایت مضر ہوتا ہے۔ اور عرصہ تک اُن کی یہ کیفیت رہتی ہے
کہ اپنی آزادی اور قوت کے احساس کرنے کے بعد فطرۃً کسی کے قابو میں رہنا
پسند نہیں کرتے اور ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ سرکش۔ جاہل۔ اور غاصبان
حقوق ملتیہ کی بن آتی ہے اور انقلاب پسندوں کی تحریک کو بجائے فائدے
کے سخت نقصان پہنچا ہے

(ج) عارضی نظام | ممکن ہے کہ دوران انقلاب میں ایک عارضی نظام قائم
ہو جائے جس کی بنیاد وسیع سیاسی اصولوں اور ملکی ضرورتوں پر نہ ہو بلکہ کسی
فضول جذبہ یا جوش کے ماتحت ایک نمائشی اتحاد قائم ہو جائے۔ اور بغاوت
کو عرصہ تک قائم رہنے سے روک دے۔

(د) انکشاف حقیقت | اور یہ بھی ممکن ہے کہ انقلاب کے رہنما کوئی ایسی
حقیقت ظاہر کریں جسکا سلطنت پر دیرپا اثر ہو اور وہ حقانیت جو عرصہ تک
دوبارہ عالم وجود میں نہ آسکتی یکایک لوگوں کے سامنے نئی شان سے ظاہر ہو کر
اُسکا دلدادہ کر دے۔ موجودہ انقلاب ہندوستان میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو
اس طرح سے دوبارہ ملک کے سامنے آگئی ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے اُن کے
خیال کی بھی گنجائش نہ تھی مثلاً تحریک سودیشی۔ ملی تعلیم۔ اچھوت ذاتوں کی ترقی
ہندو مسلم اتحاد وغیرہ۔

(ہ) جان و مال کا خطرہ | ہر قوم و ملت میں ایسا طبقہ ضرور موجود ہوتا ہے

جو اپنی ذاتی اور ناجائز فائدہ کو مدنظر رکھتا ہے۔ اور اکثر قرب وجوار کی سلطنتوں کے بدمعاش بھی اس ہلڑ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جان و مال غیر محفوظ ہو جاتا ہے نہ مالگزاری وصول ہو سکتی ہے نہ فوجی نظام قائم رہتا ہے اور سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو قوم کے رہنما ہوتے ہیں وہ خود بڑی بڑی جانی و مالی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جو انقلاب ۱۸۵۷ء میں ہوا اور کل ہندوستان نے انگریزی کمپنی کی حکومت کو اپنے سروں سے اتار پھینکنے کا زور لگایا اُس وقت بھی جو رہنمایان انقلاب تھے (اگرچہ انہوں نے نہایت دلیری اور ایثار سے کام کیا) مگر اُن کی جان و مال بھی محفوظ نہ رہی۔

پرامن انقلاب ہندوستان دنیا میں پہلا ملک ہے جسمیں موجودہ زمانہ میں ایسے انقلاب کا خاکہ اقوام ہند کے سامنے پیش کیا گیا ہے جسمیں نہایت امن وسکون سے نظام حکومت کو تبدیل کیا جا سکے اور خونریز وسلح انقلاب کے بُرے اثرات نہ پیدا ہو سکیں۔ جنگ یورپ کے ختم ہونے کے بعد جو انقلاب عظیم ہندوستان میں رونما ہوا اُس کی تاریخی تفصیل بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ اس نئے (یعنی پُرامن) انقلاب کو آسانی سے سمجھا سکے۔

انگریزی حکومت کی ترقی سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ ہندوستان نہ تو مفتوح ملک ہے اور نہ نو آبادی ہے مسلمان بادشاہ اس حیثیت سے ہندوستان میں حکومت نہیں کرتے تھے کہ وہ غیر ملک کے باشندے اور اجنبی تھے

بلکہ وہ بحیثیت ہندوستانی کے یہاں تھے۔ اور ہندو مسلمان مساوات اور آزادی کے ساتھ سلطنت میں حصہ لیتے تھے۔ بخلاف اس کے انگریز قوم کے چند تاجر ۱۶۱۲ء میں ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کر کے تجارت کرنے لگے اور معافی کی زمینوں پر ان لوگوں نے اپنے قلعہ تعمیر کرنے شروع کئے۔ ۱۷۲۵ء تک انگریزوں کے پاس چار قلعے بمبئی مدراس کلکتہ اور ایس ڈیوڈ میں تھے۔ رفتہ رفتہ فرانسیسیوں اور انگریزوں نے ہندوستانی راجاؤں کی مدد فوج اور افسران فرنگی سے شروع کی۔ اور ہندوستانیوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا ۱۷۵۱ء میں ارکاٹ میں لارڈ کلائو نے مستقل انگریزی اقتدار قائم کر دیا اور وندواش (۱۷۶۰) کی لڑائی سے فرانسیسیوں کے قدم قطعی طور پر اکھڑ گئے اور ہندوستانی راجاؤں کو لڑا لڑا کے اپنی آراضی بڑھانے لگے۔ فتح کا نام و نشان بھی نہ تھا صرف عہدناموں کی رو سے ہندوستان میں انگریزوں کی عظمت کا دار مدار تھا۔ اور چارٹروں اور عہدناموں کی رو سے یہاں کے اکثر راجاؤں نے اپنے تمام حقوق انگریزوں کے حوالہ کر دئے تھے چونکہ کل عہدنامے ایک تجارتی کمپنی کی طرف سے ہوتے تھے اس وجہ سے زیادہ خیال دولت کمانیکا تھا اور فتح و شکست کی اتنی پروا نہ تھی۔

مساوات کا لحاظ کمپنی کے ۱۸۳۳ء کے چارٹر میں تحریر ہے کہ "کوئی باشندہ ہند یا ملک معظم کی کوئی رعایا جو ہندوستان میں ہو اپنے مذہب۔ جائے پیدائش۔ نسل یا رنگ کے لحاظ سے کمپنی مذکور کی ملازمت یا اعلیٰ عہدہ سے محروم نہ رکھی جائے گی۔"

اسی طرح ملکہ وکٹوریہ نے ۱۸۵۸ء میں کہا کہ "ہماری یہ خواہش مزید ہے کہ حتی الامکان ہماری رعایا کو خواہ وہ کسی نسل یا فرقہ کی ہو بغیر تفریق کے آزادی کے ساتھ ایسے عہدے دئے جائیں جنکو وہ اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے قرار واقعی انجام دے سکیں اور وہ یکساں مراعات کے مستحق ہیں،، انہی خیالات کا ۱۹۰۸ء میں ایڈورڈ ہفتم نے اظہار کیا۔ اور ۱۹۲۳ء تک کئی دفعہ انگریز اور ہندوستانی کی مساوات کا اعلان (خصوصاً لارڈ ریڈنگ کی زبان سے) کیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ لارڈ کرزن کہتے ہیں کہ "زیادہ تر جماعت چیدہ یوروپینوں کی ہونی چاہئے،، اور مسٹر لائڈ جارج فرماتے ہیں کہ "سول سروس ہندوستان کے نظام حکومت کا آہنی چوکھٹا ہے،، اور قانون اسلحہ۔ قانون مجالس باغیانہ،، اور اسی قسم کے دیگر قوانین بھی اس مساوات کا لحاظ کئے ہوتے ہوئے موجود ہیں۔ اور تحریک کانگرس کو باغیانہ تصور کئے جانیکے علاوہ یہ بھی دعوٰی ہے کہ ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ حکومت خود اختیاری دیجائیگی

انقلاب کی ابتدا (۱) تقسیم بنگال

لارڈ کرزن کے زمانہ میں یوروپین کو ہندوستانی پر بہت زیادہ ترجیح دیجانے لگی اور تقسیم بنگال نے ہندوستانیوں کو آزادی کا خواہشمند بنا دیا۔ اور آخرکار ۱۹۰۶ء میں کانگرس میں دادابھائی نوروجی صاحب نے حکومت خود اختیاری (سوراج) کا مطالبہ کیا۔ اور بنگال میں باقاعدہ قومی آزادی کا مطالبہ شروع ہوا۔ سیکڑوں آدمی جلاوطن اور جیل خانہ میں چلے گئے اور تمام سیاسی [illegible] گئے یہانتک کہ باریسال میں مذہبی جلوس تک بند کر دیے گئے

اور لارڈ ڈوارے نے اعلان کیا کہ تقسیم بنگال منسوخ نہیں ہو سکتی آخر کار اہل بنگال کی پُر استقلال جد و جہد نے ۱۹۱۱ء میں اُسے منسوخ کرا کے چھوڑا۔

(۲) **جنگ یورپ** جنگ یورپ میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے دوش بدوش کام کیا اور کافی سے زیادہ مالی امداد کی۔ مگر پھر بھی فوجی خدمات میں ہندوستانی اور انگریزی سپاہیوں کا درجہ مساوی نہیں کیا گیا اور نہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی طرح رضاکاروں کی فوجیں قائم کرنے کی اجازت ملی۔ جنگ کے بعد یہ اُمید کیجاتی تھی کہ ہندوستان کو کم از کم اندرونی آزادی ملجائے گی اور یہاں کی ملکی ملازمتیں اور فوج ہندوستانی وکلائے ملت کے قبضہ میں ہوگی۔ مگر اس سے بھی ناامیدی ہوئی اور چند ایسی اصلاحات دی گئیں جو صرف (بقول مسٹر لائڈ جارج) تجربہ کے طور پر ہندوستان میں کی گئی ہیں اور مالیات سے ہندوستانی نمائندگان کو پھر بھی الگ رکھا گیا ہے۔

۳۔ **اشتراکیین** ایشیائے وسطی اور رُوس میں اشتراکی تحریک کے باعث عام جذبہ مساوات پھیل گیا۔ اور اگرچہ ہندوستان کو حریت اور مساوات کے اثرات سے بچانے کی بہت کوشش کی گئی مگر یہاں کے جاہل ترین طبقہ کو بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اُس کا فطری حق سوراج ہے۔

۴۔ **واقعات پنجاب** پنجاب میں ۱۹۱۹ء میں غیر مسلح ہندوستانیوں (امرتسر جلیانوالہ باغ) پر (اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن میں چند گمراہ اور فسادی

لوگ بھی تھے) ایسے مظالم کئے گئے جو آج تک کسی ہندوستانی بادشاہ نے کسی قوم پر
کرنے جائز نہیں رکھے۔ صرف ظلم ہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ اتنا نفرت اور حقارت
انگیز سلوک کیا گیا کہ کل ہندوستان جذبۂ انتقام سے بھڑک اُٹھا۔ سمند ناز پر ایک
اور تازیانہ یہ ہوا کہ اُن لوگوں کو جنہوں نے مظالم پنجاب میں کافی حصہ لیا تھا۔
معقول پنشنیں دی گئیں اور سیکڑوں ہندوستانیوں کو جیل و جلاوطنی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۵۔ خلافت | مسئلہ خلافت نے مسلمانوں کو اُن کل اقوام کے خلاف مذہباً آمادہ
کردیا جو اُنکے اسلامی اور مذہبی نظام کو توڑنا چاہتے تھے اور اگرچہ فرانس۔ اطالیہ اور
دیگر ممالک معاہدہ سیورے کی ترمیم کرنا چاہتے تھے مگر مسٹر لائڈ جارج نے ہمیشہ ترکوں
کی مخالفت کی اور یونانیوں سے ترکوں کو لڑا کر اُنہیں کمزور بنادینا چاہا۔ اس طرز عمل
سے ہندوستانی مسلمان نہایت بددل اور ناراض ہوگئے اور آخرکار ہندوستان میں
ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اتفاق سے کانگرس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ انگریزی
حکومت ہند سے ہر ایک ہندوستانی کو علیحدگی اختیار کرلینی چاہئے اور اُنہیں کوئی
مدد نہ دینی چاہئے۔ اس میں بعد میں یہ اضافہ بھی ہوا کہ ملکی ترقی کے لئے صرف ملکی
اشیاء کو استعمال کیا جائے۔ یہ تحریک بنگال کی تحریک کی اصلاح شدہ صورت تھی

نتیجہ | اس انقلاب میں امن اور عدم التشدد پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے
یہی تخیل دنیا کے دیگر انقلابوں (مثلاً آئرلینڈ، روس، مصر، ٹرکی) سے مابہ الامتیاز
ہے۔ اور اس پُرامن انقلاب کے بانی اور رہنما اپنی آخری ضرب یعنی عام سول

با قاعدہ لڑائی سے فتح حاصل کرنے کی اُمید رکھتے ہیں۔ اور اس ضرب کے لگانے سے پہلے ترک موالات کے علاوہ مندرجہ ذیل پروگرام کو پورا کرنا چاہتے ہیں جسکے پورا ہونے کے لئے ابھی کافی زمانہ کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

(۱) سودیشی۔ (کھدّر اور چرخہ کو رواج دینا)

(۲) چھوت کا دور ہو جانا۔

(۳) ہندو مسلم اتفاق کامل۔

(۴) ایک کروڑ کانگریس کے ممبر جو اُسکے ہر حکم کو مان کر عمل شروع کر دیں۔

یہ پرامن انقلاب اگرچہ نہایت انوکھا اور زود اثر ہے اور اس طرز عمل سے چند آدمیوں کو یکجہتی کے ساتھ اکثر فتح بھی حاصل ہوئی (مثلاً مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ میں اور سکھ اکالیوں نے پنجاب میں) مگر حقیقت یہ ہے کہ انقلاب عرصہ دراز تک قائم نہیں رہ سکتا اور کسی وسیع ملک میں جس کی آبادی مختلف المذاہب اور مختلف النسل اقوام پر مشتمل ہو۔ ہرگز ایسی تحریک ترقی نہیں کر سکتی جسکا نظام عمل عرصہ دراز میں پورا ہونے والا ہو۔ یا عوام کے جوش کو قائم رکھنے کے لئے کوئی خاص طریقہ نہ اختیار کیا جائے۔[۹۵]

[۹۵] اسی لحاظ سے ایک نئی جماعت تیار ہوئی ہے جو گورنمنٹ کو کونسلوں میں داخل ہو کر شکست دینا چاہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کونسل ہی کے ذریعے کل قوانین جاری کئے جاتے ہیں لہذا اس کا مقابلہ ... یا بیکار ... سب سے زیادہ ضروری سمجھا گیا۔

انقلابِ روس

ہندوستان کے پُرامن انقلاب کے علاوہ ایک اور انقلاب یورپ سے شروع ہوکر تمام دنیا میں پھیل رہا ہے۔ یہ انقلاب روس ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا سے غلامی قانوناً مٹا دی گئی ہے مگر اُس غلامی سے زیادہ تکلیف دہ سخت اور بہیمانہ طرزِ عمل اُن غریبوں کے ساتھ کیا جارہا ہے جو ابتدائے عالم سے ابتک نیم آزاد زندگی بسر کررہے ہیں۔ نہ اُنہیں خوراک ملتی ہے نہ لباس کا سہارا ہے۔ حالانکہ یہی طبقہ کل دنیا کے اہلِ دولت کے آرام و آسائش کی فراہمی میں اپنی پوری کوشش اور زندگی صرف کردیتا ہے۔ یہ طبقہ مزدوروں اور کسانوں کا ہے۔

اشتراکیین

اشتراکی تحریک کو اجتماعی اصلاح کہا جاسکتا ہے۔ اشتراکیین کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ غریب و امیر کا فرق مٹ جائے اور حقیقی معنوں میں جمہوریت (حریت و مساوات) قائم ہو جائے۔ کارل مارکس۔ ٹولسٹائی اور لینن اس تحریک کے زبردست کارکن کہے جاسکتے ہیں۔ سرمایہ داروں کو تباہ و برباد کرنا اور مزدوروں کی اصلاح و ترقی کی کوشش عرصہ دراز سے ہو رہی تھی۔ مگر دنیا میں مزدوروں اور غریبوں کی دوسری[1] زبردست سلطنت ۷۔ نومبر ۱۹۱۷ء

[1] پہلی سلطنت جو حقیقی اصول حریت و مساوات پر قائم ہوئی اور جو صرف غریبوں ہی کے قوتِ اخلاق و بے لوث خدمات کا نتیجہ تھی۔ وہ جمہوریہ اسلامی تھی (بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۳ پر ملاحظہ ہو)

میں اشتراکی انقلاب کے بعد قائم ہوگئی۔ لینن صدر جمہوریہ اشتراکیین سوویٹ قرار پایا۔ اور سلطنت روس کی گذشتہ سلطنت کو کامل آزادی مل گئی۔ اور لینن کا مقصد وحید انسانیت کی بہبود اور فلاح ہی معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکی ترقی کے وجوہ	(۱) جنگ یورپ کے دوران میں زار روس کی حکومت

زیادہ سخت ہوگئی تھی اور جبریہ فوجی خدمت اور رشوت ستانی و تشدد کی وجہ سے جرائم کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی۔

(۲) شراب کی تجارت اور شرابنوشی کی کثرت ہوگئی تھی۔

(۳) کسانوں اور مزدوروں پر لگان اور رسوم اتنے بڑھ گئے تھے کہ ناقابل برداشت ہوگئے تھے۔

(۴) قومی تعلیم کے نظام کو ہر ممکن طریقے سے شکست دینے کی حکومت کی طرف سے کوشش کی گئی اور بہترین نوجوانان ملک کو جلاوطن کردیا گیا اور اسی سلسلہ میں نہ تو صحافت آزاد تھی اور نہ مجالس کی اجازت تھی۔

(۵) ظلم و ستم کی بنا سرمایہ داروں نے ڈالی تھی۔ جو خود تو کچھ محنت نہ کرتے تھے

(بقیہ نوٹ بسلسلہ صفحہ ۲۹۲ ملاحظہ ہو) ذاتی ملکیت اور سرمایہ داری کا تصفیہ نہایت سادہ اور فطرتی اصولوں سے کردیا گیا تھا۔ سود سرمایہ داری کی جڑ ہے جو حرام قرار دیا گیا اور سرمایہ داروں پر خاص انکم ٹیکس (زکاۃ) مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح موجودہ اشتراکی تحریک کی ابتدا اسلام نے کی تھی۔ اور دنیا میں اس کے عمدہ نتائج بھی ظاہر ہوگئے تھے ۱۲

مگر غریب مزدوروں کو دن رات فاقہ مستی میں بسر کرنا پڑتا تھا اور اس وجہ سے افلاس عالمگیر ہوگیا تھا۔

ذاتی ملکیت اشتراکی سلطنت قائم ہوتے ہی روس میں تقریباً ہر ایک چیز ملّی قبضہ میں آگئی۔ اور ذاتی ملکیت قانوناً ناجائز قرار دی گئی۔ کل اراضی۔ کارخانوں۔ کانوں اور مزدور گاہوں کو مشترک بنا لیا گیا اور ہر شخص کی تقریباً مساوی خوراک و لباس کا انتظام اس صورت سے کیا گیا کہ ہر شخص سلطنت سے اجرت لینے پر کام کرے اور انفرادی مال و دولت و ملکیت پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے دماغی و جسمانی محنت میں جو فرق تھا اُسے مٹا کر ہر کام کرنیوالے کا حق محنت مساوی کر دیا گیا۔ اس طرح سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں اور کارخانہ داروں کو مٹا دیا گیا اور اُس کے ساتھ ساتھ ذاتی ملکیت بھی غائب ہوگئی۔

اثرات اشتراک اس تحریک نے مزدوروں میں ایک نئی روح پیدا کر دی ہے اور حال میں ملک اٹلی میں اسی تحریک کی وجہ سے انقلاب ہوا اور اس کا اثر نہ صرف یورپ و ایشیا پر پڑا ہے بلکہ ہندوستان میں بھی جماعت مزدورین اپنے حقوق طلب کر رہی ہے۔ لیکن علم کی کمی کی وجہ سے جائز طریقوں سے کام لینے سے معذور ہے

باب ثامن

سلطنت کے داخلی و خارجی تعلقات

مقالہ اول استقلالیہ

اقسام سلطنت کے بیان کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ سلطنت خواہ کسی قسم کی ہو۔ لیکن اس کی ملت ایک متحدہ قوت وطاقت ہوتی ہے۔ اس قوت کے سامنے سلطنت کی ہر ایک قوت سر تسلیم خم کرتی ہے۔ جب یہ ملی قوت وطاقت جس سے بالاتر سلطنت میں کوئی طاقت نہیں ہوتی، سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے تو اسے استقلالیہ کہتے ہیں۔ ہم اس قوت کو آسانی سے بادشاہ کی غیر محدود قوت کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی مطلق العنان بادشاہ ہے وہ اپنی رعایا کی اخلاقی مدد یا اپنی قومی قوت یا اور مختلف قوتوں کے زور سے ہر قسم کا قانون نافذ کرسکتا ہے۔ اس بادشاہی قوت سے بالاتر کوئی قوت نہیں ہوتی اس قوت کو استقلالیہ (ریاست یشاہی طاقت) کہتے ہیں۔ ممالک اسلامیہ میں لفظ استقلال اس مخصوص معنی میں آجکل استعمال کیا جارہا ہے اور اردو زبان میں بھی رائج ہوچلا ہے۔ لہذا اس تخیل کے سمجھنے میں زیادہ دشواری ہوگی روسو نے نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے کہ استقلالیہ کسی ملت

کی عام قوت ارادی کے استعمال کا نام ہے۔ مگر یہ روسیو کی غلطی ہے۔ استقلالیہ کے حقیقی معنی کسی ملت کی متحدہ قوتِ قانون سے ہے۔ قوتِ ارادی کے ذریعہ سے عمل شروع ہوتا ہے۔ یعنی پہلے ارادہ ہوتا ہے اس کے بعد عمل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا قوتِ ارادی سے نفاذ قانون میں مدد مل سکتی ہے۔ مگر یہ بجائے خود قانون نہیں ہو سکتی چونکہ موجودہ زمانہ میں مطلق العنان سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے استقلالیت مطلقہ بالکل معدوم ہو گئی ہے اور ملی قوتوں کی وجہ سے استقلالیہ محدود ہو گئی ہے۔ استقلالیہ کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں۔

(۱) سلطنت کی یہ قوت غیر سلطنتوں کے اثر سے آزاد ہوتی ہے اور صرف قانون بین الدول یعنی اس قانون کو مانتی ہے جو عموماً مختلف سلطنتوں کے آپس کے مشورہ سے امن عالم یا مقاصد اخلاقی کے واسطے جاری ہوتا ہے اندرونی حکومت میں اس طاقت پر کسی خارجی سلطنت کا اثر نہیں ہوتا۔

(۲) اس طاقت کو ملت و سلطنت کی اعلیٰ ترین عظمت و جلال کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے یعنی سلطنت میں اس قوت سے بالاتر کوئی سیاسی طاقت نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر کوئی سلطنت کسی دوسری سلطنت کی اس طرح محتاج ہو کہ ہر چھوٹی بڑی بات میں اس کا مشورہ طلب کرے تو وہ ہرگز طاقت استقلالیہ نہیں رکھتی۔ عراق عرب کے قبائل اہل مصر اور قسطنطنیہ میں ترک اس آزادی کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جب تک مکمل اندرونی آزادی نہ حاصل

ان اقوام کو ملّی استقلال میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) استقلالیہ ایک عام حق ہے۔ یہ ملت کے جملہ حقوق پر حاوی اور سب سے الگ ہے۔ یہ حق مختلف حقوق کا مجموعہ نہیں کہا سکتا۔ قانون عامہ میں یہی مرکزی تخیل سمجھا جاتا ہے جس طرح نظامات حقوقیہ میں ملکیت مرکز ہوتی ہے۔

(۴) اس قوت کے مختلف ٹکڑے یا حصے کر دینا سلطنت کی یقینی تباہی کا باعث ہے۔ اس لئے اس قوت کے لئے وحدانیت نہایت ضروری ہے۔

استقلالیہ قوم یا استقلالیہ سلطنت

استقلالیہ کس کا حق ہے۔ قوم اسکا حق رکھتی ہے یا سلطنت؟ بعض مدبرین کا خیال ہے کہ یہ طاقت صرف بادشاہ استعمال کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں مطلق العنان شخصی سلطنت قائم ہو جاتی ہے لیکن اسپر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ بادشاہ کو رعایا کے جمہور حصے نے یا تو خوشی سے یہ طاقت ودیعت کر دی ہے۔ یا بادشاہ نے اپنی فوجی قوت سے کل رعایا کے اس حق کو جبراً حاصل کر لیا ہے۔

آئینی سلطنتوں کے شروع ہوتے ہی تخیل استقلالیہ زیادہ واضح اور وسیع ہو گیا۔ اور افراد ملت بھی اس طاقت کے حصہ دار ہو گئے بہرحال استقلالیہ کے متعلق دو خیالات ہیں۔

(۱) استقلال قوم

(الف) مجلس قومی میں

ایک خیال یہ ہے کہ کل قوم کو یہ طاقت استقلالیہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ مجلس قومی میں ہوں ایسی حالتیں جبکہ وہ مجلس قومی میں بیٹھے ہوں ہر فرد مجلس یہ طاقت رکھتا ہے مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ سلطنت جمہوری بلا واسطہ ہو یعنی مجالس قومی میں ہر فرد قوم حصہ لے سکے جس طرح یونان قدیم میں مختلف مدنی جمہوریتیں قائم تھیں اور ہر شخص براہ راست مجالس کا ممبر تھا لیکن چونکہ آجکل ایسی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ اس لئے کل قوم کا اس طرح استقلالیہ بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(ب) یہ حق افراد قوم کے مجموعہ کا ہے

روسو نے اس خیال کی ترویج کی اور انقلاب فرانس میں اس نے بہت قوت حاصل کر لی کہ قوم کے الگ الگ افراد کے مجموعہ کو (اگر وہ سلطنت قائم کر لیں) استقلالیت کا حق حاصل ہے۔ مگر کوئی سلطنت اسوقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایک باقاعدہ نظام میں ہر فرد قوم شامل نہو۔ لہٰذا ایسی بدنظمی اور اختلاف کی حالت میں عوام الناس کا ایک مجمع یا گروہ ہرگز استقلالیہ کا حق نہیں رکھتا اور نہ اسے جائز طریقے سے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ایسے حق کو تسلیم کر لیا جائے تو ایک عام بدنظمی اور غدر کی سی حالت قائم رہیگی اور سلطنت کا اتحاد بالکل معدوم ہو جائیگا۔

(۲) استقلالیت سلطنت

سلطنت کی ہستی ذی حیات۔ آزاد۔ اور صاحب عزت وقوت ہوتی ہے۔ یہ ہستی مختلف حصوں میں منقسم نہیں ہوتی بلکہ متحد ہوتی ہے[1] سلطنت ہی ملت کی اعلیٰ ترین قوت وطاقت کا استعمال کرتی ہے اور اس ملی قوت کو جو سلطنت کی صورت میں ظاہر ہو کر سلطنت کے مختلف شعبوں میں جاری کیجاتی ہے استقلالیہ کہتے ہیں۔ اس استقلالیت سلطنت کو استقلالیۂ قوم بھی کہہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ قوم وملت سے ہمارا یہ منشا ہو کہ یہ ایک باقاعدہ منتظم سیاسی ملت ہے۔ اگر قوم سے ہم یہ مراد لیں کہ یہ علیحدہ علیحدہ افراد کا (بقول روسو کے) مجموعہ ہے تو یہ حق ایسے غیر منتظم گروہ کو ہرگز نہیں مل سکتا۔

استقلالیہ بادشاہ اور مجلس ملیہ

موجودہ زمانہ میں چونکہ کل ملت کو حق استقلالیت حاصل ہے اس لئے اس کا استعمال مجلس ملیہ کے ذریعے کیا جاتا ہے جبکا صدر بعض سلطنتوں میں بادشاہ ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ استقلالیۂ بادشاہ اور استقلالیۂ سلطنت میں فرق ہے۔ یا یہ دو چیزیں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بادشاہ سلطنت کا سر ہوتا ہے اور مجلس ملیہ (جو کل ملت کی نمائندگی کرتی ہے) بدن کی مانند ہے یعنی بادشاہ اور مجلس ملیہ

[1] سلطنت کا مفصل ذکر کسی گذشتہ باب میں کیا گیا ہے۔

دسر اور بدن) ملکر پورا جسم بنتا ہے۔ لہذا بادشاہ کا سلطنت سے جنگ کرنا یا سلطنت کے مفاد کے خلاف عمل کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ سر اپنے بدن سے جنگ کرے۔ جو قطعی ناممکن ہے۔ اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو سلطنت میں انقلاب ہوگا اور ایسی حالت پیدا ہو جائیگی جس میں بادشاہ اور رعایا میں اختلاف نہ باقی رہے۔

تجزیہ استقلالیہ سلطنت

اس قوت کے مختلف پہلو یا ضروری جزو جن سے یہ مکمل ہوتی ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) عظمت۔ قوتِ استقلالیہ کو پوری ملت کی مجموعی شوکت وعظمت کا حق حاصل ہے۔

(۲) آزادی۔ بیرونی سلطنتوں کے اثر سے اس قوت کا آزاد ہونا ضروری ہے

(۳) اختیار تبدیل حکومت۔ استقلالیت سلطنت کو اپنی سلطنت کا نظام حکومت پسند کرنے اور اس کے تبدیل کرنیکا حق ہوتا ہے

(۴) قانون سازی۔ معمولاً قانون سازی کے ذریعے سے قوتِ استقلالیہ کا اظہار ہوتا ہے۔

(۵) مرکز قوت۔ سلطنت کی ہر ایک قوت کا انحصار اسی طاقت پر ہوتا ہے یعنی یہ سلطنت کی کل قوتوں کا مرکز ہوتی ہے اور سلطنت کی کل قوتیں استقلالیہ

کے ماتحت ہوتی ہیں۔ اور سلطنت کی ہر ایک طاقت استقلالیہ کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے۔

(۶) **غیر ذمہ داری۔** قوتِ استقلالیہ صرف خدا کے سامنے اپنے افعال اور اعمال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ یا تاریخ خود اس کے متعلق فیصلہ کر دیتی ہے کہ یہ قوت قائم رہے یا فنا ہو جائے قانون بین الدول بھی اس قوت کو کسی قدر محدود کر رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ابھی ایسا کوئی قانون نہیں بنا جسے کسی سلطنت کی استقلالیہ موقع پانے پر نہ توڑ سکتی ہو۔ لہذا یہ قوت (یا بالفاظ دیگر کل قوم یا اس کا نمائندہ) اپنی سلطنت کے اندر کسی طاقت کے سامنے جوابدہ نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اس طاقت سے بالاتر طاقت کا وجود تخیل استقلالیہ کے منافی ہے۔

حکومت استقلالیہ کا اپنی قوت کو حکومت کے ذریعے سلطنت کے اندر ظاہر کرتی ہے۔ اور سلطنت سے باہر تعلقات خارجی قائم کرنے میں مثل فرد واحد کے عمل کرتی ہے۔ ان دونوں افعال استقلالیہ کو ہم آئندہ دو فصلوں میں مجملاً بیان کریں گے۔

مقالہ دوم انتظام حکومت

انتظام حکومت اور آئین سلطنت

اگر انتظام حکومت کے وسیع معنی لئے جائیں تو اسے سلطنت کی اس قوت ارادی کو کہیں گے جسکا اظہار افراد ملت پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ افراد حاکم ہوں یا محکوم ہوں۔ یہ قوت ہمیشہ آئین سلطنت کے احکام اور فیصلوں (یا قراردوں) کی صورت میں منضبط ہوتی ہے۔ آئین سلطنت سے ہماری مراد اُن تمام تعلقات سے ہے جنکے ذریعے سے سلطنت کی قوتِ ارادی متحدہ طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً قانون اور اسکا اجرا تعلیم جماعات اور تقرر ملازمین وغیرہ۔ بخلاف اس کے انتظام حکومت اُن تعلقات کے مجموعہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے سلطنت کی منضبط اور جمع شدہ قوت انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ ابتدا میں انتظام حکومت اور آئین سلطنت کا یہ فرق محض خیالی معلوم ہوتا ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ امتیاز بالا فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ "رسوم (ٹکس) سلطنت کی طاقت سے مقرر ہوتی ہیں یا نہیں،" آئین سلطنت سے متعلق ہے۔ مگر رسوم کی تقسیم (خواہ وہ بالواسطہ

ہوں یا بلاواسطہ) انتظام حکومت سے متعلق ہے۔

انتظام حکومت کی چار بڑی قسمیں کیجا سکتی ہیں۔

۱۔ فوج۔ بغیر فوجی[۱] قوت کے سلطنت کی قوتِ ارادی ظاہر نہیں ہو سکتی

۲۔ انتظام انصاف۔

۳۔ مالیات (یا نظام معاشیات)

(۴) انتظام حکومت (مخصوص معنوں میں یعنی پولیس کا پورا نظام (جو امن عامہ اور حفاظت جان و مال کی غرض سے ہوتی ہے۔ اور تعلیم کی نگہداشت[۲] اور اسے عمل حکومت بھی کہہ سکتے ہیں)

فوج

انتظام داخلی اور سلطنت کی آزادی اور حفاظت کے لئے فوج کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ زمانہ قدیم میں فوج صرف سلطنت کے ماتحت اُس کی حکمت عملی کی غلام سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آجکل ہر ایک آزاد ملک میں جبریہ فوجی خدمت

---

[۱] فوج سے ہمارا منشا بحری اور بری جنگی قوتوں سے ہے۔

[۲] پولیس اور محکمہ تعلیم کا ہونا ہر سلطنت میں ضروری نہیں ہے مگر اس کی ترقی سے اس سلطنت کی ترقی پر روشنی پڑتی ہے۔

خدمت کے رواج کی وجہ سے فوج کا رتبہ بلند ہوگیا ہے۔ ابتدائی باب میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ وحشی حالت میں ہر ایک شخص پر اپنے قبیلہ کی حفاظت فرض تھی اور اس طرح ہر شخص سپاہی ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ حالات بدل گئے سلطنتیں وسیع ہوگئیں اور یہ ضرورت ہوئی کہ بجائے اس کے کہ ضرورت کے وقت فوج تیار کیجائے اور جنگ پر روانہ کیجائے ہر وقت باقاعدہ قواعدداں فوج تیار رہے۔ چونکہ سلطنت کی حفاظت اور زندگی فوجی قوت پر منحصر ہوتی ہے اس لئے فوج کو ملت کی باقاعدہ اور منظم قوت کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لہٰذا ہر سلطنت کا فرض اولیں یہ ہے کہ وہ فوج کا باقاعدہ نظام مرتب کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف فوجی نظام پر سلطنت کی اندرونی حالت کا دارومدار ہوتا ہے۔ اور یہی ایک ایسا سیاسی اجتماع ہے جسمیں ملت کے افراد ایک دوسرے سے محبت وخلوص کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ اور ملی یکجہتی میں فوج ہی کی وجہ سے ترقی ہوتی ہے۔

اہمسا ممکن ہے کہ خیال کے سامنے کوئی فلاسفر ایسی دلآویز تصویر قائم کرے جسمیں دنیا میں امن وسکون کے سوا کسی جنگ وفتنہ کا ذکر ہی نہو۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہونا قطعی ناممکن ہے۔ اہمسا یا عدم تشدد کے حامی دنیا کے سامنے ایسی بات پیش کرنی چاہتے ہیں جو فطرت انسانی کے قطعی خلاف ہے خدا نے انسانی طبیعت میں مختلف اور متضاد خواہشات اور جذبات اس لئے پیدا نہیں کیئے کہ اُن کا خون کردیا جائے بلکہ عقل وعلم کے ذریعہ سے اُن کے استعمال

کا جائز راستہ تلاش کرنا ضروری ہے۔ مثلاً انسان میں نفرت و انتقام کا جذبہ موجود ہے جسے وہ بدی کے دور کرنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اسی طرح تشدد بھی جائز طریقہ سے کیا جانا ضروری ہے۔ جو لوگ ہنسا کے حامی ہیں وہ خود اپنے نفس پر تشدد کرتے ہیں۔ غرضکہ اصول اہنسا ناقابل عمل ہے اور اگر اس پر عمل بھی کیا جائے تو کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکلتا جو تشدد کے جائز استعمال سے بہتر طریقہ پر نہ پیدا ہو سکے جائز تشدد کی کامیابی کی ہزاروں مثالیں تاریخ سے مل سکتی ہیں لیکن عدم تشدد کی صرف تین مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) میسور میں لارڈ ولزلی کے زمانے میں ہزاروں برہمنوں نے محض اپنے ملک کو حاصل کرنے اور آزاد ہونے کے لیے فاقہ کشی کرنے کے بعد جان دیدی۔ مگر اس کا کچھ بھی نتیجہ نہ ہوا۔

(۲) اسی طرح سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں پوپ اعظم اور کئی راہبوں سے فاقہ کشی سے بیت المقدس کو خالی کرانا چاہا۔ مگر یہ بھی بیکار ثابت ہوا۔

(۳) موجودہ زمانہ میں ہندوستان میں خاص طور پر اہنسا پر زور دیا جاتا ہے مگر حامیان اہنسا میں بھی دو فرقہ ہیں۔

(الف) ایک فرقہ اُن لوگوں کا ہے جو اس اصول کو محض وقتی ضرورت کے لحاظ سے اپنا اصول بنائے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ تشدد کرنے کی قوت نہیں ہے لہذا مجبوراً اہنسا پر کار بند ہو جانا چاہیئے۔

(ب) دوسرا فرقہ اُن لوگوں کا ہے جو اس اصول کو مذہبی اصول اور اپنا ایمان سمجھتے ہیں اور اس اصول کو طاقتوروں کا آلہ سمجھکر استعمال کر رہے ہیں مگر تاریخ خود بتادیگی کہ کونسا فرقہ راستی پر ہے۔ فطرت انسانی کا مطالعہ تو اول الذکر فرقہ کے خیال کی تائید کرتا ہے۔

بہر حال اگر خروج (اور اسکے ساتھ ساتھ تشدد) ایک برائی ہے تو یہ بدقسمتی سے ایسی برائی ہے جس کے جاری رکھنے کے لئے ہر سلطنت مجبور ہے۔ صلح جوئی سے دنیا میں آجتک کوئی کام نہیں ہوا۔ اور آخر میں تلوار ہی سچا انصاف کرتی ہے۔

جنگ کی عظمت | لہذا جنگ نہ صرف حیوانی ضرورت ہے بلکہ فطرت انسانی جنگ کے لیے مجبور کرتی ہے جنگ ہی سے انسانی اتحاد پیدا ہوتا ہے یہی ایک ذریعہ ہے جو مختلف مذاہب و اقوام کے انسانوں میں سچی اخوت و ہمدردی پیدا کرتا ہے۔ یہ ایسی متبرک چیز ہے کہ انسان میں سچا حب وطن ایثار پیدا کردیتی ہے اور وہ اپنی جان و مال قربان کرنیکو تیار ہوجاتا ہے۔ شارع اسلام نے جب اس جذبہ جنگ کو کفاروں کی طرف پھیرا تو اُن میں ایک خاص خلوص اور ہمت پیدا ہوگئی اور عرب و عجم کا فرق مٹ گیا جنگ یورپ میں جب انگریزوں کے ساتھ ہندوستانی شریک رزم ہوئے تو مسلمان یہ نہیں کہتا تھا کہ میں مسلمان ہوں بلکہ یہ کہتا تھا کہ میں ہندوستانی ہوں اسی طرح انگریز ہندوستانی اور انگریزوں کے پشتینی دشمن فرانسیسی محض جنگ کی وجہ سے ایک دوسرے کے دلی دوست بن گئے تھے۔

موجودہ جنگ | گذشتہ زمانہ میں جنگ کا فیصلہ دو تین میدانوں کے بعد ہو جاتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جنگ زیادہ وسیع اور دیرپا ہو گئی ہے اور مندرجہ ذیل باتوں کی خصوصیت سے ضرورت ہے۔

(۱) جنگ میں نہایت کافی روپیہ کی ضرورت ہے تاکہ سامان جنگ میں کمی نہ واقع ہو اور عرصہ دراز تک کل فوج جنگ کر سکے۔

(۲) باقاعدہ قواعد داں فوج کے لیے نہایت تعلیم یافتہ افسروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۳) سامان رسل و رسائل یعنی ریل۔ تار۔ سڑکوں وغیرہ کی اہمیت روز بروز اس وجہ سے بڑھتی جاتی ہے کہ فی زمانہ وہ سلطنت بہت جلد فتحمند ہو سکتی ہے جو کسی محاذ جنگ پر جلد سے جلد کافی مقدار فوج جمع کر سکے۔

(۴) آجکل قلعے بیکار ہو گئے ہیں اور ہوائی فوج سے قلعہ بند فوج کو شکست دی جا سکتی ہے مگر یہ فوجوں کے لیے جائے پناہ کے طور پر کسی قدر مفید ہو سکتے ہیں۔

(۵) بحری فوج کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہو گئی ہے کہ ان سے نوآبادیوں اور مستعمرات کی حفاظت میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے اور تجارتی راستوں کی حفاظت بھی بحری فوج ہی کرتی ہے۔

جنگ کی خرابیاں دوسرے نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو جنگ نہایت ہی وحشیانہ اور غیر منصفانہ طرز عمل ہے۔ ٹولسٹائی نے (جو روس کا ایک زبردست مدبر اور ہمدرد بنی نوع انسان شخص تھا) اپنی زندگی کا آخری زمانہ اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جنگ اور اس کے ساتھ تمام فوجوں اور فوجی نظامات کو منسوخ کر دینا انسانی نصب العین ہونا چاہیئے۔ بقول ٹولسٹائی جنگ صرف اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ سرمایہ دار اپنے حرص و آز کی وجہ سے غربا کو لوٹنا چاہتے ہیں اور اسی غرض کے لیے فوج کو کام میں لاتے ہیں۔ یا ایسا کیا جاتا ہے کہ ناجائز ٹیکس اور زبردستی کی حکومت کو قائم رکھنے کے لیے تمام سلطنتیں فوجوں کو اپنی حکمت عملی کی پابندی میں (خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز اور عموماً یہ حکمت عملی ناجائز ہی ہوتی ہے) استعمال کرتی ہیں۔ اس طرح فوجوں کے ذریعہ سے ایک مسلسل ظلم قائم رہتا ہے اور وہ لوگ جو فوجی خدمت انجام دیتے ہیں اُن بیکس کسانوں ٹیکس نہ دینے والوں اور کمزور قوموں کا اسی طرح شکار کھیلتے ہیں جیسے کوئی بھیڑیا کسی کمزور جانور کے ٹکڑے اُڑاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ فوجی سپاہی ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہیں لیکن آجکل عموماً تمام فوجیں حق و صداقت کے قیام کے لیے نہیں بلکہ کمزوروں کے حقوق کے غصب کرنے میں مصروف ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ دنیا میں امن و اماں کی ضرورت اور موجودہ فوجی نظام کی خرابی کی حتی الامکان تبلیغ کیجائے اور انسان کے صحیح یہ بتائے جائیں کہ تشدد کرنا گناہ اور غیر فطری ہے بلکہ اگر بجا

سے یہ مراد لیجائے کہ کسی پر بجا تشدد کرنا ناجائز ہے تو مناسب ہوگا۔ اہنسا ان معنوں میں ایک روحانی مسرت کا باعث ہوسکتی ہے۔ فوجوں کو مٹانیکے لیے دنیا میں کافی اخلاقی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ غرض صرف ایک طریقہ سے پوری ہوسکتی ہے کہ ٹالسٹائی کی تعلیم کے مطابق موجودہ ظالم و جابر حکومتوں کو مٹایا جائے تاکہ انفرادی سرمایہ داری کا خاتمہ ہو اور تمام انسان مشترک طریقہ سے خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوں۔ ایسی سلطنتوں کو مٹانیکا طریقہ ٹالسٹائی کی تعلیم کے مطابق تقریباً بالکل وہی ہے جو ہندوستان کی جمعیت ملیہ (کانگرس) نے اختیار کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ذاتی ملکیت کو قطعی مٹا دینا صرف اس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص فوج میں نہ داخل ہو اور ظالم حکومت کو ٹکس نہ ادا کرے۔ اس طرح حکومت فنا ہوجائیگی اور تمام انسانوں میں حقیقی حریت اور مساوات پیدا ہوجائیگی۔

عدالت

انتظام فوج کے بعد عدالت کا انتظام حکومت کے اجرائی شعبہ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ قانون اور اُس کے نفاذ کے متعلق سیاسی اصطلاحات کے ضمن میں بیان کردیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قاضی ایسا فیصلہ کرے جو سلطنت کی تاریخ اور روایات سے مطابقت اور عملی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔

قانون کی حکمت عملی قانون عملی کے اصول عامہ غور طلب ہیں سب سے پہلے ہر انسان اس بات کا مستحق ہے کہ وہ اپنے قومی قاضی یا اپنی برادری کی پنچایت سے فیصلہ کرائے مثلاً تاجر پیشہ یا فوجی ملازم صرف ان ماہرین فن سے فیصلہ کرانے کے مستحق ہیں

جس جماعت یا طبقے سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔

دوسرا ضروری اصول عدالت یہ ہے کہ فیصلہ علانیہ عدالتوں میں کیا جائے تاکہ عوام الناس فیصلہ اور جرم کا تعلق خود دیکھ سکیں۔البتہ ایسے مقدمات جو عوام کے اخلاق پر برا اثر ڈالیں خفیہ عدالتوں میں کئے جا سکتے ہیں خفیہ عدالتی کارروائی پر ہمیشہ عوام الناس مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔لہٰذا اس کا علانیہ عدالتوں میں ہونا ضروری ہے۔

ملک کی اخلاقی اور سیاسی ترقی کے لئے قاضیوں (ججوں) کا آزاد اور اہل علم ہونا نہایت ضروری ہے۔اور ان عہدہ داروں کے تقرر میں سلطنت کو نہایت باریک بینی اور غور و فکر سے کام لینا چاہئے۔اور تجربہ کار قابل اور دیانتدار اصحاب کو تلاش کرنا چاہئے۔

ان باتوں کے علاوہ اس امر کی ضرورت ہے کہ قانون سے ہر شخص مساوی طور پر آسانی سے فائدہ اٹھا سکے اور جہاں تک ممکن ہو سلطنت کا فرض ہے کہ مقدمات میں رعایا کا زیادہ روپیہ نہ خرچ ہونے دے۔یہ عیب انگریزی نظام قانون میں اور ملکوں کی نسبت زیادہ ہے اور ایسی صورت میں جہاں ہر شخص بار مقدمہ نہ اٹھا سکے انصاف صحیح طریقہ پر نہیں ہو سکتا۔

انتظام مالیات

انتظام حکومت میں تیسرا غور طلب امر یہ ہے کہ مالیات کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سلطنت انفرادی دولت بڑھانے کا آلہ ہے

مگر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جب تک سلطنت کی مالی حالت درست نہو گی وہ کسی صورت سے ملی ترقی میں مدد نہ دے سکے گی۔ رسوم (ٹیکس) اکثر بہت بری نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور بعض اوقات رسوم کی زیادتی ضرور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن سلطنت کی مالی حالت صرف ٹکس (یا مالگزاری) اور ملی قرض پر منحصر ہے

سلطنت کی ذاتی ملکیت

زمانہ قدیم میں بادشاہوں کے پاس کافی ذاتی ملکیت رہتی تھی جس سے وہ سلطنت کے مالیات میں مدد دیتے تھے اور رعایا پر رسوم کا بار نہ پڑتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سلطنت کی ذاتی ملکیت ریلوے کان۔ جنگلات۔ تار۔ ڈاکخانہ اور ٹکسال وغیرہ کی صورت میں ہے ان چیزوں پر حکومت کا براہ راست قبضہ ہوتا ہے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ انفرادی کوشش ایسی چیزوں کو استقلال اور عمدہ طریقہ سے محفوظ نہیں رکھ سکتی

رسوم

رسوم اور مالگزاری کے بغیر سلطنت کی عظمت اور شان قائم نہیں رہ سکتی اور نہ وہ کوئی کام بغیر روپیہ حاصل کئے ہوئے انجام دے سکتی ہے۔ اس لئے رسوم کی سخت ضرورت ہے۔ سلطنت کا اس شعبہ کے متعلق یہ کام ہے کہ وہ حتی الامکان رسوم اس طرح وصول کرے کہ ملت پر بار گراں نہ پڑے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ ان لوگونکو جو سلطنت سے زیادہ فائدہ حاصل کرتے ہیں زیادہ رسوم دینے چاہئیں اور وہ لوگ جو کم فائدہ حاصل کرتے ہیں انپر اتنا بار نہ پڑنا چاہئے تو یہ سخت غلطی ہوگی۔ مثلاً اگر فقیر اور مفلس باشندوں سے زیادہ روپیہ اس وجہ سے وصول کیا جائے کہ ان کی زندگی کا دارومدار سلطنت پر ہوتا ہے اور سلطنت ان کا لباس اور خوراک (خیرات کے قانون کے ذریعہ سے) مہیا کرتی ہے تو یہ دلیل

غیر منصفانہ ہے اسی طرح وہ تاجر جو اپنے سرمایہ سے ممالک غیر سے تجارت کرتے ہیں اُنپر کم رسوم عائد کیجائیں تو یہ بھی غلطی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ سلطنت اپنے قانون اور امن کے ذریعہ سے جو فائدہ اور عزت اپنے باشندوں کو پہنچاتی ہے اُس کا بدل اس طرح نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ حتی الامکان سلطنت کی روپیہ سے مدد کرکے اُسکی عظمت کو بڑہائے۔ جو آخر کار اپنا اچھا اثر افراد ملت پر ڈالیگا۔

رسوم بالواسطہ اور بلاواسطہ: رسوم کی دو قسمیں ہیں یعنی رسوم بلاواسطہ اور رسوم بالواسطہ اول الذکر (یعنی رسوم بلاواسطہ) کا مقرر کرنا زیادہ دقت طلب ہے۔ اور ان کے وصول کرنے میں بھی اکثر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے مثلاً زمین کی مالگذاری کے تقرر میں کسی معیار سے زیادہ اور کہیں کم رقم لیجا سکتی ہے۔ مگر اس قسم کی رسوم کا مقرر کرنا سلطنت کے لئے ضروری ہے۔ زمانۂ جنگ یا کسی ملی کشمکش کے وقت ایسی رسوم میں اضافہ کردینا بھی ضروری ہوتا ہے اور اکثر باشندوں کو یہ ناگوار بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات فسادات بھی رونما ہوجاتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر نے جب اہل ہنود پر جزیہ عائد کیا تو سخت برہمی پھیل گئی تھی۔ حالانکہ وہ بخلاف مسلمانوں کے جبریہ فوجی خدمت سے الگ کردئے گئے تھے لیکن اورنگ زیب اپنی سلطنت کی عظمت اور مختلف جنگوں کے اخراجات کے لئے اس جزیہ کا جاری کرنا ضروری سمجھا۔

رسوم بالواسطہ کے وصول کرنے میں سلطنت کو زیادہ مشکلیں پیش نہیں آتیں۔ اور یہ زیادہ مستحسن طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ رسوم زیادہ تر ضروریات زندگی کے علاوہ فروعی اشیاء اور سامان عیش و آرام پر لگایا جاتا ہے۔ اس طرح غربا پر اسکا

بہت کم اثر پڑتا ہے۔

ملّی قرضہ | اسی سلسلہ میں ملّی قرض بھی آجاتا ہے۔ معاشیات کا مسلّمہ ہے کہ جو سلطنت زیادہ قرض لینے کی اہلیت رکھتی ہے وہ بہتر اور معزز سلطنت ہے ملّی قرض سے سلطنت بجائے نقصان کے فائدہ ہوتا ہے اور ملّی دولت میں ترقی ہوتی ہے۔ اس قسم کے کل قرض افراد ملت کے سرمایہ کو ایک جگہ جمع کرنیکا باعث ہوتے ہیں اور اس روپیہ کے محفوظ ہونے کے علاوہ اس کا استعمال بھی بہتر اور یقینی منافعہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس لئے قرضہ ملّی نہایت عمدہ چیز ہے۔

قرضہ جنگ | جنگ کے زمانہ میں براہ راست رسوم عائد کرنیکی بجائے قرضۂ جنگ لینا سلطنت کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ سلطنت کے باشندوں میں اکثر سرمایہ دار ایسے ہوتے ہیں جو اپنے روپیہ کو کسی کاروبار میں لگانا چاہتے ہیں اس لئے سلطنت کا کسی نہ کسی طرح سے قرض لینا اپنے ملّی سرمایہ کو باہر جانے سے روک دیتا ہے۔ نہ صرف ایسے قرضوں سے سلطنت کو استواری حاصل ہوتی ہے بلکہ افراد ملت میں یگانگت اور اتحاد اور ایثار بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

حکومت عملی

انتظام حکومت کے متعلق عملی حکومت میں وہ سب باتیں داخل ہیں جن سے سلطنت کی سلامتی امن عامہ اور تعلیم میں ترقی ہوتی ہے سلطنت کی اجتماعی بنیاد امن عامہ اور ملی تعلیم پر ہے

پولیس | امن عامہ کے قائم رکھنے اور سلامتی جان و مال کے لئے ہر ترقی یافتہ

سلطنت میں کسی ایسے محکمہ کا ہونا ضروری ہے جو پولیس کی خدمات انجام دے یہ محکمہ سلطنت میں حفظ امن اور جرائم کو روکنے کے لئے ہوتا ہے۔ اور اسکے ایسے عناصر کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو رعایا کے جان و مال کو نقصان پہنچاتے ہوں ۔یا سلطنت کے قوانین کو ذاتی مفاد کے لئے توڑتے ہوں

ملکی ملازم زمانہ گذشتہ میں سول سروس یا اعلیٰ ملکی ملازمتوں پر زیادہ تر وہی لوگ نامزد ہوتے تھے۔ جو خاندانی حیثیت سے طبقۂ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عالی خاندان ہونا اُن کی تعلیم و تربیت اور عمدہ اخلاق کی دلیل تھی۔ موجودہ زمانہ میں ملازمین ملکی کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ امتحان مقابلہ میں بھی کامیاب ہونا ضروری ہے اور اکثر ایسے اشخاص نامزد کئے جاتے ہیں جو مدنی حیثیت سے اعلیٰ زندگی بسر کرتے ہوں

حکومت مقامی حکومت مقامی سے وہ حکومت مراد ہے جو کسی خاص شہر یا حلقہ کے باشندے اپنے حفظان صحت تعلیم۔ سڑکوں اور ایسی چیزوں کا انتظام کرتے ہیں جو زیادہ تر دماغی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس انتظام میں تقریبًا ہر ایک باشندہ حصہ لیتا ہے اور اس لئے ہر ایک شخص حکومت کی دشواریوں کو سمجھنے اور ذاتی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ گویا یہ سلطنت کے ذمہ دار افسران کی تعلیم گاہ ہوتی ہے

تعلیم ہر ایک سلطنت کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا میں عام تعلیم جاری کرے۔ اور جہانتک ممکن ہو۔ افراد ملت کی دماغی ترقی کا کافی سامان بہم پہنچائے اور تعلیم اتنی ارزاں ہو کہ غریب سے غریب انسان بھی اپنی اولاد کو اس سے نہ

محروم رکھ سکے تعلیم کے مختلف شعبہ ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ تعلیم جو اکثر شہنشاہیتوں کی مفتوحہ اقوام میں رائج ہے صرف اُن کے دفاتر کے ادنیٰ منشی مہیا کرتی ہے۔ لہذا حقیقی تعلیم ہمیشہ وہی ہو گی جو سلطنت کے اثر سے علیحدہ ہو۔ یعنی سلطنت کی وقتی حکمت عملی کی پابندی میں نصاب و نظام تعلیم نہ ہو۔ بلکہ حتی الامکان آزاد قومی مدارس کے ذریعے سے ایسی تعلیم دیجائے۔ جو طالبان علم کو تھوڑے سے عرصہ میں زیادہ مکمل بنا سکے اور اُن کو عملی زندگی میں آزادی سے حصہ لینے کے قابل بنانے کے علاوہ اُن کی انفرادی فطرت کی مطابقت سے اُسکو درجہ تکمیل تک پہنچا دے۔

مقالہ سوم سلطنت کا تعلق بین الدول

اتحاد ملل زمانہ قدیم میں ایک قوم دوسری قوم سے اتنی وابستہ نہیں تھی جتنی کہ موجودہ زمانہ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں نہ ایسی سڑکیں تھیں نہ سامان رسل و رسائل کی اتنی فراوانی تھی۔ راستے اکثر مخدوش تھے اور دریائی راستے زیادہ تر خطرناک تھے۔ دخانی مشینوں کی ایجاد نے اتحاد ملل میں بہت زیادہ مدد دی۔ اس کے علاوہ قدیم رشتہ اخوت و اتحاد یعنی مذہب ابتک اپنا کام کر رہا ہے اور ایک ملک کے باشندے دوسرے ممالک کے ہم مذہب باشندوں سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں اور اب بھی ہیں زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اب نہ صرف ایک ملک کی مختلف قومیں ایک دوسرے سے متحد ہو گئی ہیں بلکہ یہ اتحاد وسیع ہو رہا ہے۔ ایشیا۔ افریقہ۔ یورپ اور امریکہ کی کل سلطنتیں آپس میں متحد ہو رہی ہیں۔ اور تجارت و سائنس کی ترقی کل دنیا کے اتحاد کو زیادہ مضبوط بنیاد پر قائم کر رہی ہے۔

زمانہ قدیم میں اطلی تورکون وغیرہ کی کبھی سے اتنا اتحاد عظیم ہوا اور ایک سلطنت اپنے قریب کی سلطنت کو غرور و قوت کے لحاظ سے کم درجہ کا سمجھتی تھی۔ اور نہ تو اُس کے متعلق معلومات حاصل کرنیکی

کوشش کیجاتی تھی اور نہ قرب و جوار کی کمزور سلطنتیں بغیر باجگزاری اور ماتحتی کے قائم رہ سکتی تھیں۔ اس طرح گویا یہ معمول تھا کہ ایک سلطنت بجائے محبت و اتحاد قائم کرنیکے ہمیشہ اپنی ہمسایہ سلطنت سے جنگ کے لئے تیار رہتی تھی۔

قانون بین الدول۔ مغربی تہذیب تمدن کے اثر سے اب وہ اخلاقی تعلق جو ایک ملت کو دوسری ملت سے زمانہ قدیم میں تھا بہت کچھ کم ہو رہا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک سلطنت دوسری سلطنت کو گذشتہ زمانہ میں اپنا رقیب دشمن سمجھتی تھی۔ تاہم یہ بات مشرقی اقوام میں ابتک موجود ہے کہ بہادر دشمن اور کمزور ہمسایہ سلطنت کو احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سفیر یا قاصد اگر کسی شاہی دربار میں نازیبا گفتگو کر بیٹھتا تھا۔ تو یہ قانون ہمیشہ مانا جاتا کہ اُس کی جان و عزت محفوظ رکھی جاتی تھی۔ اور اسی طرح صلحناموں اور اپنے اقوال کی پابندی کا نہایت شرافت سے لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اب صلحناموں کی وقعت ردّی کاغذ کے ٹکڑے کے برابر بھی نہیں سمجھی جاتی۔ اور موقع ملنے پر بلا وجہ حرص و آز کی قینچی کمزور ممالک پر چلنے لگتی ہے۔ یونانیوں نے زمانہ قدیم میں اس مسئلہ کو بہتر طریقے سے سمجھا تھا اور صلحنامہ کسی خاص وقت تک کے لئے کیا جاتا تھا اور زمانہ صلح کے ختم ہوتے ہی صلح پر دوبارہ غور کیا جاتا تھا

توازن قوت۔ بہرحال موجودہ زمانہ میں امن عالم کے لئے مختلف سلطنتوں میں توازن قوت ہونے کے بغیر قانون بین الملل مکمل نہیں ہو سکتا۔ ایک سلطنت دوسری سلطنت سے شریفانہ برتاؤ جب ہی کر سکتی ہے جب اُسے یہ اُمید ہو کہ ایسا ہی سلوک اُس سے بھی کیا جائیگا۔ اور ایسا معاملہ مغربی تہذیب اور مادی اصولوں

کی روحانی بنیاد کے قائم ہونے کے بعد ہونا ممکن ہے۔ یورپ اپنے آپکو عیسائی مذہب کا پیرو سمجھتا ہے۔ مگر اس مذہب کو اپنی سیاسی چالبازیوں کے چھپانے اور دنیا کی غیر عیسائی آبادی کو غیر مہذب کے نام سے موسوم کر کے صلیبی جنگ کرنیکے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا میں ایشیا کی بیداری ایک نیا رنگ لانیوالی ہے اور افق عالم پر امن و مسرت کی دیوی کا نور مادیت سوز مشرق سے طلوع ہو چکا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد قانون بین الملل مکمل ہو جائے اور سلطنتوں کی انفرادی آزادی، استقلالیہ، تجارت، علم و فن بہتر اور مضبوط بنیاد پر قائم ہو جائیں۔ جنگ ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے کمزور طاقتور اور طاقتور کمزور ہو جاتی ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ مشرق و مغرب کے تصادم عظیم کے بعد ایک دوسرے کا خوف (اگر محبت نہیں) اس بات پر کل سلطنتوں کو اچھا ہمسایہ بنا دے۔

[1] انجمن ملل جنگ یورپ کے بعد انجمن ملل قائم کی گئی۔ مگر اس انجمن نے ابتک سوائے نام نہاد انجمن ہونے کے اور کچھ نہیں کیا۔ لیکن اس کی ہستی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ زمانہ دور نہیں کہ انجمن ملل عالم قائم ہو جائے جو بحیثیت پولیس کے ملل عالم میں امن و امان قائم رکھنے اور سیاسی تعلقات قائم رکھنے میں مدد دے۔

تفصیل کتب

یعنی وہ کتابیں جن سے کہ کتاب ہذا کی ترتیب میں امداد لیگئی

۱۔ علم سیاسیات۔ مصنفہ آموس (انگلستان)
اس کتاب میں مختصر طریقے سے اس علم کا بیان ہے۔

۲۔ تاریخ انسان۔ Story of Man از جے ڈبلیو۔ بوٹل (فیلاڈلفیا امریکہ) اس کتاب میں ابتدائے عالم سے اسوقت تک کے کل وحشی اقوام کی تاریخ ہے اور اُن کے تمدن وسیاست کا نہایت مفصل ذکر ہے۔

۳۔ تاریخ تمدن مشرقی۔ از آر۔ ای۔ انڈرسن (لنڈن)

۴۔ تاریخ ہند۔ و آئین اکبری وغیرہ۔

۵۔ سیاسیات۔ از ارسطو (انگریزی ترجمہ)

۶۔ علم نظریہ سلطنت (General Theory of State) از بلنتشلی یہ کتاب علم سیاسیات کی نہایت عمدہ تشریح کرتی ہے۔ جو اہل جرمن کا حق ہے

۷۔ سیاسیات۔ از ترشکے۔ (Politics by Treitschke)
یہ کتاب تقریباً بلنتشلی کی تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

۸۔ سیاست نامہ۔ از نظام الملک طوسی۔ اصل فارسی میں ہے اور اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے اپنے رسالہ میں

اس کتاب کے اقتباسات شائع کئے ہیں۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور خصوصاً سلطنت کے نصب العین کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچاتی ہے۔

۹۔ نفائس الفنون۔ یہ ایک قلمی کتاب ہے جو امپیریل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے یہ تقریباً کل علوم کا کشکول ہے۔ سیاست کے متعلق بھی ایک باب اس میں موجود ہے شاہی سلطنت سے زیادہ تعلق ہے۔

۱۰۔ علوم اجتماعی۔ از جان سٹوارٹ مِل (انگریزی)

۱۱۔ معلم السیاسۃ (اردو ترجمہ "حکومت جمہوری۔ از جے۔ اس مِل) نولکشور پریس۔ اس کتاب میں نہایت تفصیل سے آئینی جمہوریت پر بحث کی گئی ہے۔

۱۲۔ شہنشاہیت۔ از پروفیسر پانڈیا (مدراس) نہایت واضح کتاب ہے۔

۱۳۔ تاج مذہب ہنود۔ از فارقوہار (لندن) مذہب ہنود اور شاہزادات پر کافی بحث موجود ہے۔

۱۴۔ اتحاد اسلامی۔ از مولانا ابو الکلام آزاد (دار الاشاعت میرٹھ)

۱۵۔ اشتراک قدیم و جدید۔ از لو بلو گریہم (لندن)

۱۶۔ تمدن عرب۔ از مولانا بلگرامی۔

۱۷۔ جاپان قدیم و جدید۔ ہندوستانی پریس (لاہور)

۱۸۔ تقاوی بینکس و مسئلہ اراضی۔ از ہیڈ نٹ پیریار (لندن)

مشرقی مصنفین کی چند کتابین جو سیاسیات پر روشنی ڈالتی ہین درج ذیل ہین

نمبر — نام کتاب — کیفیت

۱ دستور حکمرانی (اردو) - آج سے پانچہزار سال پہلے - مہابھارت کے زمانہ مین مشہور مدبر و جرنیل بھیشم پتامہ نے جن سیاسی نکات کی تلقین کی تھی وہ قابل دید ہین - مہابھارت سے اخذ کر کے مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب نے سلیس اُردو مین حیدر آباد سے شائع کیا ہے - فرمانروا کی ضرورت - راجدھرم - وزرا کی صفات - او سلطنت کی حفاظت کے متعلق اسمین کافی نصیحتین ہین - دانشمندون سے مشورہ اور تمام ذی روح مخلوقات کی حفاظت کرنا شاستر کا حکم بتایا ہے

۲ نارد نیتی - مندرجہ بالا کتاب کے اخیر مین نارد جی مہاراج کے وہ سوال و جواب درج ہین جنکے پیرایہ مین انہون نے علم سیاسیات کو سمجھایا ہے -

۳ منوسمرتی - آئین حکمرانی و آئین سیاست - ہندوؤن کے تقریباً کل قوانین منو کے مرتب کردہ ہین - یہ مسیح سے ایکہزار سال قبل گزرے ہین - انہون نے ہندو سیاسیات پر کافی روشنی ڈالی ہے -

۴ التبر المنسبک فی تدبیر الملک - ایشیا مین اسلام کے ساتھ ساتھ جمہوریت کا بھی آغاز ہوا - خلفا کے زمانہ کی تاریخ کے علاوہ عربی کی دیگر کتب بھی نہایت دلچسپ ہین - یہ کتاب ابوالحسن علی بن الاہوازی کی تالیف ہے - اسمین عقل مشورہ - عدل - شکر - اخلاق ملوک - رعیت - زراعت وغیرہ پر عمدہ بحث ہے -

۵ المنہج المسلوک فی سیاستہ الملوک - مؤلف شیخ عبدالرحمن بن عبداللہ جیشی صدری کے فاضل اجل تھے - یہ کتاب ملک ناصر صلاح الدین یوسف کیلئے لکھی گئی تھی اسکے بیس ابواب ہین - قواعد ادب فضل مشورہ - اوصاف اہل مشورہ - اور معرفت اصول سیاست قابل دید ہین -

۶ - الاحکام السلطانیہ - مؤلف ابوالحسن علی بن محمد (المتوفی سنہ ۴۵۰ھ) اسمین امامت - وزارت

قانون جنگ - اور انتظام ممالک وغیرہ کا تذکرہ ہے -

۷- کتاب الواسطۃ السلوک فی سیاسۃ الملوک - موسیٰ بن یوسف کی تصنیف ہے جسمین جہاد فرمانروائی اور فراست وغیرہ کا ذکر ہے -

۸- سراج الملوک - ایک ضخیم کتاب ابوبکر طرطوشی کی تصنیف ہے - اسمین سلاطین کو نصیحت کیے علاوہ خراج بیت المال شوریٰ - عدل اور اخلاق کی جملہ صفات کا بیان ہے -

۹- سلوک المالک فی تدبیر الممالک - احمد بن محمد بن ابی الربیع نے خلیفہ معتصم باللہ عباسی کیواسطے تصنیف کی تھا - اسکی چوتھی فصل سیاست پر مشتمل ہے جسمین ارکان مملکت چار بتلائے گئے ہین یعنی (۱) بادشاہ (۲) رعیت (۳) عدل - (۴) تدبیر اور پھر ان سب کی صفات کا مفصل تجزیہ ہے جو قابل دید ہے

۱۰- اقوم المسالک فی معرفۃ احوال الممالک - مصنفہ سید خیر الدین وزیر سلطنت تونس (افریقہ) اسکا اُردو ترجمہ ۱۲۹۸ھ مین ہوا - اور سر سید نے شائع کیا - اسمین اس زمانہ کی کل سلطنتوں کی تاریخ اور سیاست خصوصی سے مجمل بحث ہے - اسکے علاوہ باقی دنیا کے جغرافیہ کا خاکہ بھی ہے -

۱۱- کلیلہ و دمنہ سیاست نامہ کے علاوہ مدبرین مشرق مین کلیلہ دمنہ کا خاص رواج ہے - اُردو مین اسکا ترجمہ بستان الحکمت کے نام سے ہوگیا ہے - اصل کتاب بیدپا برہمن نے ایک ہندی راجہ کیلئے سنسکرت مین لکھی تھی - اسمین سیاست - رعیت - بسط عدل و راحت ترتیب تقویت اولیائے دولت نظم و نسق و اداب مملکت درج ہین - نوشیروان عادل نے اسکا ترجمہ پہلوی زبان مین کرایا تھا اس کتاب کی مشرق مین بہت زیادہ قدر ہوئی اور متعدد ترجمہ ہوئے - رودکی نے اسے نظم کیا - اور ہندوستان مین آکر عیار دانش کے نام سے شائع ہوئی جو ابوالفضل کا ترجمہ ہے - اسکے علاوہ یورپ کی مختلف زبانون مین اس کے ترجمے ہوچکے ہین -